منهاج البراعة

في شرح

نهج البلاغة

منهاج البراعه

فی شرح

نہج البلاغہ

جلد اوّل، دوم

تالیف

علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ

ترجمہ

حجتہ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی

ناشر

حق برادرز

8۔ مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

فون: 0333-4431382

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف کتاب

نام	منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ
جلد	اول، دوم
مئولف	علامہ محقق آیۃ اللہ سید حبیب اللہ ہاشمی خوئی قدس سرہ
مترجم	حجۃ الاسلام علامہ الشیخ محمد علی فاضل مدظلہ العالی
ڈیزائننگ وکمپوزنگ	محمد تقی فاضل
ناشر	حق برادرز لاہور
مطبع	معراج دین پرنٹرز لاہور
اشاعت دوئم	2008ء
قیمت	-/450 روپے

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر
۳۴۳	حج کے فضائل اور اس کا ثواب	۵۱۸
۳۴۴	وضو اور حج کی فضیلت کی تفصیلی حدیث	۵۱۹
۳۴۵	خانہ کعبہ مقام امن ہے	۵۲۰
۳۴۶	خانہ کعبہ کو تباہ کرنے والوں کا انجام	۵۲۲
۳۴۷	استطاعت کیا ہے؟	۵۲۳
۳۴۸	کفر کیا ہے؟	۵۲۴
۳۴۹	تتمہ، سرزمین کربلا کی فضیلت	۵۲۷
۳۵۰	خطبہ دوم۔ پہلی فصل۔ حمد اور شکر	۵۲۹
۳۵۱	حمد اور شکر کی تفصیلی بحث	۵۳۰
۳۵۲	حمد سے مراد شکر ہی ہے	۵۳۱
۳۵۳	دل، زبان اور اعضاء و جوارح کا عمل	۵۳۲
۳۵۴	بندہ نیاز مند ہے وہ بے نیاز ہے	۵۳۲
۳۵۵	شکر منعم واجب ہے	۵۳۴
۳۵۶	عفو اور شفاعت پر اعتراض	۵۳۷
۳۵۷	دو خوبصورت مثالیں	۵۳۸
۳۵۸	دوسری فصل۔ کلمہ توحید	۵۴۰
۳۵۹	کلمہ توحید کا اعراب	۵۴۱
۳۶۰	کلمہ توحید کے فضائل	۵۴۳
۳۶۱	شہادت رسالت	۵۴۸
۳۶۲	شہادتین کے فضائل	۵۴۸
۳۶۳	بابرکت نام، محمدؐ	۵۴۹
۳۶۴	نام محمدؐ کی عظمت	۵۵۰
۳۶۵	عبدہٗ پہلے رسولہٗ بعد میں کیوں؟	۵۵۱
۳۶۶	بعثت کے اسباب	۵۵۱
۳۶۷	تیسری فصل۔ بعثت کے بارے میں	۵۵۳
۳۶۸	بعثت کے وقت لوگوں کی حالت	۵۵۴
۳۶۹	چوتھی فصل۔ آل محمدؐ کی توصیف	۵۵۷
۳۷۰	آل محمدؐ کون ہیں؟	۵۵۸
۳۷۱	آل محمدؐ رازوں کے امین ہیں	۵۵۸
۳۷۲	ایک حدیث پر مصنف کا تبصرہ	۵۵۹
۳۷۳	مذکورہ حدیث پر علامہ مجلسی کا تبصرہ	۵۶۱
۳۷۴	آل محمدؐ دین کی پناہ گاہ ہیں	۵۶۱
۳۷۵	آل محمدؐ علم کا مخزن ہیں	۵۶۴
۳۷۶	آل محمدؐ مرجع احکام ہیں	۵۶۶
۳۷۷	اہل بیتؑ کتابوں کی پناہ گاہ ہیں	۵۶۷
۳۷۸	آل محمدؐ دین کا پہاڑ ہیں	۵۷۲
۳۷۹	آل محمدؐ دین کا خم سیدھا کرتے ہیں	۵۷۳
۳۸۰	پانچویں فصل۔ کچھ غیروں کے متعلق	۵۷۵
۳۸۱	"قوم آخرین" کون لوگ ہیں؟	۵۷۶
۳۸۲	آل محمدؐ پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا	۵۷۷
۳۸۳	مختصر مگر جامع جملہ	۵۷۸
۳۸۴	آل محمدؐ ولی نعمت ہیں	۵۷۸
۳۸۵	چشمہ فیض ہر وقت جاری ہے	۵۸۰
۳۸۶	نعمت عطا کرنے والا افضل ہوتا ہے	۵۸۱
۳۸۷	آل محمدؐ کی چند اور صفات	۵۸۲
۳۸۸	غالیوں سے بچنے کی تلقین	۵۸۳
۳۸۹	اوصاف امامؑ بزبان امامؑ	۵۸۴
۳۹۰	آل محمدؐ پیغمبر کے وصی اور وارث ہیں	۵۹۰
۳۹۱	شعراء کا کلام	۵۹۱
۳۹۲	اہل بیتؑ ہی حقدار خلافت ہیں	۵۹۳

نمبر شمار	تفصیل مطالب	صفحہ نمبر
۳۹۳	خطبہ شقشقیہ۔وجہ تسمیہ	۵۹۵
۳۹۴	خطبہ شقشقیہ امیرالمؤمنینؑ کا کلام ہے	۵۹۵
۳۹۵	چند اور معرکۃ الاراء مسائل	۵۹۸
۳۹۶	مقصد اول علیؑ کی خلافت پر نقلی دلائل	۵۹۹
۳۹۷	آیت ولایت	۵۹۹
۳۹۸	علیؑ ہی ولی ہے	۶۰۰
۳۹۹	امام رازی کے اشکالات	۶۰۱
۴۰۰	ولی یعنی چہ؟	۶۰۵
۴۰۱	اب جگر تھام کے بیٹھو!	۶۰۸
۴۰۲	"مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ" کی تفسیر	۶۱۱
۴۰۳	کلمہ "اِنَّمَا" حصر کیلئے ہے	۶۱۴
۴۰۴	آیت اطاعت	۶۱۷
۴۰۵	امام رازی کے اشکالات	۶۱۸
۴۰۶	آیت تبلیغ	۶۲۲
۴۰۷	حسان بن ثابت کا قصیدہ	۶۲۴
۴۰۸	مولا یعنی چہ؟	۶۲۴
۴۰۹	کتب خلفاء کے راویان حدیث غدیر	۶۲۸
۴۱۰	دوسری قسم۔احادیث نبوی	۶۳۱
۴۱۱	حدیث مذکور پر اعتراضات	۶۳۲
۴۱۲	ان اعتراضات کا جواب	۶۳۵
۴۱۳	ایک مرتبہ پھر فضائل علیؑ	۶۳۷
۴۱۴	ایک ناصبی کا اعتراض اور اس کا جواب	۶۳۸
۴۱۵	فضل بن روزبہان کا اشکال	۶۳۹
۴۱۶	دوسرا مقصد، امامت علیؑ پر عقلی دلائل	۶۴۱
۴۱۷	امام افضل کیوں ہو؟	۶۴۲
۴۱۸	علیؑ علم میں سب سے افضل تھے	۶۴۶
۴۱۹	حضرت عمر کا اعتراف	۶۴۹
۴۲۰	علیؑ آسمانی کتابوں کے عالم تھے	۶۵۰
۴۲۱	علم الٰہیات، علم تفسیر و قرائت	۶۵۱
۴۲۲	فقہ و فروع دین کا علم	۶۵۲
۴۲۳	علم مناظرہ، علم قضا و فصل	۶۵۳
۴۲۴	فصاحت وبلاغت، علم نجوم، نحو وادب	۶۵۴
۴۲۵	علم حساب	۶۵۴
۴۲۶	علم کیمیا، علیؑ کا زہد و تقویٰ	۶۵۵
۴۲۷	آپؑ کی عبادت واعمال صالحہ	۶۵۷
۴۲۸	آپؑ کی شجاعت	۶۵۹
۴۲۹	شارح معتزلی کا نظریہ	۶۶۰
۴۳۰	علیؑ کے بارے میں جاحظ کا نظریہ	۶۶۰
۴۳۱	ابن ابی الحدید کا نظریہ اور اس پر تنقید	۶۶۱
۴۳۲	مصنف کا جواب	۶۶۴
۴۳۳	اختتام کتاب	۶۶۸

منهاج البراعه

فی شرح

نهج البلاغه

جلددوم

بسم الله الرحمن الرحيم

ہے تطبیق دو۔ جو اس سے مطابقت رکھتی ہو اسے لے لو اور جو نہ رکھتی ہو اسے مسترد کر دو۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب خدا حجت ہے اور مختلف فیہ احادیث کے پرکھنے کا مرکز ہے۔ اگر نص کے بغیر اس کے معنی سمجھنا غیر صحیح ہوتے تو پھر احادیث کو اس کے ساتھ تطبیق دینا کیونکر ممکن ہوتا اور یہ بات ہی غیر مفہوم ہے۔ اس کی مزید تفصیل "قوانین الاصول" پر ہمارے حواشی میں موجود ہے۔ اس مقام پر اور بھی بہت سی قرآنی بحثیں ہیں قرائات سبعہ کا تواتر، قرآن کے فضائل، اس کی قرائت کے فضائل اس کے سننے اور اس کی طرف نگاہ کرنے کے فضائل وغیرہ۔ جو نہایت ہی باعظمت اور نفیس بحثیں ہیں لیکن طوالت کے خوف سے مزید کوئی گفتگو نہیں کرتے۔ البتہ بعض مناسب مقامات پر ان میں سے بعض چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔ اور خدا ہی توفیق دہندہ اور مددگار ہے۔

اٹھارویں فصل

حج اور بیت اللہ کی تفصیلی گفتگو

وَ مِنْهَا

وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلَهُ قِبْلَةً لِّلْاَنَامِ يَرِدُوْنَهُ وُرُوْدَ الْاَنْعَامِ وَيَاْلَهُوْنَ اِلَيْهِ وُلُوْهَ الْحَمَامِ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَ اِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعًا اَجَابُوْا لَهُ دَعْوَتَهُ وَصَدَّقُوْا لَهُ كَلِمَتَهُ وَ وَقَفُوْا مَوَاقِفَ اَنْبِيَائِهِ وَ تَشَبَّهُوْا مَلَائِكَتَهُ الْمُطِيْفِيْنَ بِعَرْشِهِ يُحْرِزُوْنَ الْاَرْبَاحَ فِيْ مَتْجَرِ عِبَادَتِهِ وَ يَتَبَادَرُوْنَ عِنْدَهُ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهِ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ لِلْاِسْلَامِ عَلَمًا وَّلِلْعَائِذِيْنَ حَرَمًا فَرَضَ حَجَّهُ وَ اَوْجَبَ حَقَّهُ وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ وَ قَالَ سُبْحَانَهُ "وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَّ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

اور اسی خطبے کا حصہ ہے

اور اللہ نے اپنے حرمت والے گھر کا حج تم پر واجب کیا ہے جسے لوگوں کا قبلہ بنایا، جہاں لوگ اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں جس طرح پیاسے حیوان پانی کی طرف، اور اس طرح وارفتگی سے بڑھتے ہیں جس طرح کبوتر اپنے آشیانوں کی جانب، اللہ سبحانہ نے اس کو اپنی عظمت کے سامنے ان کی فروتنی و عاجزی اور اپنی عزت کے اعتراف کا نشان بنایا ہے۔ اس نے اپنی مخلوق میں سے سننے والے لوگ چن لئے ہیں جنہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہی اور اس کے کلام کی تصدیق کی، وہ انبیاء کی جگہوں پر ٹھہرے، عرش پر محو طواف فرشتوں سے مشابہت اختیار کی، وہ اپنی عبادت کی تجارت گاہ میں منفعتوں کو سمیٹتے ہیں اور اس کی وعدہ گاہ مغفرت میں بڑھتے ہیں، اللہ سبحانہ نے اس گھر کو اسلام کا نشان اور پناہ چاہنے والوں کیلئے حرم بنایا ہے، اس کا حج فرض اور ادائیگی حق کو واجب کیا ہے، اور اس کی طرف راہ نوردی فرض کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ نے فرمایا: "اللہ کا واجب الادا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا حج کریں، جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔ اور جس نے کفر کیا تو جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے"۔

تشریح

"حج"، "حاء" کے فتحہ (زبر) کے ساتھ اور کسرہ (زیر) دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں "قصد کرنے" کے۔ اگر حقیقت شرعیہ ثابت ہے تو "شرع" کی ورنہ "متشرعہ" کی رو سے اس کا اصطلاحی معنیٰ ہے "قربۃً الی اللہ کی نیت سے مخصوص ایام اور مقامات پر مخصوص اعمال کی بجا آوری کیلئے بیت اللہ الحرام کا قصد کرنا"۔ "يَأْلَهُوْنَ اِلَيْهِ" ___ وَلَهَ يَوْلَهُ ___ یہ ضَرَبَ، مَنَعَ اور حَسِبَ کے وزن پر ہے، جس کے معنی ہیں خوشی یا غمی سے کسی کی عقل کا چلے جانا۔ اس مقام پر "يَأْلَهُوْنَ اِلَيْهِ" کے معنی ہیں ان کا شوق اس قدر شدید ہے کہ اس شدت شوق کی وجہ سے قریب ہے کہ ان کی عقل چلی جائے۔ "وُلُوْه" واؤ کے ضمہ (پیش) کے ساتھ "وَلَهَ يَوْلَهُ" کا مصدر ہے۔ اس بارے میں صرفی لحاظ سے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جس کا ذکر یہاں پر ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

"السُّمَّاعُ" یہ لفظ کتب لغت میں مجھے نہیں ملا، شاید سین کے ضمہ اور میم کی تشدید سے "سامع" کی جمع ہے۔ جیسے "سُمَّار"، "سامر" کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں "قصہ گو"۔ اور شارح بحرانیؒ نے اس لفظ کو اسی طرح لکھا ہے۔ "تبادر" کے معنی ہیں "تسارع"، یعنی فوراً پہنچ جانا۔ اس کو "الی" کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے، جیساکہ "تسارع" کو بھی "الی" کے ساتھ متعدی کیا جاتا ہے۔ "عَائِذِيْنَ" جمع ہے "عائذ" کی، جس کے معنی ہیں پناہ لینے والے۔ جبکہ نہج البلاغہ کے بعض نسخوں میں "عابدین" جو کہ "عابد" کی جمع ہے، تحریر کیا گیا ہے لیکن پہلا لفظ مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ "وِفَادَةٌ" بروزن "اِفَادَةٌ" سے "وَفَدَ" بروزن "ضَرَبَ" کا مصدر ہے اور اس کا مصدر "اِفَادَةٌ" بھی ہے۔ اور واؤ کو الف میں تبدیل کیا گیا ہے۔ اور "وفد" اور "وفود" بھی سب کے معنی ایک ہی ہیں اور وہ ہیں "کسی کے پاس جانا"۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ "حَقُّ الصَّلٰوةِ اَنْ تَعْلَمَ اَنَّهَا وِفَادَةٌ اِلَى اللّٰهِ" نماز کا حق یہ ہے کہ تمہیں اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے حصول کیلئے اس کے حضور پہنچنا ہے۔

حج کا تفصیلی تذکرہ

سید رضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (اور اس خطبے کا ایک حصہ یہ ہے) کہ جس میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے حج کا ذکر فرمایا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس فصل میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام کا آغاز بھی حضرت کے کلام کے اختتام کی مانند حج کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اور آغاز کے بعد اور اختتام سے پہلے کے دونوں حصے بیت اللہ الحرام کی توصیف و تعریف پر مشتمل ہیں۔ اور درمیان میں حجاج کرام کی اوصاف اور ان کی مدح و تعریف بیان کی گئی ہے۔ اور کلام کا یہ حصہ بلیغ ترین حصہ ہے جو بلاغت کے احسن انداز میں بیان ہوا ہے۔ مولا امیر علیہ السلام فرماتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حرمت والے گھر کا حج تم پر واجب کیا ہے)۔ حج کا فرض ہونا اور اس کا وجوب کتاب و سنت اور اجماع مسلمین سے ثابت ہے بلکہ جیساکہ آخرِ فصل میں انشاء اللہ بیان ہوگا اس کا شمار ضروریاتِ دینِ اسلام میں ہوتا ہے۔

بیت اللہ کا تفصیلی ذکر

بیت اللہ الحرام یا خانہ کعبہ دنیا کا وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کیلئے بنایا گیا ہے جو بڑا ہی بابرکت اور تمام جہان والوں کیلئے باعث ہدایت ہے۔ اور یہ زمین کے جس حصے میں واقع ہے وہ زمین کا وہ اولین ٹکڑا ہے جسے اللہ سبحانہ نے پانی کی جھاگ سے پیدا کیا، زمین کو اس کے نیچے سے بچھایا، اسے دوسرے تمام خطوں پر ترجیح دی اور اسے ملائکہ مقربین، انبیاء و مرسلین اور خدا کے عباد صالحین کیلئے طواف کرنے کی جگہ قرار دیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اس کا حکم دینے والا رب جلیل، بنانے والے ابراہیم خلیلؑ، انجینئر جبرائیلؑ اور مزدور اسماعیلؑ ہوں! ارشاد رب العزت ہے: ”وَ اِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَلاَّ تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ“ (حج / ۲۶) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کے واسطے خانہ کعبہ کی جگہ ظاہر کر دی اور ان سے کہا کہ میرا کسی چیز کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کا طواف اور قیام، رکوع اور سجود کرنے والوں کے واسطے پاک و پاکیزہ رکھنا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر بیت اللہ کی اصل بناء اس کا مبنا اور اس کے مشاعر و مناسک کی کچھ تفصیلی بات ہو جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ اس ”بیت“ کو ”حرام“ کیوں کہتے ہیں؟ یہ بحث تین مقاصد پر مشتمل ہوگی

پہلا مقصد

بیت اللہ کا محل وقوع:

جیسا کہ بیت اللہ کے محل وقوع کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ اجزائے ارض کا پہلا جزو ہے جو خالق باری کے علم میں ہے۔ اس سلسلے میں من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ: ”خداوند عالم نے جب زمین کو خلق کرنے کا ارادہ فرمایا تو چاروں ہواؤں کو حکم دیا کہ وہ چلیں اور پانی کے اندر زور زور کی لہریں پیدا کریں۔ اور ان موجوں کے باہم ٹکرانے سے جھاگ پیدا ہوئی اور ہر طرف کی جھاگ کو حکم دیا کہ ایک جگہ اکٹھا ہو جائے۔ چنانچہ ہر طرف کی جھاگ ایک جگہ پر اکٹھا ہوئی جس سے جھاگ کا ایک پہاڑ بن گیا، اس کے بعد اس کے نیچے سے زمین کو بچھانا شروع کیا(۱) چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا“ (آل عمران / ۹۶) یقیناً (لوگوں کی عبادت کے واسطے) جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا ہے وہ یہی کعبہ ہے جو مکہ میں ہے بڑی خیر و برکت والا ہے۔ تو زمین کا سب سے پہلا بقعہ ”کعبہ“ ہی بنا پھر اس کے بعد باقی زمین کو بچھایا گیا“ البتہ اس کی اصل بناء کے بارے میں من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے ایک روایت ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں: ”پچیسویں ذیقعدہ کو اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ بیت اللہ الحرام کو اتارا، لہٰذا جو شخص اس دن روزہ رکھے گا تو وہ روزہ اس کے ستر سال کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اور یہ پہلا دن ہے جس میں اللہ نے آدمؑ پر آسمان سے رحمت نازل فرمائی“۔ ایک اور روایت میں ہے جو کہ اسی

---

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ میں ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو زمین کے بچھانے سے دو ہزار سال پہلے خلق فرمایا“ قول مصنف: زمین کے بچھانے کا عمل پچیس (۲۵) ذیقعد کو وجود میں آیا اسی لئے اس دن کا روزہ مستحب ہے، حضرت امام رضا علیہ السلام سے من لا یحضرہ الفقیہ میں ایک روایت منقول ہے کہ: ”جو شخص اس دن کا روزہ رکھے گویا اس نے ساٹھ ماہ کے روزے رکھے“۔

کتاب میں ابی خدیجہ کے ذریعے حضرت امام جعفر صادقؑ سے بیان کی گئی ہے کہ : "خداوند عزوجل نے اس گھر کو آدمؑ کیلئے جنت سے نازل فرمایا اس وقت وہ سفید موتی کی طرح (چمکدار) تھا، پھر خدا نے اسے آسمان کی طرف اٹھالیا لیکن اس کی اساس اور بنیاد اپنی جگہ پر باقی رہی، اور وہ موجودہ گھر کے اطراف میں ہے، جہاں پر روزانہ ستر ہزار ملائکہ داخل ہوتے ہیں اور (جب جاتے ہیں) تو پھر کبھی واپس نہیں آتے۔ پھر اللہ نے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ بیت اللہ کو اسی بنیاد پر کھڑا کریں"۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں ایک طویل روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں :

"جب حضرت اسماعیلؑ سن بلوغ کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ کو از سر نو تعمیر کریں! انہوں نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ زمین کے کس ٹکڑے پر ؟ فرمایا: "جہاں پر میں نے آدمؑ کیلئے قبہ نازل کیا تھا، جس کے حرم سے روشنی پھوٹتی رہتی تھی۔ اور یہ قبہ روئے زمین پر طوفانِ نوحؑ تک موجود رہا، جب طوفان نوحؑ آیا اور اللہ نے دنیا کو غرق کیا تو اس قبہ کو اٹھالیا، ساری دنیا طوفان میں غرق ہوگئی سوائے اسی گھر کی جگہ کے۔ اسی لئے اس گھر کا نام "بیت العتیق" رکھا گیا، کیونکہ اللہ نے اسے غرق ہونے سے آزاد رکھا۔ جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو "بیت اللہ" کے بنانے کا حکم دیا تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ کہاں بنایا جائے تو اللہ نے حضرت جبرائیلؑ کو بھیجا اور انہوں نے اس جگہ کی نشاندہی کی اور اللہ نے جنت سے اس کی بنیادیں بھیجیں۔ اور جس پتھر کو "حجر اسود" کہتے ہیں اسے اللہ نے حضرت آدمؑ کے ہمراہ بھیجا تھا، اس کا رنگ برف سے بھی زیادہ سفید تھا، جب کفار کے ہاتھوں نے اسے چھوا تو وہ سیاہ ہوگیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے گھر بنایا اور اسماعیلؑ اس پتھر کو اٹھا کر نو ہاتھ کی بلندی پر لے گئے، جبرائیلؑ نے اس کی اصل جگہ کی نشاندہی کی ابراہیمؑ نے اسے وہاں سے اپنی جگہ پر رکھ دیا............"۔

قول مصنفؒ: ان دو اور بعد میں ذکر ہونے والی دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیاد تو حضرت آدمؑ کے زمانہ ہی میں رکھ دی گئی تھی، اور مذکورہ دونوں روایات سے وہ بعض روایات بھی مطابقت رکھتی ہیں جو اس بات پر دلالت کررہی ہیں کہ اس کی بنیاد حضرت آدمؑ ہی کے زمانے میں رکھی گئی۔ پھر حضرت نوحؑ کے زمانے میں اس کے آثار مٹ گئے تھے۔ جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے از سر نو اجاگر کیا۔ اس کے بعد عمالقہ نے اسے بنایا، پھر قریش اور آخر میں حجاج ملعون نے۔

ابو بصیر کی زبانی ایک روایت من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے بیان ہوئی ہے کہ : "آدمؑ وہی تو ہیں جنہوں نے بیت اللہ کی بنیادیں کھودیں اور اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور آپؑ وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے اس پر بالوں (سے بنے ہوئے کپڑے) کا غلاف چڑھایا اور سب سے پہلے اس کا حج ادا کیا......"۔ البتہ بعض دوسری روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر حضرت آدمؑ سے پہلے ایک گھر تھا جس کا نام "بیت الضراح" تھا جس کا ملائکہ طواف کرتے تھے۔ اور جب حضرت آدمؑ زمین پر تشریف لائے تو آپؑ کو بھی اس کے طواف کا حکم ہوا"۔

اس روایت کی تائید وہ روایت بھی کررہی ہے جو شیخ صدوقؒ نے زرارہ بن اعین کے بھائی "بکیر بن اعین" سے نقل کی ہے اور انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: "آپؑ کے قربان جاؤں! میں آپؑ سے چالیس سال پہلے کے حج کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں آپؑ مجھے بتائیں گے ؟" امامؑ نے فرمایا: "زرارہ! جس گھر کا حج آدمؑ سے بھی دو ہزار

سال پہلے کیا جاتا آرہا ہو تم اس کے بارے میں چالیس سال پہلے کے مسائل پوچھنا چاہتے ہو؟"۔اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ چل کر بیان ہو گی۔

دوسرا مقصد

بعض مشاعر عظام مثلاً حجر اسود اور مقام ابراہیمؑ کے بارے میں ہے اور ان کا شمار ان آیات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَٰتٌ "اس میں واضح نشانیاں ہیں۔

حجر اسود کیا ہے؟

حجر اسود میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے عہد و میثاق امانت رکھ چھوڑے ہیں۔ چنانچہ شیخ صدوقؒ من لا یحضرہ الفقیہ میں کہتے ہیں کہ: "حجر اسود کو بوسہ اور سلام اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ عہد پورا کیا جاسکے جو اللہ تعالیٰ نے میثاق کی صورت میں اپنی مخلوق سے لیا تھا، اور اس پتھر کو اس لئے رکن ہی میں رکھا گیا ہے اور دوسری جگہ نہیں رکھا گیا کیونکہ اسی جگہ پر اللہ نے مخلوق سے میثاق لیا تھا۔ اور اسی زمانے سے اب تک یہاں پر تکبیر کہنا سنت چلا آرہا ہے۔ جس رکن میں حجر اسود کا رخ کوہ صفا کی طرف ہے، کیونکہ جب آدمؑ نے دیکھا کہ پتھر کو رکن میں رکھ دیا گیا ہے تو انہوں نے خداوند عالم کی تکبیر و تہلیل اور تمجید کہنا شروع کر دی۔ اور میثاق کو اس پتھر میں اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اپنی ربوبیت، حضرت محمدؐ کی نبوت اور حضرت علیؑ کی وصایت کا میثاق لیا تو فرشتوں کا جوڑ جوڑ کانپنے لگا۔ اور اسی پتھر نے سب سے پہلے اس کا اقرار کیا، اسی بنا پر اللہ نے اسے اسی بات کیلئے منتخب کر لیا اور یہ میثاق اسی کے حوالے کر دیا۔ جب قیامت کا دن ہو گا تو اسے بولنے والی زبان اور دیکھنے والی آنکھیں عطا ہوں گی۔ وہ ہر اس شخص کو دیکھے گا جس نے اپنا عہد اس جگہ پر آکر پورا کیا اور میثاق کی پابندی کی۔ اور خدا نے اس پتھر کو جنت سے اس لئے نکالا ہے تاکہ وہ حضرت آدمؑ کو ان کا بھولا بسرا عہد و میثاق یاد دلائے"۔

اس کی تفصیل: اس کی تفصیل اور سند وہ روایت ہے جسے اسناد کے ساتھ بکیر بن اعین کی زبانی حضرت امام جعفر صادقؑ سے بیان کیا گیا ہے، بکیر کہتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "جانتے ہو کہ حجر اسود کیا ہے؟" میں نے عرض کیا: "نہیں جناب! میں نہیں جانتا!" امامؑ نے فرمایا: "یہ اللہ کے عظیم فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھے، جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے عہد و میثاق لیا تو سب سے پہلے اسی فرشتے نے اس کا اقرار کیا، جس پر اللہ نے اسے اپنی تمام مخلوق کا امین بنا دیا اور ساتھ ہی اسے یہ میثاق بھی سپرد کر دیا اور اس کی امانت میں دے دیا اور اپنی مخلوق سے عبادت کی غرض سے یہ بھی چاہا کہ ہر سال اپنے اس عہد و پیمان کی تجدید کریں جو اللہ نے ان سے لیا ہے، پھر اللہ نے اسے آدمؑ کے ساتھ جنت میں بھیج دیا کہ ہر سال انہیں یہ میثاق یاد دلاتا رہے اور اس کی تجدید کراتا رہے۔ جب حضرت آدمؑ اپنے عصیان کی وجہ سے بہشت سے باہر بھیجے گئے تو اللہ نے انہیں وہ عہد و میثاق فراموش کرا دیا جو اس نے ان سے اور ان کی اولاد سے حضرت محمدؐ اور ان کے وصیؑ کیلئے لیا تھا۔ اور آدمؑ کو حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں چھوڑ دیا، اور

جب ان کی توبہ قبول فرمائی تو اسی فرشتے کو سفید موتی کی صورت میں تبدیل کر کے بہشت سے آدمؑ کی طرف بھیج دیا جبکہ وہ سر زمین ہند میں تھے۔ جب آدمؑ نے اسے دیکھا تو اس سے بڑے مانوس ہو گئے لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک موتی ہے۔ اس پر اللہ نے اس "موتی" کو قوت گویائی عطا کی اور اس نے ان سے پوچھا: "آدمؑ! آیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "نہیں!" اس نے کہا: "آپ سچ کہتے ہیں، شیطان کی شیطنت کی وجہ سے آپ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں اور آپ وہ عہد و میثاق بھی بھول گئے ہیں" پھر وہ اس صورت میں تبدیل ہو گیا جو بہشت میں آدم کے ساتھ تھا۔ آدم سے کہنے لگا: "وہ عہد و میثاق کہاں ہے؟" اس پر آدم اس پر جھپٹ پڑے اور خوب روئے، میثاق کو یاد کیا، اسے چومنے لگے، اور عہد و میثاق کی تجدید کی۔ اللہ نے پھر اسے موتی کی مانند سفید اور چمکدار پتھر میں تبدیل کر دیا۔ اس کی عزت و احترام کی وجہ سے آدمؑ نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھالیا اور چلتے بنے، جب تھک جاتے تو جبرائیلؑ اسے اٹھا لیتے، چلتے چلتے آخر کار مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

مکہ میں وہ اس سے مانوس رہتے تھے، رات دن اپنے عہد و پیمان کی تجدید کیا کرتے تھے۔ پھر جب اللہ نے جبرائیلؑ کو زمین پر بھیجا اور انہوں نے کعبہ کی بنیاد رکھی تو "رکن"، "مقام" اور "دروازے" کے درمیان رک گئے۔ اور آدمؑ کو وہی جگہ دکھائی جہاں ان سے میثاق لیا گیا تھا اور کہا یہ وہی جگہ ہے جہاں آپ سے میثاق لیا گیا تھا۔ اور اسی جگہ پر فرشتے نے بھی اپنا میثاق ظاہر کر دیا۔ پس اسی وجہ سے اسے اسی رکن میں نصب کر دیا گیا۔ پھر حضرت آدمؑ بیت اللہ سے ہٹ کر "صفا" کی طرف چلے گئے اور حضرت حوا "مروہ" کی جانب رہسپار ہوئیں۔ اس پر حجر نے خدا کی تکبیر، تہلیل اور تمجید کہی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سعی کرتے ہوئے حاجی صاحبان صفا سے رکن کی طرف منہ کرتے ہیں تو تکبیر کہتے ہیں، اور یہ رسم اسی روز سے برابر چلی آرہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام عہد و میثاق اسی کے سپرد کر دیئے ہیں اور کسی اور فرشتے کے سپرد نہیں کئے۔ کیونکہ جب اللہ نے اپنی ربوبیت، محمدؐ مصطفیٰ کی نبوت اور علی بن ابی طالبؑ کی وصایت کا اقرار لیا تو تمام فرشتوں کا جوڑ جوڑ کانپنے لگا تو اسی فرشتے نے بڑھ کر سب سے پہلے اسی چیز کا اقرار کیا۔ چنانچہ اس سے بڑھ کر کسی اور فرشتے میں محمدؐ و آل محمدؐ کی شدت سے محبت نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں میں سے اسے ہی اس کام کیلئے منتخب کیا ہے اور میثاق اسی کے سپرد کیا ہے جب قیامت کا دن ہو گا تو اسے زبان اور آنکھیں عطا ہوں گی اور وہ ہر اس شخص کے متعلق گواہی دے گا جس نے اس مقام پر آکر اپنے عہد کو پورا کیا اور میثاق کی پابندی کی"۔

قول مصنفؒ: جس شخص کا علم نور نبوت اور وحی الٰہی سے اقتباس شدہ ہے وہ حجر اسود کے بوسے اور اس کے سلام کرنے کی وجوہات و اسرار کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے پاس جا کر امانت کی ادائیگی اس وجہ سے لازم قرار پائی ہے کہ اس نے اقرار ولایت میں تمام ملائکہ سے سبقت حاصل کی ہے۔ اور وہ اس بات کی معرفت بھی رکھتا ہے کہ کل بروز قیامت حجر اسود اس بات کی گواہی بھی دے گا اور کہے گا کہ فلاں شخص نے میرے پاس آکر اپنی امانت کو ادا کیا ہے۔ لیکن جس کے دل کو اللہ نے اندھا بنایا ہے اور گمراہی میں ڈالا ہوا ہے وہ صرف اسے پتھر ہی سمجھتا ہے جو نہ تو اسے نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان! چنانچہ فخر الدین رازی نے ایک بڑے آدمی کے متعلق لکھا ہے کہ حجر اسود کے پاس گئے اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "میں تجھے چوم تو رہا ہوں لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ تو کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نقصان! میرا رب اللہ ہی ہے اگر میں

پیغمبرؐ کو تیرے بوسے دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا"۔

امام غزالی اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :"...... پھر وہ رونے لگے اور ان کے رونے کی آواز دور دور تک پہنچنے لگی، پھر مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو علی بن ابی طالبؑ کرم اللہ وجہہ' موجود تھے۔ تو وہ حضرت علیؑ سے کہنے لگے :"یا ابا الحسن! یہیں پر آنسو بہائے جاتے اور دعائیں مانگی جاتی ہیں ؟" حضرت علیؑ نے فرمایا :"بلکہ وہ فائدہ بھی پہنچاتا ہے اور نقصان بھی!" انہوں نے کہا :"وہ کیسے ؟" حضرت علیؑ نے فرمایا :"اللہ تعالیٰ نے جب اولاد آدمؑ سے میثاق لیا تو اسے ایک کتاب میں درج کر دیا اور وہ سب کچھ اسی پتھر کے سپرد کر دیا، لہٰذا وہ مؤمن کے بارے میں ایفائے عہد کی اور کافر کے متعلق انکار اور سرپیچی کی گواہی دے گا"۔

قول مصنفؒ : مذکورہ جملہ کہ "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہی ہے جو نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے نہ تو نقصان" ہو سکتا ہے کہ۔ انہوں نے جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کہا ہو، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ جملہ "تجاہل عارفانہ" کی بنیاد پر ہو......"۔

حجر اسود نبی یا امام کے ہاتھوں ہی اپنی جگہ نصب ہوتا ہے

بعض روایات میں ہے کہ "حجر اسود" اس وقت تک اپنی جگہ پر نہیں ٹک سکتا جب تک کہ اسے نبیؐ یا امامؑ اپنی جگہ پر نہ رکھے۔ جیساکہ ابھی گزر چکا ہے کہ اسے سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے اپنی جگہ پر رکھا، پھر حضرت ابراہیمؑ نے، کیونکہ جب انہوں نے بیت اللہ بنالیا اور جب نوبت حجر اسود کے نصب کرنے تک پہنچی تو کوہ ابو قبیس نے آواز دے کر کہا :"ابراہیمؑ! میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے"۔ چنانچہ کوہ ابو قبیس نے وہ پتھر آپؑ کے حوالے کر دیا، اور انہوں نے اس پتھر کو اس کے اپنے مقام پر رکھ دیا۔ یہ روایت "من لایحضرہ الفقیہ" میں بیان کی گئی ہے۔

جب سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ کی دیواروں کو نقصان پہنچا تو قریش نے اسے گرا کر دوبارہ تعمیر کیا اور حجر اسود کو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جگہ پر نصب فرمایا۔ اور جب حجاج ملعون نے ابن زبیر کی وجہ سے خانہ کعبہ کو منہدم کیا اور اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا تو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے درخواست کی گئی اور آپؑ نے حجر اسود کو اس کے اپنے مقام پر نصب فرمایا۔ قرامطہ اسماعیلیہ کے دور میں جب اسے قرامطہ خانہ کعبہ سے اکھاڑ کر کوفہ لے گئے اور مسجد کوفہ میں جاکر نصب کر دیا تو پھر اسے دوبارہ مکہ معظمہ پلٹایا گیا اور حضرت امام صاحب العصر والزمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ' نے اسے اپنی جگہ پر نصب فرمایا۔ اور یہ غیبت کبریٰ کا زمانہ تھا۔ اور یہ تمام ہم نے صحیح روایات سے نقل کیا ہے۔

من لایحضرہ الفقیہ میں ہے کہ :"حجر اسود دراصل دودھ سے بھی زیادہ سفید اور شفاف پتھر تھا، لیکن بعد میں اولاد آدم کی خطاؤں اور گناہوں کی وجہ سے سیاہ ہو گیا تھا اگر اسے جاہلیت کی نجاست سے آلودہ لوگ مس نہ کرتے ہر بیماری میں مبتلا شخص اگر اسے ہاتھ لگاتا تو تندرست ہو جاتا"۔ علی بن ابراہیم قمی کی روایت کے مطابق "جو پتھر اللہ نے حضرت آدمؑ کی طرف بھیجا تھا وہ برف سے زیادہ سفید تھا لیکن جونہی اسے کفار کے ہاتھوں نے مس کیا تو وہ سیاہ ہو گیا"

کچھ مقام ابراہیمؑ کے بارے میں

مقام ابراہیمؑ کا شمار خدا کی بہت بڑی نشانیوں میں ہوتا ہے، جیسا کہ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ زرارہ بن اعین نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ: "آپؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ملاقات کر چکے ہیں؟" امامؑ نے فرمایا: "ہاں! مجھے یاد ہے ایک مرتبہ حضرتؑ کے ساتھ مسجد الحرام میں تھا کہ سیلاب آگیا اور لوگ کھڑے ہوگئے۔ کوئی باہر جانے لگا تو کوئی اندر آنے لگا۔ جو باہر جاتا تھا تو کہتا تھا: "مقام ابراہیمؑ کو سیلاب بہا کر لے گیا ہے" اور جو اندر آرہا تھا تو وہ کہتا تھا: "اپنی جگہ پر موجود ہے"۔ اسی اثناء میں امام حسینؑ نے مجھ سے پوچھا: "اے فلاں! یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے عرض کیا: "خدا آپؑ کا بھلا کرے انہیں اس بات کا اندیشہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں مقام ابراہیمؑ کو سیلاب بہا کر نہ لے گیا ہو!" یہ سن کر امام حسین علیہ السلام نے فرمایا: "اللہ نے اسے ایک بڑی نشانی قرار دیا ہے، اسے سیلاب کہیں نہیں لے جاسکتا!" یہ سن کر لوگ مطمئن ہوگئے"۔

مقام ابراہیمؑ کا محل وقوع

مقام ابراہیمؑ کہ جسے حضرت ابراہیمؑ نے بنایا تھا اس کی جگہ بیت اللہ کی دیوار کے ساتھ تھی اور یہ اسی جگہ پر قائم رہا یہاں تک کہ اسے زمانہ جاہلیت کے لوگ اسے وہاں سے ہٹا کر اس جگہ پر لے آئے جہاں پر اب ہے۔ لیکن جب حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو اسے اسی جگہ پر لے آئے جہاں پر حضرت ابراہیمؑ نے بنایا تھا۔ اور یہ حضرت عمر کے دور حکومت تک اسی جگہ پر باقی رہا، لیکن جب انہوں نے زمام اقتدار سنبھالی تو لوگوں سے پوچھا کہ: "تم میں سے کون شخص ہے جو مقام ابراہیمؑ کے اصل مقام کو جانتا ہو؟" تو اس وقت ایک شخص نے کہا: "میں نے اس کے فاصلے کو ماپا ہوا ہے اور جس اونٹ کے تنگ کے تسمے سے اسے ماپا تھا وہ اب بھی میرے پاس ہے"۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اس سے کہا: "وہ تنگ کا تسمہ لے آؤ" چنانچہ وہ شخص اسے لے آیا اور حضرت عمر نے اس کے ذریعہ فاصلے کو ماپا اور پھر مقام ابراہیمؑ کو اسی جگہ منتقل کر دیا۔

قرآن مجید میں مقام ابراہیمؑ کی قدر و منزلت اور اس کے عظیم شعائر اللہ اور آیات بینات میں شمار ہونا قرآن مجید میں یوں مذکور ہے: "فِيْهِ آيَاتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" (آل عمران / ۹۷) اس میں واضح نشانیاں اور مقام ابراہیمؑ ہے۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نشان بھی ہیں اور اس نشان کا سبب یہ ہے کہ جب خانہ کعبہ کی دیواریں بوقت تعمیر بلند ہونے لگیں تو آنجنابؑ نے اس پر کھڑے ہو کر دیواروں کو پتھروں کے ساتھ بلند کیا، اور اس پتھر پر آپؑ کے قدم دھنس گئے اور نشان ثبت ہوگئے۔ ایک ضعیف سی روایت یہ بھی ہے کہ: "جب حضرت ابراہیمؑ شام سے بیت اللہ کی زیارت کیلئے مکہ معظمہ تشریف لانے لگے تو اپنی زوجہ سے عہد کیا کہ مکہ میں اترے بغیر زیارت کر کے واپس آجائیں گے۔ لیکن جب مکہ معظمہ پہنچ گئے تو ان کی بیوی یا اسماعیلؑ کی بیوی نے درخواست کی کہ وہ سواری سے اتریں تاکہ ان کے سر کو دھلائیں! لیکن وہ اس سے نہ اترے، تو وہ خاتون اسی پتھر کو اٹھا کر لے آئی اور آپؑ کے دائیں جانب زمین پر رکھ دیا اور آپؑ نے اپنا پاؤں اس پر رکھا تو اس خاتون نے آپؑ کے سر کے داہنے حصے کو دھویا، پھر اسے بائیں طرف لے گئیں اور آپؑ نے اپنا بایاں پاؤں اس پر رکھا اور خاتون نے سر کے بائیں حصے کو دھویا"۔

یہاں پر جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ ایک ٹھوس پتھر کا اس قدر اثر قبول کرنا، قدموں کا ٹخنوں تک پتھر میں کھب جانا اور پھر

ہزاروں سال گزر جانے اور یہودیوں، نصرانیوں اور ملحدین جیسے لاکھوں کروڑوں سخت ترین دشمنوں کے باوجود، اس مقام کا اپنی اصل صورت پر باقی رہنا توحید کی عظیم ترین اور یگانگت کی واضح ترین دلیل ہے۔

تیسرا مقصد

خانہ کعبہ کو بیت الحرام کیوں کہتے ہیں؟

اس کی وجہ من لایحضرہ الفقیہ میں یہ بیان کی گئی ہے چونکہ اللہ تعالٰی نے اس میں مشرکین کے داخلے پر پابندی لگادی ہے اور ان کا داخلہ حرام قرار دیدیا ہے، اس لئے اسے "بیت اللہ الحرام" کہتے ہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ چونکہ اس میں بہت سی ایسی چیزیں حرام ہیں جو دوسرے گھروں میں حلال ہوتی ہیں مثلاً جماع، کسی نجاست سے آلودہ ہونا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ایک یہ احتمال بھی ہے کہ اس کی حدود میں احرام کے بغیر داخل ہونا حرام ہے۔ جیسا کہ من لایحضرہ الفقیہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ: "مسجد، کعبہ کی وجہ سے حرام ہے اور حرم مسجد بوجہ مسجد کے حرام ہے، اور احرام، حرم کی وجہ سے واجب ہے"۔

حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا: "اللہ تعالٰی نے مکہ معظمہ کو زمین و آسمان کی تخلیق ہی کے دن سے حرام اور محترم قرار دیدیا تھا، اور یہ قیامت تک ہی حرام اور محترم رہے گا۔ نہ تو مجھ سے پہلے کسی شخص پر اس کی حرمت حلال تھی اور نہ ہی میرے بعد قیامت تک کسی پر حلال ہو گی، سوائے دن کی اسی گھڑی کے"۔

بیت العتیق کے معنی

اللہ تعالٰی نے اس گھر کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی ہے: "وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ" (حج / ۲۹) اور قدیم عبادت گاہ (خانہ کعبہ) کا طواف کریں۔

"عتیق" کے دو معانی ہیں: ا۔ آزاد۔ ۲۔ کہنہ۔ اور بیت اللہ کیلئے لفظ عتیق کا استعمال دونوں طرح سے ہوتا ہے۔ عتیق بمعنی آزاد اس لئے کیونکہ وہ لوگوں میں سے کسی کی ملکیت نہیں، ہر ایک کی ملکیت سے آزاد اور صرف خدا کی ملکیت میں ہے۔ اور بمعنی کہنہ اور قدیم اس لحاظ سے کہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرت آدمؑ سے بھی پہلے سے ہے۔ یا پھر "عتیق" اس معنی کے لحاظ سے بھی ہے کہ وہ غرق ہونے اور طوفان کا شکار ہونے سے آزاد رہا ہے، کیونکہ طوفان نوحؑ کے زمانے میں اللہ نے اسے غرق ہونے سے آزاد کر کے آسمان کی طرف اٹھالیا تھا۔ نیز اس معنی کے لحاظ سے بھی "عتیق" ہے کہ "عتق الطائر" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں پرندہ جوچہ ہو کر گھونسلے میں پرواز چڑھے اور جب طاقتور ہو جائے تو شکاری اس کا شکار کرنے کیلئے آئے لیکن اللہ تعالٰی اسے ہلاکت سے دوچار کر دے۔

مکہ معظمہ کے مختلف نام

تفسیر صافی میں خصال شیخ صدوقؒ سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ "مکہ" کے پانچ نام ہیں: ا۔ ام القریٰ ۲۔ مکہ ۳۔ بکہ ۴۔ بساسہ (یا نساسہ) اس لئے کہ جب کوئی وہاں پر ظلم کرتا ہے تو یہ شہر اسے اپنے سے نکال دیتا ہے یا پھر اسے

ہلاک کر دیتا ہے ۵۔ ام رحم، جب لوگ اس سے پناہ طلب کرتے ہیں تو ان پر رحم کیا جاتا ہے۔ بہر حال حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام خانہ کعبہ کی بیت الحرام کے ساتھ توصیف کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ (جسے لوگوں کا قبلہ بنایا) اور یہ عبارت صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ تمام کائنات کا "قبلہ" صرف یہی گھر ہے جسے "کعبہ" کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ دور دراز کے لوگوں کیلئے عین کعبہ کی طرف رخ کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے لہٰذا اس کی سمت کی طرف رخ کر لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ہمارے علماء متاخرین کا موقف ہے۔ جبکہ متقدمین یہ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ، مسجد الحرام کا قبلہ ہے، مسجد الحرام، اہل حرم کیلئے قبلہ ہے اور حرم تمام دنیا کیلئے قبلہ ہے۔ اس کی مزید تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

خانہ کعبہ قبلہ عالم ہے

خانہ کعبہ قبلہ انام ہے، اس بارے میں کتاب اللہ میں یہ بات صراحت کے ساتھ موجود ہے، جبکہ سنت اور اجماع کا بھی اسی بات پر اتفاق ہے۔ چنانچہ خداوند عالم فرماتا ہے: "قَدْ نَرىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰيهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" (بقرہ / ۱۴۴) اے پیغمبرؐ! قبلہ بدلنے کے واسطے بے شک تمہارا یہ بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں، تو ہم ضرور تم کو ایسے قبلے کی طرف پھیر دیں گے کہ تم خوش ہو جاؤ۔ اچھا تو نماز ہی میں تم مسجد الحرام (کعبہ) کی طرف منہ کر لو۔ اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو اسی کی طرف اپنا اپنا منہ کر لیا کرو۔

شیخ صدوقؒ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں فرماتے ہیں: "نبوت کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرہ برس تک مکہ میں اور انیس مہینے تک مدینہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جس پر یہودیوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ آپؐ تو ہمارے قبلہ کے تابع ہیں جس سے آنحضرتؐ سخت غمگین ہوئے، چنانچہ ایک رات کو آپؐ نے باہر نکل کر آفاق سماوی کی طرف رخ کرنا شروع کر دیا۔ لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ جب صبح ہوئی تو نماز فجر ادا کی، اور جب ظہر کا وقت ہوا تو ابھی صرف دو ہی رکعت نماز پڑھی تھی کہ جبرائیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے کہ: "قَدْ نَرىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ......" پھر پیغمبر کا ہاتھ پکڑ کر آپؐ کو کعبہ رخ کر دیا۔ اور لوگوں نے بھی جو آپؐ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے آپؐ کی وجہ سے ادھر کو منہ پھیر لیا یہاں تک کہ مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ پر آگئیں۔ اور آپؐ کی اس نماز کا آغاز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ہوا اور اختتام خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے پر۔ یہی خبر مدینہ کی ایک مسجد میں پہنچی جہاں پر لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے ابھی دو ہی رکعت پڑھی تھی کہ اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر لیا، اسی طرح ان کی نمازِ عصر کا آغاز بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ہوا اور اختتام خانہ کعبہ کی طرف رخ پر ہوا۔ اسی بنا پر اس مسجد کو "مسجد قبلتین" یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر لوگوں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا: "یا رسول اللہؐ! ہم نے اب تک جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہیں تو کیا وہ سب اکارت گئیں؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ" (بقرہ / ۱۴۳) اور خدا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دے۔ یعنی تمہاری وہ نمازیں جو تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں"۔

احتجاج طبرسیؒ میں ہے کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں: "جب آنحضرتؐ مکہ معظمہ میں تھے تو اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں اور تاحد امکان خانہ کعبہ کو درمیان میں قرار دیا کریں۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر براہ راست ہی بیت المقدس کی طرف رخ کیا کریں اور آپ مکہ معظمہ میں مکمل تیرہ سال تک اسی طرح نماز ادا کرتے رہے۔ جب آپؐ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے تو وہاں پر بھی بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے (۱) تک منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور مردود سرکش یہودی کہنے لگے: "پتہ نہیں چلتا کہ محمدؐ کیسی نمازیں پڑھتے ہیں، ان کی نمازوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نماز میں ہمارے طریقہ کار کو اپنایا ہوا ہے، جبکہ دعویٰ نبوت کا کرتے ہیں"۔

یہ بات آنحضرتؐ پر سخت گراں گزری، اس طرح سے ان کے قبلے کو ناپسند فرمایا اور خانہ کعبہ سے محبت کا اظہار کیا۔ اسی اثناء میں حضرت جبرائیل امینؑ آئے اور آنحضرتؐ نے ان سے کہا: "میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ کاش اللہ تعالیٰ مجھے بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیتا، کیونکہ قبلہ کے بارے میں یہودیوں کے طعنوں سے مجھے سخت اذیت ہوتی ہے" تو جبرائیلؑ نے کہا: "آپؐ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کا رخ ادھر کو موڑ دے کیونکہ وہ آپؐ کی دعا کو رد نہیں کرتا اور آپ کی خواہشات کو پورا کرتا ہے"۔ جب آپؐ نے دعا مانگی اور وہ مکمل ہو گئی تو جبرائیلؑ آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ پھر اسی ساعت ہی وحی لے کر واپس آ گئے اور کہا: "یا محمدؐ! پڑھئے "قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ......" (بقرہ / ۱۴۴) اے پیغمبرؐ! قبلہ بدلنے کے واسطے بے شک تمہارا یہ بار بار آسمان کی طرف منہ کرنا ہم دیکھ رہے ہیں، تو ہم ضرور تم کو ایسے قبلے کی طرف پھیر دیں گے کہ تم خوش ہو جاؤ۔ اچھا تو نماز ہی میں تم مسجد الحرام (کعبہ) کی طرف منہ کر لو۔ اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو اسی کی طرف اپنا اپنا منہ کر لیا کرو۔

اس پر یہودی کہنے لگے: "مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا" (بقرہ / ۱۴۲) کہ مسلمان جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف پہلے سجدہ کرتے تھے اس سے دوسرے قبلے کی طرف مڑ جانے کا کیا سبب ہوا؟ تو اللہ نے انہیں یہ بہترین جواب دیا کہ اے محمدؐ! "قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ" (بقرہ / ۱۴۲) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کیلئے ہے مشرق اور مغرب۔ اور وہ انہی کا مالک ہے۔ جدھر چاہے جس کا رخ موڑ دے، جیسا کہ تمہارا رخ کسی اور جگہ کو موڑا ہوا ہے۔ "يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (بقرہ / ۱۴۲) جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ وہی ہر ایک مصلحت کو اچھی طرح جانتا ہے اور بندوں کی اطاعت انہیں بہشت بریں کی نعمتوں تک لے جائے گی۔ اور خدا ہی سب کی اصلاح کرنے والا اور انہیں جنت کی نعمتوں سے نوازنے والا ہے۔

تفسیر امامؑ میں ہے کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "کچھ یہودی لوگ حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: "یا محمدؐ! یہ بیت المقدس کا قبلہ کہ جس کی طرف منہ کر کے آپؐ چودہ برس تک نماز پڑھتے رہے اور اب آپؐ نے اسے چھوڑ دیا ہے، ہمیں بتائیے کہ کیا وہ حق تھا جسے آپؐ نے چھوڑ دیا ہے اور اب باطل کی طرف لوٹ گئے ہیں؟ کیونکہ جو حق کے مخالف ہوتا ہے وہ باطل ہی تو ہوتا ہے، یا وہ باطل تھا کہ جس پر آپؐ اتنا عرصہ کاربند رہے اور اب حق پر آ گئے

(۱) شک راوی کی طرف سے ہے جبکہ امام سے مروی سترہ مہینے ہی ہیں۔

ہیں ؟" آنحضرتؑ نے فرمایا : "وہ بھی حق تھا اور یہ بھی حق ہے۔ اس لئے کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے : "قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (بقرہ / ۱۴۲) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کیلئے ہے مشرق اور مغرب۔ خدا جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ جب اس کو تمہاری بہتری مشرق کی طف منہ کرنے میں نظر آئی تو تمہیں مشرق کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور جب مغرب کی طرف تمہاری بہتری مطلوب تھی تو اسی طرف تمہیں رخ کرنے کا حکم دیا۔ اور اگر دونوں اطراف کے علاوہ میں تمہاری بہتری سمجھے گا تو اسی کا حکم دے گا، لہذا بندوں کے بارے میں خدا کی تدبیروں پر اعتراض نہ کرو، کیونکہ وہ مصلحتوں کو بہتر سمجھتا ہے۔

اس کے بعد آنحضرتؑ نے فرمایا : "مجھے تم بتاؤ کہ پہلے تم نے سنیچر کے دن کام کرنے کی چھٹی کرلی تھی اور باقی دنوں میں کام کرتے تھے۔ پھر تم نے سنیچر کے دن بھی کاروبار کرنا شروع کر دیا، تو کیا تم نے حق کو چھوڑ کر باطل کا راستہ اپنایا ؟ یا باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف گامزن ہوئے ؟ یا باطل کو چھوڑ کر باطل کی طرف جا پہنچے ؟ یا حق کو چھوڑ کر حق کا راستہ اپنایا ؟ تو جو جواب تمہارا وہی جواب محمدؐ کا!"۔ انہوں نے جواب دیا : "سنیچر کے دن کی چھٹی بھی برحق تھی اور اس روز کا کام بھی برحق ہے" اس پر آپؑ نے فرمایا : "اسی طرح بیت المقدس کا قبلہ بھی اپنے وقت میں حق تھا، اس کے بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بھی اپنے وقت میں حق ہے"۔ انہوں نے سوال کیا کہ : "آیا آپؑ کے رب کو بدا ہوئی ہے کہ جو آپؑ کے بقول اس نے آپ کو بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے ؟" آپؑ نے فرمایا : "اسے بدا نہیں ہوئی، بلکہ وہ ہر ایک امر کے انجام سے اچھی طرح واقف ہے اور ہر ایک کی مصلحتوں پر قادر ہے، نہ تو اس سے غلطی کے ارتکاب کا امکان ہے اور نہ ہی وہ محل حوادث ہے کہ اس پر کئی حالتیں طاری ہوتی رہیں اور نہ ہی کوئی چیز اسے اپنی مراد کے حصول سے روک سکتی ہے، بلکہ وہ اس قسم کی تمام صفات سے بلند و بالا ہے" آپؑ نے پھر ان سے فرمایا : "یہودیو! مجھے بتاؤ کہ آیا اللہ تعالیٰ بیمار نہیں کرتا ؟ آیا پھر صحت و تندرستی عطا نہیں فرماتا ؟ یا پھر اس کے بعد ابدی بیماری میں مبتلا نہیں کر دیتا ؟ تو کیا اس بارے میں اسے بدا ہوتی ہے ؟ آیا وہ زندہ کرتا اور موت نہیں دیتا ؟ آیا اس سلسلے میں بھی اسے بدا ہوتی ہے ؟" تو انہوں نے جواب دیا کہ : "نہیں!" اس پر آپؑ نے فرمایا : "اسی طرح اللہ نے اپنے پیغمبر محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے عبادت چاہی ہے کہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے، جیسا کہ اس سے پہلے اس کی غرض یہ تھی کہ یہ عبادت بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کی جائے، تو اس بارے میں اسے بدا واقع نہیں ہوئی"۔ آنجنابؑ نے پھر فرمایا : "آیا خداوند عالم گرمیوں کے بعد سردی اور سردیوں کے بعد گرمی کا موسم نہیں لے آتا ؟ تو کیا اس میں بھی اسے بدا ہوتی ہے ؟" انہوں نے کہا کہ : "نہیں!" آپؑ نے فرمایا : "اسی طرح قبلہ کے بارے میں بھی اسے بدا واقع نہیں ہوئی" پھر فرمایا : "کیا اللہ نے تمہارے لئے ضروری قرار نہیں دیا کہ تم جاڑوں میں سردی سے بچنے کیلئے موٹے لباس سے استفادہ کرو اور موسم گرما میں گرمیوں سے بچنے کی کوشش کرو۔ تو کیا اسے بدا واقع ہو گئی تھی جب اس نے تمہیں جاڑوں کے لباس کو گرمی کے موسم میں استعمال کرنے سے منع کر دیا ؟" انہوں نے کہا : "نہیں! ایسا نہیں ہے" تو پھر آنحضرتؑ نے فرمایا : "اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہیں عبادت کا ایک ایسے وقت میں حکم دیتا ہے جس میں انسانوں کی مصلحت سمجھتا ہے۔ پھر اگر کوئی دوسرا حکم دیتا ہے تو بھی اس میں انسان کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، جسے وہ خود بہتر سمجھتا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم

کیونکر اس کے احکام کی اطاعت کر کے اس کے ثواب کے مستحق ہوتے ہو؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (بقرہ / ۱۱۵) اور اللہ ہی کیلئے ہے مشرق اور مغرب، پس جہاں کہیں ہو قبلہ کی طرف رخ کرلو وہیں خدا کا سامنا ہے، بے شک خدا بڑی وسعت والا اور واقف کار ہے۔ یعنی جب تم اس کے حکم کے مطابق منہ کرو گے تو خدا کا وہ رخ بھی ادھر کو ہو جائے گا جس کا قصد کر کے تم خدا سے کچھ حاصل کرتے اور اس کے ثواب کی امیدیں رکھتے ہو۔

آنحضرتؐ نے پھر ارشاد فرمایا: "اے خدا کے بندو! تمہاری مثال مریضوں کی سی ہے اور اللہ کی مثال طبیب جیسی، تو یہ طبیب پر منحصر ہے کہ مریض کی تشخیص کر کے اسے کس قسم کی دوا دیتا اور اس کیلئے چارہ جوئی کرتا ہے۔ وہ اپنی تشخیص ہی کے مطابق عمل کرتا ہے مریض کی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ لہٰذا تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دو اور اس کی منشا کے آگے ہتھیار ڈال دو، کامیاب ہو جاؤ گے اور اپنے مقصد کو حاصل کرلو گے" اس پر کسی نے سوال کیا: "یا رسول اللہؐ! تو پھر اللہ نے پہلے قبلہ اولیٰ کے بارے میں حکم دے کر پھر دوسرے قبلے کی طرف منہ کرنے کا حکم کیوں دیا؟" تو آنحضرتؐ نے فرمایا: "اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا" یعنی وہ قبلہ بیت المقدس ہے، "اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ" (بقرہ / ۱۴۳) اور جس قبلے کی طرف تم پہلے سجدہ کرتے تھے ہم نے صرف اس وجہ سے اسے قبلہ قرار دیا تھا کہ جب قبلہ بدلا جائے تو ہم ان لوگوں کو جو رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں ان لوگوں سے الگ دیکھ لیں جو الٹے پاؤں پھرتے ہیں۔ یعنی ہم اسے وجودی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جبکہ ہمیں علم تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ کہ اس سے مسلمانوں کی آزمائش مطلوب تھی، کیونکہ اس سے یہ پتہ چلانا مقصود تھا کہ محمد مصطفیٰؐ کی کون مخالفت کرتا ہے؟" وہ اس طرح کہ اہل مکہ کی دلی خواہش یہ تھی کہ قبلہ، خانہ کعبہ کو ہونا چاہئے تو اللہ نے اپنے پیغمبر کے تابع فرمان افراد اور ان کے مخالفین کی جانچ پڑتال کرنا چاہی کہ قبلہ کے بارے میں کون میرے پیغمبرؐ کی اتباع کرتا ہے اور کون مخالفت کرتا ہے، اسی لئے پیغمبرؐ نے انہیں بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اہل مدینہ کی خواہش بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کی تھی تو اس کے خلاف اور خانہ کعبہ کے حق میں حکم دے کر فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی جانچ کرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ کون آنحضرتؐ کی اس بارے میں تصدیق کرتا ہے اور کون تکذیب کرتا ہے۔ اس لئے خدا فرماتا ہے "وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ" (ایضاً) اگرچہ یہ الٹ پھیر سوائے ان لوگوں کے جن کی خدا نے ہدایت کی ہے سب پر شاق ضرور ہے۔ تو اس طرح اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق کون کرتا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کون کرتا ہے؟ حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (جہاں لوگ اس کی طرف کھنچ کر آتے ہیں جس طرح پیاسے حیوان پانی کی طرف) اس مقام پر حضرتؑ نے حجاج کرام کے بیت اللہ کی زیارت کو ان جانوروں سے تشبیہ دی ہے جو پانی کے پینے کی غرض سے اس کی طرف کھنچ کر جاتے ہیں۔ ان کے درمیان وجہ شبہ وہاں پر اجتماع اور بھیڑ ہے۔ اسی وجہ سے مکہ کو "بکہ" کہتے ہیں کیونکہ یہ "بک" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "دھکم پیل" اور ایک دوسرے کو دھکے دینا۔ جیسا کہ علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "بکہ کو بکہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں پر

انسانوں کے کھوے سے کھوا چھلتا ہے"۔

من لایحضرہ الفقیہ میں ہے کہ خانہ کعبہ نے زمانہ فترت (حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کی نبوت کے درمیانی عرصے) میں اللہ کی بارگاہ میں فریاد کی کہ : "پروردگارا! کیا ہو گیا ہے کہ میرے زائرین اور میرے پرسان حال لوگوں کی تعداد میں کمی واقع ہو گئی ہے!" تو اللہ نے اس کی طرف وحی فرمائی کہ : "میں اپنی نئی روشنی ایک قوم پر ڈال رہا ہوں جس کے افراد تیری طرف ایسے والہانہ انداز میں آئیں گے جیسے دلہن اپنے شوہر کے گھر کی طرف شوق سے جاتی ہے"۔ اسے لئے تو حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (اس طرح وار فتگی سے بڑھتے) اور تیزی سے چلتے (ہیں، جس طرح کبوتر اپنے آشیانوں کی جانب) اور یہ سب کچھ حجاج کرام کی بیت اللہ کے ساتھ شدید محبت اور قلبی رجحان سے کنایہ ہیں۔ (اللہ سبحانہ' نے اس) حج (کو اپنی عظمت کے سامنے ان کی فروتنی و عاجزی اور اپنی عزت کے اعتراف کا نشان بنایا ہے) کیونکہ اس طرح سے پتہ چل جاتا ہے کہ تو ضع کا اظہار کون کرتا ہے اور تکبر کا مرتکب کون ہوتا ہے؟ فروتنی اور عاجزی کس میں پائی جاتی ہے اور سرکشی اور اکڑفوں کا مظاہرہ کون کرتا ہے؟ کیونکہ جو تواضع اور انکساری اس میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور عبادت میں نہیں پائی جاتی۔ نہ صرف یہ کہ اس میں تواضع، خضوع، انکساری، عاجزی اور فروتنی پائی جاتی ہے بلکہ اس کیلئے گھر کو چھوڑنا پڑتا ہے، تعلقات کو منقطع کرنا پڑتا ہے، جسم کو تھکانا پڑتا ہے، خواہشات نفسانی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے، خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پہاڑوں اور صحراؤں میں دبلے پتلے گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ہونا پڑتا ہے، سر کو کھلا رکھنا پڑتا ہے، روزمرہ اور معمول کے لباس کو اتار دینا پڑتا ہے، غرض بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر مقصود کا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی عظیم مناسک ہیں جن کے اسرار کے ادراک سے عقلیں عاجز اور ان کے انوار کے اقتباس سے اوہام قاصر ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی بارگاہ میں قلب سلیم کے ساتھ جا پہنچتے ہیں تو خدا بھی صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

البتہ رہا وہ انسان جس کیلئے خدا کسی نور اور روشنی کا بندوبست نہیں کرتا تو اس کیلئے کوئی اور نور اور روشنی ہے ہی نہیں۔ اور جسے ہدایت اور دلیل عطا نہیں ہو پاتی وہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ من لایحضرہ الفقیہ میں ایک روایت ہے کہ ابن ابی العوجاء نے اپنی سرکشی کی وجہ سے حجاج کرام کے اس فعل یعنی حج کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اور اس بارے میں علماء سے سوال و جواب یا ان کے ساتھ نشست و برخاست کو بھی اپنی خباثت لسانی اور خبث باطنی کی وجہ سے مناسب نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ اتفاق سے ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ حضرت امامؑ اپنے ہم نظر دوستوں کی جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب وہ مجلس میں داخل ہوا اور بیٹھ گیا تو امامؑ سے عرض کیا: "مجلس امانت ہوا کرتی ہے اور جسے سوال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اسے ضرور سوال کرنا ہوتا ہے، آیا آپؑ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں آپؑ سے کچھ سوال کروں؟" امامؑ نے فرمایا: "پوچھو!" تو وہ کہنے لگا: "اس کھلیان کو کب تک گاہتے رہو گے (۱) اور اس پتھر کی کب تک پناہ حاصل کرتے رہو گے؟ کب تک اس گھر کی عبادت کرتے رہو گے جو اینٹوں اور پتھروں سے اٹھایا گیا ہے؟ اس کے گرد کب تک، بھاگنے والے اونٹ کی طرح دوڑتے رہو گے؟ جو شخص بھی اس بارے میں سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کی بنیاد کسی ایسے نے

(۱) اس نے مسلمانوں کے طواف کو گندم کے گاہنے سے تشبیہ دی ہے اور خانہ کعبہ، اس کے طواف اور حجاج کرام کا تمسخر اڑاتے ہوئے گستاخانہ لب و لہجے میں بات کی ہے۔

رکھی ہے جو نہ کسی حکمت سے آشنا تھا اور نہ ہی صاحب نظر! مجھے آپؑ ہی اس کا جواب دیجئے کیونکہ آپؑ ہی اس سارے نظام کے راس و رئیس اور علمبردار ہیں!"

یہ سن کر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "جسے خدا گمراہی میں ڈال دے اور اندھا کردے تو وہ حق کو بوجھل سمجھنے لگتا ہے، اسے اپنی طبیعت کے موافق نہیں پاتا، اور اسے اس کا ذائقہ کڑوا لگتا ہے۔ اس کی باگ ڈور شیطان کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور وہ اسے ہلاکت کے گھاٹ ایسے اتارتا ہے کہ پھر اس کا وہاں سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ (جس گھر کے بارے میں تم نے اشارہ کیا ہے تو سنو!) یہ گھر وہ ہے جہاں پر اللہ نے اپنے بندوں سے اپنی عبادت کی منشاء ظاہر کی ہے تاکہ وہ ان کی فرمانبرداری میں ان کی آزمائش کرے، لہٰذا اس نے بندوں کو اس کی تعظیم اور زیارت پر آمادہ کیا ہے، اور اسے اپنے انبیاء کا مقام اور نمازیوں کیلئے قبلہ قرار دیا ہے۔ وہ تو خدائی رضامندی کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے اور اس کی مغفرت تک رسائی کا ایک راستہ ہے۔ کمال کے خط استوا پر قائم ہے اور خدائی عظمت و جلال کے اجتماع کا مقام ہے۔ اللہ نے اسے زمین کے بچھائے جانے سے بھی دو ہزار سال قبل خلق فرمایا، جو اللہ ارواح اور صورتوں کا پیدا کرنے والا ہے وہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ تمام اوامر و نواہی میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے"۔

حجاج کی تعریف اور حج کیلئے حضرت ابراہیمؑ کی اذان

حضرت امیر المؤمنینؑ اپنے اس خطبے میں حجاج کرام کی ان الفاظ میں تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ (اس نے اپنی مخلوق میں سے سننے والے لوگ چن لئے جنہوں نے) حج کیلئے (اس کی آواز پر لبیک کہی اور اس کے کلام کی تصدیق کی) جو حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر جاری ہوئی۔ وہ کلام یہی حج کیلئے اذان اور حج کی بجا آوری کا حکم تھا۔ اور کلام کی تصدیق سے مراد یہ ہے کہ جس بات کا انہیں حکم دیا گیا تھا اسے بجالائے۔ اور اسی بات کو قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے: "وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالاً وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" (حج / ۲۷) اور لوگوں کو حج کی خبر کردو کہ لوگ جوق در جوق پیادہ اور ہر طرح کی دبلی سواری پر جو راہ دور دراز طے کر کے آئی ہوں گی، تمہارے پاس آئیں گے۔

علی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ: "جب حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو گئے تو اللہ نے انہیں حکم دیا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کریں ان میں حج کیلئے اذان کہیں اور انہیں حج کی بجا آوری کیلئے دعوت دیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا "پروردگار! میری آواز کہاں تک پہنچ پائے گی؟" فرمایا "اذان تو دو! اذان دینا تمہارا کام اور لوگوں تک پہنچانا میرا کام" یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ مقام ابراہیم پر چڑھ گئے جو اس وقت خانہ کعبہ کے بالکل متصل تھا، اور مقام ابراہیمؑ انہیں اٹھا کر اس قدر اونچا ہو گیا کہ پہاڑ بھی اونچائی میں اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت حضرتؑ نے اپنی دونوں انگلیاں اپنے کانوں میں دے کر مشرق و مغرب کی طرف منہ کر کے کہا "لوگو! تم پر بیت عتیق (خانہ کعبہ) کا حج فرض کر دیا گیا ہے، لہٰذا اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہو!" یہ سن کر سات سمندروں کے نیچے سے اور روئے زمین کے ہر کنارے سے خواہ وہ مشرق کا ہو یا مغرب کا لوگوں نے مردوں کی صلبوں سے اور عورتوں کے رحموں سے لبیک کہی، یعنی لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ آیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب لوگ حج کیلئے آتے ہیں تو لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس

دن سے قیامت تک کیلئے حج کرتا ہے وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے خدا کی دعوت کو قبول کیا ہے"۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ" "اس میں واضح نشانیاں اور مقام ابراہیمؑ ہے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ اس مقام پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے حج کیلئے لوگوں کو بلایا۔

کافی اور علل الشرائع میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ: "جب اللہ نے ابراہیم واسماعیل (علیہما السلام) کو خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اور گھر کی تعمیر مکمل ہو گئی تو ابراہیمؑ ہر رکن پر جا بیٹھے اور لوگوں کو "هَلُمَّ اِلَى الْحَجِّ" "کہہ کر حج کی دعوت دی، جس کے معنی ہیں "حج کی طرف آ" اور اگر وہ "هَلُمُّوْا اِلَى الْحَجِّ" "یعنی حج کی طرف آؤ، کہتے تو اس وقت صرف وہی لوگ حج کرتے جو اسی زمانے میں موجود تھے۔ لیکن چونکہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ دعوت حج دی "هَلُمَّ هَلُمَّ الْحَجُّ الْحَجُّ" (۱) حج کیلئے آ، تو مردوں کی صلبوں میں موجود افراد نے بھی کہا "لَبَّيْكَ دَاعِيَ اللهِ، لَبَّيْكَ دَاعِيَ اللهِ" "خدا کی طرف پکارنے والے میں حاضر ہوں، حاضر ہوں خدا کی طرف دعوت دینے والے!۔ چنانچہ جس نے جتنی مرتبہ لبیک کہی اتنی مرتبہ حج کا شرف حاصل کرے گا۔ اگر دس مرتبہ کہی ہے تو دس مرتبہ، پانچ مرتبہ کہی ہے تو پانچ مرتبہ، غرض اس سے کم یا زیادہ جتنی مرتبہ لبیک کہی، اتنی مرتبہ حاجی بنے گا۔ اور من لا یحضرہ الفقیہ میں بھی اسی طرح منقول ہے۔

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (وہ انبیاء کی جگہوں پر ٹھہرے) یہ جملہ اپنے سابقہ جملوں کی طرح حجاج کیلئے تشویق وترغیب کا سبب ہے کہ وہ مناسک حج بجا لائیں اور اس راہ میں پہنچنے والی تکالیف اور اذیتوں کو برداشت کریں، کیونکہ اگر وہ غور وفکر سے کام لیں اور سوچیں کہ وہ اس وقت کس جگہ پر کھڑے ہیں؟ تو انہیں معلوم ہو گا کہ وہ انبیاءؑ کی اتباع اور آسمانی ملائکہ کی مشابہت میں انہی کی جگہ کھڑے ہیں تو وہ ہر دکھ اور تکلیف کو آسانی کے ساتھ برداشت کریں، اور ذلت وحقارت کو خاطر میں نہ لائیں، بلکہ دکھ تکلیف کو لذت اور اس ذلت وحقارت کو عزت سمجھیں۔

انبیاءؑ اور مرسلینؑ کا حج

حضرت آدمؑ نے حج کیا

تمام انبیاء میں سے سب سے پہلے حضرت آدمؑ ہیں جنہوں نے حج کیا، اور اس پر بہت سی روایات دلالت کر رہی ہیں۔ چنانچہ ان میں سے:

ا۔ ابان بن عثمان سے اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ جنت سے نکالے جانے، اللہ تعالیٰ کے جوار اور بہشت کی محرومی پر چالیس دن تک کوہ صفا پر سجدے کی حالت میں گریہ وزاری کرتے رہے۔ پھر حضرت جبرائیلؑ نازل ہوئے اور پوچھا کہ: "آدمؑ! آپ کس بنا پر رو رہے ہیں؟" تو انہوں نے کہا: "جبرائیلؑ! اب بھی نہ روؤں کہ ایک تو اللہ نے مجھے اپنے پڑوس سے نکال دیا ہے، دوسرے مجھے زمین پر اتار دیا ہے" اس پر جبرائیلؑ نے کہا: "آپؑ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے!"

(۱)...... بظاہر تو یہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو جمع کا صیغہ استعمال کرنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے مفرد کا صیغہ اس لئے استعمال کیا کہ اس میں ایک خاص راز پوشیدہ ہے، اور وہ مفرد کے استعمال سے تمام افراد کا استغراق ہے، چاہے وہ حاضر ہوں یا غائب۔ کیونکہ اہل بلاغت کا کہنا ہے کہ مفرد کا استغراق اپنے افراد کو جمع کے استغراق سے زیادہ شامل ہوتا ہے، اور اس پر علامہ جار اللہ زمخشری نے اپنی تفسیر "الکشاف" میں ایک سے زیادہ مقامات پر نص قائم کی ہے.......... البتہ محقق کاشانیؒ نے جو علت بیان کی ہے وہ بھی صحیح ہے لیکن انہوں نے اس کی جو دلیل بیان کی ہے وہ منفی کلام کے بارے میں ہے مثبت میں نہیں۔ اس میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

انہوں نے کہا: "توبہ کیونکر کروں؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کیلئے نور کا ایک قبہ بھیجا جس میں "بیت اللہ" کا مقام تھا، اس کے نور نے مکہ کے اطراف کو اپنی شعاعوں میں لے لیا اور وہ تمام نورانی علاقہ حرم مکہ کہلایا۔ پھر اللہ نے جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ اس جگہ پر علامتیں لگائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور آدمؑ سے کہا: "اٹھیے!" اور وہ انہیں لے کر ترویہ (۸/ذیحجہ) کے دن باہر آگئے۔ اور ان سے کہا کہ آپؑ غسل کیجیے پھر احرام باندھیے!" جب آدمؑ کو بہشت سے نکالا گیا تھا تو وہ ذیقعدہ کی پہلی تاریخ تھی اور جب آٹھ ذیحجہ کی تاریخ آئی تو جبرائیلؑ انہیں "منیٰ" کی طرف لے آئے۔ اور انہوں نے وہ رات منیٰ ہی میں بسر کی، جب ۹/ذیحجہ کا دن ہوا تو جبرائیل انہیں "عرفات" کی طرف لے گئے، اور مکہ سے باہر آتے وقت انہوں نے آدمؑ کو احرام باندھنے کا طریقہ اور تلبیہ کہنا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ وہ زوال آفتاب تک تلبیہ کہتے رہے، اس کے بعد تلبیہ کہنا ترک کر دیا۔ اس کے بعد جبرائیلؑ نے انہیں غسل کرنے کا کہا، جب نماز عصر پڑھ لی تو انہیں مقام عرفات پر ٹھہرا لیا اور مندرجہ ذیل کلمات جو کہ خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے انہیں تعلیم کئے:

"سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْٓءً اَوْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْٓءً اَوْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" بارالہا! تو پاک و منزہ ہے، میں تیری تسبیح کے ساتھ حمد بھی کرتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں میں نے برا کام کیا ہے، اور اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں میرے گناہوں کو بخش دے کہ تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے، .... تو میرے گناہوں کو معاف کر دے کہ تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

یہی کیفیت غروب آفتاب تک باقی رہی۔ پھر جبرائیلؑ انہیں مشعر الحرام (مزدلفہ) کی سرزمین میں لے گئے۔ انہوں نے وہاں پر رات بسر کی، جب صبح ہوئی تو مشعر الحرام ہی میں کھڑے ہو کر خدا سے انہی کلمات کے ساتھ دعا مانگی اور گناہوں سے توبہ کی۔ اس کے بعد منیٰ کی طرف چل دیئے، اس کے بعد جبرائیلؑ نے ان سے کہا کہ اپنا سر مونڈیئے!" تو انہوں نے اپنا سر مونڈا(۱) پھر جمرہ اولیٰ کی طرف پتھر مارنے کیلئے لے آئے۔ یہاں پر شیطان ملعون سے ٹاکرا ہو گیا، اس نے کہا: "آدمؑ! کہاں جا رہے ہو؟" جبرائیلؑ نے کہا: "شیطان کو سات پتھر ماریے! اور ہر پتھر کے ساتھ تکبیر بھی کہیے، انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد آگے کو چل دیئے تو شیطان پھر انہیں جمرہ وسطیٰ کے پاس مل گیا، جبرائیلؑ کے کہنے پر آدمؑ نے وہاں پر بھی سات پتھر مارے اور ساتھ ہی ہر پتھر کے ساتھ تکبیر بھی کہی، پھر آگے بڑھے تو تیسرے جمرہ (عقبہ) کے پاس پھر ابلیس سے ٹاکرا ہو گیا وہاں پر بھی ویسے ہی اسے سات پتھر مارے، پھر آگے کو چلے گئے اور ابلیس نے بھی اپنی راہ لی۔ حضرت جبرائیلؑ نے ان سے کہا: "اب تو انہیں کبھی نہیں دیکھے گا" اس کے بعد حضرت جبرائیلؑ انہیں بیت اللہ کی طرف لے آئے اور انہیں اس گھر کا سات مرتبہ چکر لگانے (طواف کرنے) کا کہا، انہوں نے اس کا طواف کیا۔ جب طواف کر لیا تو جبرائیلؑ نے آدمؑ سے کہا: "اللہ نے آپؑ کی توبہ قبول کر لی ہے اور آپؑ کی زوجہ آپؑ پر حلال کر دی ہے۔ جب آدمؑ نے حج مکمل کر لیا تو مقام ابطح پر ملائکہ نے آپؑ کو اس کی مبارکباد دی اور کہا: "آپؑ کا حج قبول ہو، ہم آپؑ سے دو ہزار سال پہلے اس گھر کا حج

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ حضرت جبرائیلؑ جنت سے ایک بلور لے کر آئے، بروایتے سرخ یاقوت لائے تھے، اور اسے آدمؑ کے سر پر چلایا تھا کہ جس سے ان کے سر کے بال مونڈے گئے۔

کر چکے ہیں"۔

۲۔ من لایحضرہ الفقیہ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت بیان کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ اسی بیت اللہ کے پاس ایک ہزار مرتبہ پیدل آچکے ہیں، سات سو مرتبہ حج کیا اور تین سو بار عمرہ ادا کیا، اور آپؑ شام کی طرف سے ادھر کو آئے تھے۔ اور جبل ثور پر حج کرتے تھے(۱)۔ جس جگہ "حطیم" بنایا گیا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جو بیت اللہ اور حجر اسود کے درمیان ہے اور حضرت آدمؑ نے اس جگہ کا طواف حضرت حوا کو دیکھنے سے ایک سو سال پہلے کیا تھا۔ اس پر حضرت جبرائیلؑ نے آپؑ سے کہا: "حَيَّاكَ اللّٰهُ وَ بَيَّاكَ "(۲) خدا آپؑ کو زندہ رکھے اور آپؑ کا بھلا کرے۔

۳۔ من لایحضرہ الفقیہ ہی میں اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "خانہ کعبہ زمین کی بلند جگہ پر واقع تھا اور سورج اور چاند کی مانند جگمگاتا رہتا تھا۔ اور جب آدمؑ کے ایک فرزند کو ان کے بیٹے نے قتل کر دیا تو اس گھر کی رنگت بھی سیاہ ہو گئی۔ جب حضرت آدمؑ زمین پر تشریف لائے تھے تو اللہ نے تمام زمین کو اس قدر بلند فرمایا کہ جسے حضرت آدمؑ دیکھ سکیں۔ جب سب زمین کو دیکھ لیا تو خداوند تعالیٰ نے فرمایا: "آدمؑ! یہ زمین تیرے ہی لئے ہے" تو آدمؑ نے خداوند عالم کی بارگاہ میں عرض کیا: "زمین کا وہ چمکتا جگمگاتا ٹکڑا کیا ہے؟" خداوند تعالیٰ نے فرمایا: "یہ زمین پر میرا حرم ہے اور میں نے تمہارے اوپر فرض کر دیا ہے کہ تم روزانہ اس کے گرد سات سو طواف کرو"۔

حضرت نوحؑ کا حج

شیخ صدوقؒ "من لایحضرہ الفقیہ" میں فرماتے ہیں کہ روایت میں ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی کا طول (لمبائی) ایک ہزار دو سو ہاتھ، چوڑائی ایک سو ہاتھ اور اونچائی اسی ہاتھ تھی۔ جب آپؑ اس میں سوار ہوئے تو کشتی نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کی پھر اس کے بعد کوہ جودی پر جا کر رکی۔

حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا حج

جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ ان کا خصوصی تعلق رہا ہے اور اس کی تعمیر اور اس مقام پر ان کا قیام اور حج کی ادائیگی محتاج بیان نہیں ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا حج

شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ روایت میں ہے کہ: "حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "زملہ" سے احرام باندھا اور ستر انبیاء کے ساتھ حج کیا اور "صفائح الروحاء"(۳) سے ہو کر گزرے، ان پر قطوانی(۴) عبائیں تھیں۔ موسیٰؑ تلبیہ میں کہتے تھے "لَبَّيْكَ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدَيْكَ لَبَّيْكَ" حاضر ہے تیرا بندہ، حاضر ہے تیرے دو بندوں کا بیٹا!!

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سرخ اونٹ پر سوار ہو کر جس کی مہار کھجور کی چھال سے بنی ہوئی

---

(۱) یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا گزر جبل ثور پر سے ہوا ہو۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے وہیں پر مناسک حج ادا کئے ہوں۔ تفصیل ملاحظہ ہو "الالف" محمد تقی مجلسیؒ میں۔ (۲) "بَيَّاكَ" ایک دعائیہ کلمہ ہے جس کے معنی ہیں "بوّأَكَ اللّٰهُ منزلاً" لیکن جب یہ کلمہ "حَيَّاكَ" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے ہمزہ کو ترک کر دیا جاتا ہے اور واؤ کو یا میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب حضرت آدمؑ کے فرزند ہابیل کو قتل کر دیا گیا تو آدمؑ پورے ایک سو سال تک نہیں ہنسے، پھر ان سے کہا گیا: "حَيَّاكَ اللّٰهُ وَ بَيَّاكَ" تو انہوں نے پوچھا "بَيَّاكَ" کا کیا معنی ہے تو جواب ملا کہ "أضحكك" خدا تمہیں ہنسنا نصیب کرے۔

(۳) "صفائح" جمع ہے "صَفِيحَة" کی جس کے معنی ہیں لوح اور کشادہ و عریض چیز، اور "روحاء" حرم مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے اور مدینہ سے تیس یا چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ (۴) "قطوان" کوفہ کے علاقے میں ایک جگہ کا نام ہے، وہاں کے تیار کردہ کپڑوں کو "قطوانی" کہا جاتا ہے۔

تھی "صفائح الروحاء" سے گزرے اپنے اوپر دو قطوانی عبائیں ڈالے ہوئے تھے یوں تلبیہ کہہ رہے تھے "لَبَّيْكَ يَاكَرِيْمُ لَبَّيْكَ" میں حاضر ہوں اے کریم میں حاضر ہوں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰؑ حج کر چکے تو ان کے پاس جبرائیل نازل ہوئے۔ تو انہوں نے جبرائیلؑ سے پوچھا: "جبرائیلؑ! جو شخص سچی نیت اور پاکیزہ خرچے کے بغیر اس گھر کا حج کرے تو اسے کیا ملے گا؟" انہوں نے جواب دیا کہ: "مجھے تو نہیں معلوم البتہ اللہ سے پوچھ کر بتاتا ہوں"۔ جب اللہ کے حضور پہنچے تو اللہ نے ان سے پوچھا "جبرائیلؑ! موسیٰؑ نے تم سے کیا پوچھا تھا؟" انہوں نے عرض کیا: "پروردگارا! انہوں نے کہا ہے کہ "جو شخص سچی نیت اور پاک صاف مال کے بغیر اس گھر کا حج کرے تو اس کا کیا اجر ہے؟" تو خداوند عالم نے فرمایا: "ان سے جاکر کہو کہ میں اس کو اپنا حق بخش دوں گا اور اس سے اپنی مخلوق کو راضی کروں گا"۔ جب موسیٰؑ نے یہ جواب سنا تو جبرائیلؑ سے پھر پوچھا کہ: "جو اس گھر کا حج سچی نیت اور پاک و پاکیزہ مال کے ساتھ کرے گا تو اس کا کیا اجر ہوگا؟" جبرائیلؑ نے پھر اللہ تعالیٰ سے اس کا جواب مانگا تو خداوند عالم نے فرمایا: "ان سے جاکر کہو کہ میں اسے "رفیق اعلیٰ" (۳) سے ملا دوں گا اور وہ انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے زمرے میں ہوگا اور یہ کیا ہی اچھے دوست ہیں"۔

حضرت یونس بن متیٰؑ کا حج

من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ حضرت یونسؑ بھی "صفائح الروحاء" سے گزرے اور اس طرح تلبیہ کہا: "لَبَّيْكَ كَشَّافَ الْكُرَبِ الْعِظَامِ لَبَّيْكَ" حاضر ہوں اے بڑی بڑی مصیبتوں کو دور کرنے والے میں حاضر ہوں۔

حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کا حج

اسی طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے حج کیا اور اپنے تلبیہ میں کہا: "لَبَّيْكَ ابْنُ اَمَتِكَ لَبَّيْكَ" حاضر ہوں، تیری باندی کا بیٹا ہوں میں حاضر ہوں اسے بھی شیخ صدوقؒ نے روایت کیا ہے۔

حضرت سلیمان بن داؤدؑ کا حج

شیخ صدوقؒ ہی نے روایت کی ہے کہ زرارہ بن اعین کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ: "حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جن وانس اور پرندوں اور ہواؤں کے ہمراہ بیت اللہ کا حج کیا اور بیت اللہ پر قبطی چادریں چڑھائیں"۔

ابو بصیر حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "حضرت آدمؑ نے بیت اللہ کی بنیاد رکھی اور سب سے پہلے اسے بالوں کی (اُونی) چادر چڑھائی۔ اور سب سے پہلے ہی اس کا حج کیا۔ حضرت آدمؑ کے بعد پھر اس پر قوم "تُبَّع" نے چمڑے کی چادر چڑھائی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھجور کے پتوں کا غلاف تیار کر کے چڑھایا۔ جبکہ کپڑے کی چادر سب سے پہلے حضرت سلیمانؑ نے چڑھائی جو قبطی چادر کہلاتی تھی"۔

سرکار رسالتمآبؐ کا حج

سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں بیس حج کیے۔ اسی طرح آپ کی معصوم اولاد

---

(۳) "رفیق اعلیٰ" کے بارے میں ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے دعا مانگی "اَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى" یعنی مجھے رفیق اعلیٰ سے ملا دے۔ تو "رفیق اعلیٰ" انبیاء علیہم السلام کی وہ جماعت ہے جو اعلیٰ علیین میں رہتی ہے۔ "حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا" کے بارے میں ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد ذات خداوند عالم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کا رفیق ہے، یعنی ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتا ہے۔

نے بھی اپنے زمانے میں مختلف تعداد میں حج کئے۔ ان سب پر خدا کا درود و سلام ہو۔ لہذا مبارک ہو ان حجاج کرام کو جو انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی جگہوں پر جاکر ٹھہرتے ہیں اور خدا کے پسندیدہ اولیاء کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں، ان کیلئے خوشخبری ہے اور اچھے انجام کا حصول مبارک ہو۔ اور میں بھی خدا سے دست بدعا ہوں کہ مجھے ایک مرتبہ اور اس سعادت کے حصول کی توفیق عطا فرمائے۔ جیسا کہ اس سے پہلے عطا فرما چکا ہے، نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پاکیزہ اور درود و سلام کی مستحق آل کے صدقے میں۔

(اسی طرح یہ گنہگار مترجم محمد علی فاضل بھی اپنے رب کریم کی بارگاہ میں دعا کا طالب ہے خدا کرے محمدؐ و آل محمدؑ کے صدقے میں مقامات مقدسہ کی زیارت اور بیت اللہ الحرام کے حج کی توفیق عنایت فرمائے، آمین)

فرشتے مشغول طواف ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (عرش پر طواف کرنے والے فرشتوں سے مشابہت اختیار کی) جیسا کہ اسی خطبے کی نویں فصل میں بیان ہو چکا ہے کہ "کچھ فرشتے وہ ہیں جو عرش الٰہی کے طواف میں مشغول ہیں" اور ان کی تعداد کے بارے میں بھی تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے۔ البتہ ان کی صفوں کے بارے میں مرحوم شارح بحرانی ؒ فرماتے ہیں: "روایت میں ہے کہ عرش کے اطراف میں ملائکہ کی ستر ہزار صفیں ہیں جو قیام کی حالت میں ہیں اور اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے بلند آواز کے ساتھ تکبیر و تہلیل میں مشغول ہیں، ان کے پیچھے ایک لاکھ صفیں اور ہیں جن میں موجود فرشتوں نے اپنے داہنے ہاتھوں کو اپنے بائیں کندھوں پر رکھا ہوا ہے اور تسبیح خداوندی میں مشغول ہیں"۔

ایک طولانی روایت میں علی بن ابراہیم نے اسناد کے ساتھ جابر جعفی سے نقل کیا ہے وہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے اور وہ اپنے آباؤ اجداد کے ذریعہ حضرت امیر المؤمنینؑ سے بیان کرتے ہیں۔ حضرت امیر المؤمنین سلسلہ کلام کو ابتدائے تخلیق آدمؑ تک لے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا: "میں زمین میں ایک خلیفہ بنا رہا ہوں" تو انہوں نے کہا: "زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا؟" خدا نے فرمایا: "جو کچھ کہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"۔ یہ سن کر فرشتوں نے کہا: "پروردگارا! تو اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ ہی انجام دے، ہمارے پاس تو صرف وہی علم ہے جو تو نے ہمیں دیا ہے، یقیناً تو علیم و حکیم ہے" اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں عرش بریں سے پانچ سو سال کے فاصلے تک دور کر دیا۔ جب انہوں نے یہ کیفیت ملاحظہ کی تو عرش کی پناہ کے طالب ہوئے اور اس کی طرف انگلیوں سے اشارے کرنے لگے، تو اس پر رب جلیل نے ان کی طرف نظر رحمت فرمائی۔ اور ان کیلئے "بیت المعمور" بنادیا اور فرمایا اس کے گرد طواف کیا کرو اور عرش کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ صرف میرے لئے ہی منتخب ہے، چنانچہ وہ اسی کے طواف میں مشغول ہو گئے"۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ "بیت المعمور" وہ مقام ہے جہاں پر روزانہ ستر ہزار فرشتے آتے ہیں اور جو آتے ہیں وہ واپس نہیں جاتے وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں، پس اللہ نے بیت المعمور کو آسمان والوں کی توبہ کیلئے مقرر فرمادیا ہے اور خانہ کعبہ کو اہل زمین کیلئے"۔

طواف کا فلسفہ

امام غزالی کیا فرماتے ہیں؟

بیت اللہ الحرام کے طواف کے بارے میں امام غزالی "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں کہ: "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ طواف (بھی گویا ایک) نماز ہے، لہذا طواف میں اپنے دل میں ہمیشہ خدا کیلئے خوف، تعظیم، امید اور محبت کو حاضر رکھو، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ آپ ایسا طواف کر رہے ہیں جو ملائکہ مقربین کے طواف کے مشابہ ہے جو عرش الہی کے اطراف میں ہیں اور اس کے طواف میں مشغول ہیں۔ اور یہ گمان نہ رکھیں کہ بیت اللہ کے گرد جسم کا طواف مقصود ہے بلکہ آپ کا دل بیت کے رب کا طواف کر رہا ہے جس کی ابتدا بھی اسی کے ذکر سے ہے اور انتہا بھی اسی کے ذکر پر ہے۔ جس طرح بیت اللہ سے طواف کا آغاز ہوتا ہے اسی طرح اس پر اختتام بھی ہوتا ہے"۔ پھر کہتے ہیں: "یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ شرف کا حامل وہی طواف ہوتا ہے جو دل کا طواف کہلاتا ہے اور وہ قلبی طواف رب کبریا کے حضور میں ہوتا ہے، بیت اللہ تو اس عالم ملک میں اس حضوری ملک کیلئے ایک ظاہری مثال ہے جو حضوری ملک ان ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اور وہی عالم ملکوت کہلاتا ہے جس طرح یہ جسم عالم شہود میں دل کیلئے ایک ظاہری مثال ہوتا ہے اور دل کو ان ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ وہ عالم غیب میں ہوتا ہے، یہ عالم ملک و شہود عالم غیب و ملکوت کیلئے سیڑھی کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس شخص کے واسطے جس کیلئے اللہ نے اس کا دروازہ کھول دیا ہو۔

اسی موازنے کی طرف یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ آسمانوں میں "بیت المعمور" زمین پر موجود "خانہ کعبہ" کے مقابل میں ہے، جس طرح خانہ کعبہ کا طواف انسان کرتے ہیں اسی طرح بیت المعمور کے طواف میں ملائکہ مشغول ہیں، چونکہ اکثر مخلوق کی رسائی بیت المعمور کے طواف سے قاصر ہے لہذا اسے مقام و مکان کے مطابق اس کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ "جو شخص کسی قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی میں شمار ہوتا ہے" اور جو شخص ایسا کرنے پر قادر ہو جاتا ہے تو معاملہ برعکس ہو جاتا ہے، وہ یوں کہ خود خانہ کعبہ اس کی زیارت کرتا ہے اور اس کے گرد طواف کرتا ہے"۔

<u>قول مؤلف</u>: یہ حقیقی طواف کہ جس کی تصویر کشی امام غزالی نے کی ہے صرف اولیاء اللہ یعنی انبیاء اور معصوم ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے کہ عالم معانی میں خود خانہ کعبہ جن کا طواف کرتا ہے اور ان کے وجود سے کسب فیض کرتا ہے اور اسی چیز کی طرف فرزدق شاعر نے اپنے "قصیدہ میمیہ" میں اشارہ کیا ہے جس میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی مدح و ثناء کی گئی ہے جبکہ ہشام بن عبد الملک بن مروان نے امامؑ کی ذات کے بارے میں تجاہل عارفانہ سے کام لیا تھا اور حضرتؑ کی عظمت اس کیلئے سوہان روح بن گئی تھی۔ فرزدق نے امامؑ کا تعارف اس طرح کرایا:

هٰذَا الَّذِيْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْاَتَهٗ ... وَ الْبَيْتُ يَعْرِفُهٗ وَ الْحِلُّ وَ الْحَرَمُ

يَكَادُ يُمْسِكُهٗ عِرْفَانُ رَاحَتِهٖ ... رُكْنُ الْحَطِيْمِ اِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ

لَوْ يَعْلَمُ الرُّكْنُ مَنْ قَدْ جَاءَ يَلْثِمُهٗ ... لَخَرَّ يَلْثِمُ مِنْهُ مَا وَطِیَ الْقَدَمُ

یہ وہ عظیم ہستی ہیں جن کے قدموں سے سرزمین بطحاء واقف ہے، بیت اللہ اسے پہچانتا ہے اور حل و حرم کی سرزمین اسے جانتی ہے۔ جب وہ رکن حطیم کے بوسے کیلئے آتا ہے تو خود ہی رکن اس کی معروف ہتھیلیوں کے بوسے کیلئے اس کو روک لیتا ہے۔ جس وقت رکن یمانی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے یہ شخصیت بوسہ دینے کیلئے آئی ہے تو وہ اس کے پاؤں پر گر کر اس کی خاک قدم کے بوسے لینے لگ جاتا ہے۔

حج کے فضائل_اور_حجاج کا ثواب

چونکہ عام انسانی فطرت کاروبار میں منافع کی خواہاں ہوتی ہے اور نفع اندوزی سے اسے محبت ہوتی ہے، لہذا امیر المؤمنین حجاج کرام کو اس کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (وہ اپنی عبادت کی تجارت گاہ میں منفعتوں کو سمیٹتے ہیں) اس بات کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ حجاج کا اس مقدس مقام پر کھڑا ہونا اور عبادت بجالانا آخرت کیلئے تجارت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ہر حالت میں فائدے اور منافع کی حامل ہے۔ لہذا عقلمند کے شایان شان نہیں ہے کہ ایسے نفع بخش مواقع کو ہاتھ سے جانے دے۔

چنانچہ من لا یحضرہ الفقیہ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ فرماتے ہیں: ”حج اور عمرہ آخرت کی منڈیوں میں سے دو منڈیاں ہیں، جن کا تعلق خدا کے مہمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر خدا کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ حج اور عمرہ کے بجالانے والے کو زندہ رکھے تو پھر اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے، اور اگر اسے موت دینا چاہے تو پھر اسے سیدھا بہشت میں بھیج دیتا ہے“۔ اس عبارت میں حسن استعارہ ملاحظہ ہو، حجاج کو تاجروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور عبادت کو مال تجارت کے ساتھ۔ تجارت گاہ کا ذکر ”استعارہ تخییلیہ“ ہے اور منافع کا ذکر ”ترشیح“ ہے، اور منافع سے مراد ثواب جمیل اور اجر جزیل ہے جو حج کرنے والوں، عمرہ بجالانے والوں، خدا کے گھر کیلئے سفر کرنے والوں اور طواف کرنے والوں کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ”کعبہ کے اطراف میں ایک سو بیس رحمتیں ہیں، جن میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں، چالیس نماز پڑھنے والوں اور بیس اس کی طرف نگاہ کرنے والوں کیلئے ہیں“۔ امام جعفر صادقؑ ہی فرماتے ہیں کہ: ”جو شخص خانہ کعبہ کی طرف نگاہ کرے اور ہمارے حق اور ہماری حرمت کو بھی اسی طرح پہچانتا ہو جس طرح اس کے حق و حرمت کو پہچانتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور اسے دنیا و آخرت کے رنج و غم سے بچا لیتا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: ”جو بھی شخص بلند آواز کے ساتھ تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں اور بائیں اطراف سے بھی زمین کے آخر تک بلند آواز اٹھتی ہے اور اسے دو فرشتے کہتے ہیں: ”بندہ خدا! تجھے خوشخبری ہو اور خدا اپنے بندے کو بہشت کی خوشخبری ہی دیتا ہے۔ اور جو شخص احرام کی حالت میں ستر مرتبہ تلبیہ کہتا ہے اور اس پر اس کا ایمان بھی ہوتا ہے اور اجر ملنے کا یقین بھی تو اللہ تعالیٰ ایک ہزار ملائکہ کو اس بات پر گواہ ٹھہراتا ہے کہ اب نہ تو اس کا تعلق جہنم سے رہا ہے اور نہ ہی نفاق سے۔ جو شخص حرم میں پہنچ جاتا ہے اور غسل کر کے جوتے اپنے ہاتھ میں اٹھا کر ننگے پاؤں حرم کے اندر داخل ہوتا ہے اور اس سے اس کا قصد خدا کیلئے انکساری

ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ایک لاکھ گناہ مٹا دیتا ہے، ایک لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے، اس کیلئے ایک لاکھ درجات مقرر کر دیتا ہے اور ایک لاکھ حاجتیں پوری فرماتا ہے۔ جو شخص سکون ووقار کے ساتھ مکہ میں داخل ہوتا ہے اور اس کے دل میں کسی قسم کا تکبر اور غرور نہیں ہوتا تو اللہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے، جو شخص مسجد الحرام مین ننگے پاؤں لیکن سکون ووقار اور خشوع کے ساتھ داخل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔ اور جو شخص کعبہ کے حق کو پہچانتے ہوئے اس کی طرف نگاہ کرتا ہے اللہ اسے بخش دیتا ہے اور اس کی تمام ضروریات کی خود کفایت کرتا ہے"۔

وضواور حج کی فضیلت کے بارے میں ایک تفصیلی حدیث

حسن بن محبوب، علی بن رئاب سے اور وہ محمد بن قیس سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مکہ معظمہ میں لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سنا کہ آپؑ فرما رہے تھے: "حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھائی، پھر آپؐ طلوع آفتاب تک ان سے باتیں کرتے رہے، جب سورج طلوع ہو گیا تو لوگ یکے بعد دیگرے اٹھ کر جانے لگے یہاں تک کہ صرف دو آدمی رہ گئے، ایک انصاری اور ایک بنی ثقیف کا شخص۔ حضرتؐ نے ان دونوں سے فرمایا: "مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں مجھ سے مسئلہ پوچھنا چاہتے ہو! اگر کہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" انہوں نے کہا "یا رسول اللہ! اگر آپؐ خود ہی بتادیں تو اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے، اس طرح سے تو اندھے کو بھی معلوم ہو جائے گا اور شک کے سارے پردے ہٹ جائیں گے اور ایمان میں مزید پختگی ہو جائے گی" آنحضرتؐ نے فرمایا "اے انصار کے بھائی تمہارا تعلق ایسی قوم سے ہے جو دوسروں کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتی ہے اور تمہارا تعلق شہری آبادی سے ہے جبکہ اس ثقفی کا تعلق خانہ بدوش قبائل سے ہے، تو کیا تم مسئلے کے بارے میں بھی اس بات کو ترجیح دو گے کہ پہلے اس کا مسئلہ حل کیا جائے؟" اس نے کہا "ضرور یا رسول اللہ" حضورؐ نے فرمایا: "اے برادر ثقیف! تم وضو، نماز اور ان سے متعلق چیزوں کے بارے میں مسئلہ پوچھنے آئے ہو نا؟ تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ:

وضو کی فضیلت

جب تم وضو کیلئے پانی میں ہاتھ ڈال کر کہتے ہو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو تمہارے وہ تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں جو تیرے ہاتھوں نے کئے ہوتے ہیں۔ اور جب اپنا منہ دھوتے ہو تو اس وقت تمہاری آنکھوں سے انجام شدہ اور منہ سے بولے ہوئے گناہ مٹ جاتے ہیں، جب اپنے ہاتھوں کو دھوتے ہو تو تمہارے دائیں اور بائیں ہاتھوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ جب اپنے سر اور پاؤں کا مسح کرتے ہو تو پاؤں کے ساتھ چل کر انجام دیئے جانے والے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ یہ تو ہوا تمہارے وضو کا ثواب۔

رہی بات تمہاری نماز کی تو جب تم نماز کیلئے قبلہ رو کھڑے ہوتے ہو، حمد وسورہ کو پڑھ لیتے ہو، پھر رکوع کو مکمل کرتے ہو، سجدوں کو ادا کرتے ہو اور تشہد اور سلام کہہ کر نماز سے فارغ ہو جاتے ہو تو تمہارے تمام وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو اس سے پہلی نماز سے اس وقت تک تم نے انجام دیئے ہوتے ہیں، تو یہ ہے تمہاری نماز اور وضو کا ثواب"۔

حج کا ثواب اور فضیلت

پھر آپؐ نے انصاری کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "تم یہاں اس لئے آئے ہو کہ مجھ سے حج اور عمرہ اور ان دونوں سے متعلق ثواب کے بارے میں سوال کرو۔ تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب تم حج کے راستے کو

اختیار کرتے ہو اور اپنی سواری پر سوار ہوتے ہو ابھی تم اپنا ایک پاؤں اس پر نہیں نہیں رکھ پاتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر ایک پاؤں کی وجہ سے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔ جب احرام باندھ کر تلبیہ کہتے ہو تو تمہارے لئے دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں اور دس برائیاں مٹادی جاتی ہیں، جب بیت اللہ کے ساتوں چکر مکمل کر کے طواف کر لیتے ہو تو اس طرح سے تمہاری طرف سے تمہارے رب کے پاس ایک عہد کی تکمیل ہو جاتی ہے اور خدا کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ تمہیں اس کے بعد عذاب دے۔ جب مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز ادا کرتے ہو تو خداوند عالم ان دو رکعتوں کے بدلے میں تمہارے لئے دو ہزار مقبول رکعتوں کا ثواب لکھ دیتا ہے، جب صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہو اور سات مرتبہ اسے مکمل کرتے ہو تو خدا کے نزدیک تمہارا اجر اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جو اپنے گھر سے پیدل چل کر حج کرے۔ اور اس کا ثواب ایسے ہے جیسے کوئی شخص ستر غلام آزاد کرے۔ جب غروب آفتاب تک وقوفِ عرفات کرتے ہو تو اگر تمہارے گناہ ریت کے ٹیلوں اور سمندر کی جھاگ کے برابر بھی ہوں گے تو خداوہ بھی بخش دے گا، جب رمی جمرات کرتے (شیطانوں کو پتھر مارتے) ہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے مستقبل کیلئے ہر پتھر کے بدلے دس نیکیاں لکھ دیتا ہے۔ جب سر منڈاتے ہو تو سر پر موجود ہر بال کے بدلے مستقبل کیلئے ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔ جب طواف زیارت کیلئے سات چکر لگاتے ہو اور پھر مقام ابراہیمؑ کے پاس دو رکعت نمازِ طواف بجالاتے ہو تو ایک کریم فرشتہ تمہارے کندھوں پر ہاتھ مار کر کہتا ہے "تمہارے گزشتہ تمام گناہ معاف ہو گئے اب سے لے کر آئندہ ایک سو بیس (۱) دنوں تک اپنے اعمال کی تجدید کرو"۔

حج کے فضائل کے بارے میں اور بھی کثیر تعداد میں احادیث موجود ہیں، جنہیں شیخ صدوقؒ نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ میں حج کے باب میں جمع کیا ہے اور میں نے بقدر کفایت وہاں سے یہ چند احادیث لی ہیں۔

خانہ کعبہ مقام امن ہے

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام خانہ کعبہ کے اوصاف و فضائل میں فرماتے ہیں کہ (اور اس کی وعدہ گاہ مغفرت میں بڑھتے ہیں) اور حج کے مبارک و مسعود موقعہ پر ایک دوسرے پر خدا کی طرف سے عطا کردہ مغفرت کے وعدے کی طرف پہنچنے کیلئے ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ (اللہ سبحانہ نے اس گھر کو اسلام کا نشان بنایا ہے) یہ گھر دین اسلام کیلئے اس لئے نشان بنایا گیا ہے، چونکہ دین اسلام رضائے الٰہی کے حصول کا راستہ ہے اور جس طرح مسافر اور راہی نصب شدہ جھنڈوں اور بلند و بالا میناروں کے ذریعہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اسی طرح خانہ کعبہ کے ذریعے دین اسلام کے مقرر کردہ اہداف تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اللہ نے اس گھر کو (پناہ چاہنے والوں کیلئے حرم) بنایا ہے۔ اور یہ گھر پناہ لینے والوں کیلئے جائے امن اور ان کیلئے حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا اس میں نہ تو کسی کو کوئی ایذا پہنچائی جا سکتی ہے اور نہ ہی وہاں سے کسی کو نکالا جا سکتا ہے۔

من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ: "روایات میں ہے کہ جو شخص کسی جرم کا ارتکاب کر کے حرم کعبہ کی پناہ لیتا ہے تو وہاں پر نہ تو اس پر حد جاری کی جا سکتی ہے، نہ ہی اسے کھانا اور پانی دیا جائے گا اور نہ ہی کوئی اذیت پہنچائی جائے گی۔ جب تک کہ وہ از خود حرم سے

---

(۱) من لا یحضرہ الفقیہ میں ہے کہ حاجی کیلئے سر منڈانے کے دن سے چار مہینے تک کے گناہ نہیں لکھے جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کیلئے چار حرمت والے مہینوں میں زمین میں چلنا پھرنا مباح قرار دیا ہے اور فرمایا ہے "فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ" "اے مشرکو! زمین میں چار مہینے تک آزادی سے سیر کرو۔ اسی لئے مؤمن کے گناہ بھی بخش دیئے جاتے ہیں۔

باہر نہ آجائے، جب حرم سے باہر آجائے گا تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ ہاں البتہ اگر حرم میں رہ کر ایسا کوئی جرم کرے جو حد کے اجرا کا موجب ہو تو پھر اس کا مؤاخذہ کیا جائے گا، کیونکہ اس نے حرم کی حرمت کی پاسداری نہیں کی"۔ اسی کتاب ہی میں ہے کہ عبداللہ بن سنان نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس آیت "مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ آمِنًا" (آل عمران / ۹۷) جو اس میں داخل ہوا وہ امن میں آ گیا۔ کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا: "جو شخص خانہ کعبہ کی پناہ لے کر اس کے حرم میں آجائے تو وہ خدا کی ناراضگی سے بچ جاتا ہے۔ اسی طرح جو وحشی جانور یا کوئی پرندہ اس کے اندر آجاتا ہے تو وہ بھی امن میں آجاتا ہے، لہٰذا نہ تو اسے ہنکا بھگا کر باہر نکالا جا سکتا ہے اور نہ ہی اذیت دی جا سکتی ہے، جب تک خود بخود حرم سے باہر نہ نکل جائے"۔ کافی میں بھی عیاشی سے اسی قسم کی حدیث منقول ہے۔ امام جعفر صادقؑ ہی فرماتے ہیں کہ: "جب کوئی بندہ حرم سے باہر کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر بھاگ کر حرم کی پناہ لیتا ہے تو پھر کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کا مؤاخذہ کرے۔ ہاں البتہ اس سے خرید و فروخت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اسے کھانا پانی دیا جائے گا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی اور بات کی جائے گی۔ تو جب اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا تو پھر ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں سے باہر آجائے تو پھر اس کو پکڑا جائے گا اور اس کا مؤاخذہ کیا جائے گا، اور اگر حرم میں کسی جرم کا ارتکاب کرے گا تو پھر اس پر حرم ہی میں حد جاری کی جائے گی"۔ البتہ کافی میں اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ: "کیونکہ اس نے حرم کی حرمت کی پاسداری نہیں کی"۔ کافی میں ہے کہ "سماعہ" نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا کہ: "اس کے پاس میرا کچھ مال تھا اور وہ مجھ سے لے کر غائب ہو گیا اور ایک عرصے تک وہ غائب ہی رہا، ایک دفعہ اچانک میں نے اسے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھ لیا، تو کیا میں اس سے اپنے مال کا تقاضا کر سکتا ہوں؟" تو امامؑ نے فرمایا: "نہ تو اس پر سلام کرو اور نہ ہی اسے ڈراؤ دھمکاؤ، جب از خود حرم سے باہر آجائے تو پھر اس کا تقاضا کرو"۔

خانہ کعبہ کو تباہ کرنے والوں کا انجام

چونکہ کعبہ، حرم الٰہی ہے اس لئے جس کسی ظالم اور جابر انسان نے اس کے بارے میں بری نیت کی، اللہ نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ جیسا کہ اصحاب فیل نے اس کی تباہی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان پر پرندوں کے لشکر بھیج کر انہیں تباہ کر ڈالا، پرندوں نے ان کو کنکریاں مار کر ایسے تباہ کیا جیسے چبایا ہوا بھوسہ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو قرآن مقدس نے "سورہ فیل" میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح "تُبّع یمن" (یمن کے بادشاہ کا لقب "تبع" ہوتا تھا جس کی جمع "تبابعہ" ہے) نے اس کے بارے میں غلط سوچ سوچی وہ یوں کہ اس نے وہاں کے لوگوں کو قتل اور ان کی اولاد کو قیدی بنانے اور پھر خانہ کعبہ کے انہدام کا قصد کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دونوں آنکھیں بہہ کر اس کے رخساروں پر آگئیں، اس نے اس کا سبب پوچھا تو لوگوں نے کہا: "اس کا سبب صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خانہ کعبہ کے بارے میں جو بری سوچ سوچی ہے یہ اس کا ردعمل ہے۔ اس لئے کہ یہ شہر اللہ کا حرم ہے، یہ گھر اللہ کا گھر ہے اور مکہ میں رہنے والے ابراہیم خلیلؑ کی اولاد ہیں" اس نے یہ سن کر کہا: "تم سچ کہتے ہو، تو پھر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟" انہوں نے کہا: "ہاں! یہ کہ آپ اپنے دل سے وہ بات نکال دیجئے جس کا قصد کئے ہوئے ہیں" چنانچہ اس نے وہ بات بالکل دل سے نکال

دی اور نیت صحیح کر لی تو اس کی آنکھیں تندرست ہو گئیں اور اپنی جگہ پر واپس آگئیں۔ اس پر اس نے ان لوگوں کو بلایا جنہوں نے اسے بیت اللہ کے ڈھانے اور سکان مکہ کے قتل و قید کا مشورہ دیا تھا، ان سب لوگوں کو بلا کر تہہ تیغ کرادیا اور اس کے بعد خانہ کعبہ پر چمڑے کا غلاف چڑھایا اور تیس دن تک وہاں کے لوگوں کو جی بھر کر کھانا کھلایا جبکہ پورے تیس دن تک جانور ذبح کئے جاتے رہے، حتی کہ جانوروں کیلئے بھی غذا کے بڑے بڑے برتن بھر کر پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچائے جاتے تھے، چارہ کھانے والے جانوروں کیلئے ہر طرف چارہ پھیلادیا گیا اس کے بعد وہ مدینہ آگیا اور وہاں پر یمن کے ایک قبیلے غسان کے لوگوں کو وہاں پر ہمیشہ کیلئے ٹھہرایا جو انصار کہلاتے ہیں

ایک سوال اور جواب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس انجام سے اصحاب فیل اور تبّع دوچار ہوئے اس سے حجاج ملعون دوچار کیوں نہیں ہوا جبکہ اس نے بیت اللہ کو کافی حد تک نقصان بھی پہنچایا؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ حجاج کا اصل مقصد خانہ کعبہ کو منہدم کرنا نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد عبد اللہ بن زبیر تھا، جو ناحق مکہ میں پناہ لئے ہوئے تھا، اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کیلئے ظاہر کردیا کہ اس نے اسے پناہ نہیں دی ہے اور ابن زبیر ہی خانہ کعبہ کے نقصان کا سبب بنا۔ چنانچہ من لا یحضرہ الفقیہ میں اسی کی تصریح کی گئی ہے۔

استطاعت کیا ہے؟

حضرت امیر المؤمنینؑ حج کے وجوب کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں (اس کا حج فرض اور اس کے حق کی ادائیگی) اور معرفت اور حرمت کے لحاظ کو (واجب کیا ہے، اور اس کی رہنوردی تم پر فرض کردی ہے) تاکہ اس سے کسب فیض اور حصول کمال کیا جائے۔ جیسا کہ شیخ صدوق ؒ اسناد کے ساتھ حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "حج اور عمرہ کرنے والے وفد کی صورت میں خدا کے مہمان ہوتے ہیں، اگر وہ اس سے سوال کریں تو انہیں عطا کرتا ہے، اگر دعا مانگیں تو قبول کرتا ہے، اگر کسی کی شفاعت کریں تو مان لیتا ہے، اگر خاموش رہیں تو از خود ابتدا کرتا ہے، اگر اس کی راہ میں کسی کو ایک درہم دیں تو اس کے عوض میں اسے لاکھ درہم دیتا ہے"۔

(چنانچہ اللہ نے فرمایا "اللہ کا واجب الادا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا حج کریں، جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو، اور جس نے کفر کیا تو جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے") مفسر طبرسیؒ کہتے ہیں کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ "اللہ کا واجب الادا حق اس پر ہے جو لوگوں میں سے بیت اللہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، بیت اللہ کا حج کرے" یعنی وہاں تک رسائی کیلئے جسمانی اور مالی استطاعت رکھتا ہو،

استطاعت کے بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد زاد سفر اور سواری ہے اور یہ ابن عباس اور ابن عمر کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس بھی ممکن ذریعے سے مکہ معظمہ تک پہنچا جاسکے۔ اور یہ قول حسن (شاید حسن بصری) کا ہے۔

جبکہ ہمارے ائمہ اطہار علیہم السلام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد زادِ راہ، سواری، ان لوگوں کے اخراجات کا ہونا جن کے

نان و نفقہ یعنی خرچ اخراجات ضروری ہوتے ہیں اور واپسی تک ایسی چیز کا ہونا جو اخراجات کی کفایت کرتی ہے مثلاً مال، جائداد، ملازمت یا کاروبار وغیرہ نیز جسمانی صحت و سلامتی اور سفر کی رکاوٹوں کا نہ ہونا اور چلنے کی طاقت کا ہونا ہے۔

قول مصنف

استطاعت کیلئے زاد سفر اور سواری کی شرط، ان لوگوں کیلئے ہے جن کا دور دراز کا سفر ہوتا ہے، اور اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ لیکن جو قریب کے لوگ ہیں جنہیں سفر کیلئے سواری کی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً مکہ مکرمہ اور اس کے گردونواح کے لوگ ہیں کہ جنہیں سفر طے کرنے کیلئے سواری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ اس صورت میں سفر طے کرنا مشکل نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں عام طور پر سواری کی شرط کی ضرورت نہیں ہے۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو دور دراز کا سفر پیدل طے کر سکتا ہے اور اس کیلئے کسی قسم کی دشواری بھی نہیں ہوتی تو کیا ایسے شخص کیلئے حج کے واجب ہونے کیلئے سواری کی شرط ضروری ہے یا نہیں؟ تو کتاب "المنتہیٰ" کے مطابق ضروری ہے کہ اس کے پاس زاد اور سواری ہو تو حج واجب ہوگا ورنہ نہیں، چنانچہ ہمارے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زاد سفر اور سواری دونوں حج کے وجوب کیلئے شرط ہیں۔ کسی کے پاس اگر یہ دونوں نہیں ہیں یا ان میں سے کوئی ایک نہیں ہے اور سفر بھی دور کا ہے تو اس پر حج واجب نہیں ہوگا۔ خواہ وہ پیدل بھی چل سکتا ہو۔ جبکہ بعض متاخرین نے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے مثلاً صاحب مدارک اور ان جیسے دوسرے علماء کہتے ہیں کہ بعض روایات کی رو سے یہ دونوں چیزیں شرط نہیں ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ سفر حج سے واپس آنے کے بعد روزگار کا ایسا سلسلہ موجود ہو جس سے اخراجات بقدر کفایت حاصل ہو سکیں تو اس بارے میں شیخانؒ (صدوق اور طوسی) ابو صالح ابن براج اور ابن حمزہ علیہم الرحمۃ یہ شرط لازمی سمجھتے ہیں اور اس کو شیخ صدوق نے کتاب "من لا یحضرہ الفقیہ" میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو ربیع شامی نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس آیت "وَلِلّٰہِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً" کے بارے میں سوال کیا تو امامؑ نے ان سے پوچھا کہ "لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "لوگ استطاعت سے مراد زاد سفر اور سواری لیتے ہیں" اسی چیز کے بارے میں امام محمد باقرؑ سے پوچھا گیا تو امامؑ نے فرمایا: "پھر تو لوگ ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ اگر کسی کے پاس زاد سفر اور سواری بھی ہو اور اس کے پسماندگان کیلئے اس قدر خرچ اخراجات بھی ہوں جو اس کی واپسی تک انہیں لوگوں سے سوال کرنے سے بے نیاز کئے رہیں لیکن واپسی کے بعد کیلئے اس کے پاس ذرائع روزگار نہ ہوں تو وہ ان سے بچا کھچا چھین لے گا اور خود بے روزگار رہے گا، اور اس طرح سے تو ان کی حالت تباہ ہو جائے گی" اس پر آپؑ سے پوچھا گیا تو پھر کیا صورت ہونی چاہئے؟ تو انہوں نے فرمایا: "اس کے پاس اس قدر مال ہو کہ اس سے حج بھی کر سکے اور واپسی تک اس کے اہل و عیال کے پاس اس قدر اخراجات ہوں کہ ان سے بچ رہیں اور کاروبار زندگی آئندہ کیلئے بھی چلتا رہے" پھر امامؑ نے پوچھا: "آیا اللہ نے زکوٰۃ فرض نہیں کی ہے؟ ضرور کی ہے لیکن اس پر جس کے پاس دو سو درہم ہوں تو......"۔ جبکہ ہمارے اکثر علماء مثلاً سید مرتضیٰؒ، ابن ادریسؒ، ابن ابی عقیلؒ اور ابن جنیدؒ اس شرط کے قائل نہیں ہیں۔ اور وہ آیت کے عموم اور صحیح روایات سے استدلال کرتے ہیں اور ابو ربیع مذکور کی روایت کی سند کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی سند میں مجہول راوی بھی ہیں جن میں سے ایک خالد بن جریر ہے جس کی کسی نے توثیق نہیں کی، نہ ہی کسی نے قابل توجہ حد تک اس کی تعریف کی ہے۔

کفر کیا ہوتا ہے؟

خداوند عالم نے اسی آیت میں فرمایا ہے "وَمَنْ كَفَرَ......" اور جس نے کفر کیا....... مفسر طبرسیؒ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ "جو شخص حج کے فریضہ ہونے کا انکار کرتا ہے اور اسے واجب نہیں جانتا" ابن عباس اور حسن کا موقف یہی ہے۔ "فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ" تو جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے۔ بایں معنی کہ اس نے لوگوں پر عبادت کا فریضہ اس لئے عائد نہیں کیا کہ اسے اس کی ضرورت تھی بلکہ اس سے خود لوگوں کا فائدہ اور ان کی مصلحت مقصود تھی، ایک اور ضعیف روایت کے مطابق اس سے مراد "یہودی" ہیں، کیونکہ جب قرآن مجید کی یہ آیت "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" (آل عمران / ۸۵) اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ نازل ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ "ہم بھی مسلمان ہیں" ان کے اس ادعا پر انہیں حج کی بجاآوری کا حکم ملا تو انہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ تو اس بنا پر اس آیت کے معنی ہوں گے "مَنْ كَفَرَ مَنْ تَرَكَ الْحَجَّ مِنْ هٰؤُلَاءِ فَهُوَ كَافِرٌ" یعنی ان میں سے جو شخص حج کو ترک کر کے اس کا انکار کرے گا تو وہ کافر ہے۔

قول مصنفؒ جس طرح قرآن مجید میں تارک حج پر کافر کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح بہت سی روایات میں بھی اسے کافر کہا گیا ہے۔ اور اس کی تفسیر "حج کے وجوب کا انکار کرنے والا" سے کی گئی ہے۔ جیسا کہ مفسر طبرسیؒ اور ان کے پیروکاروں کا نظریہ ہے۔ جبکہ ایسا معنی کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اور یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ "کفر" کا صرف ایک ہی معنی سمجھ لیا گیا ہے اور بس، اور وہ ہے فقہاء کے درمیان اس کا رائج معروف معنی جو کفر کے حامل کی نجاست کا موجب اور جہنم میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہوتا ہے، جبکہ اس کے ایک سے زائد معانی ہیں۔

اس کی وضاحت کیلئے قدرے تفصیل کی ضرورت ہوگی۔ اور وہ یہ کہ "کفر" کا لغوی معنی ہے "چھپانا" اسی لحاظ سے رات کو "کافر" کہتے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں کو چھپا دیتی ہے جنہیں دن ظاہر کرتا ہے۔ اور اس لفظ کا اطلاق "کافر" پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ان معارف حقہ، انوار الٰہیہ اور جلی و خفی نعمتوں کو چھپاتا ہے جو اللہ نے اسے عطا کی ہوتی ہیں، جبکہ فقہاء کی زبان میں کافر اس شخص کو کہتے ہیں جو رب کا یا ان چیزوں میں سے کسی کا انکار کرے جن کا تعلق ضروریات دین اسلام سے ہے۔

رہی قرآن مجید اور روایات کی بات تو بعض اوقات اس کا اطلاق بعض واجبات کے تارک پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ ان کا انکار نہ بھی کرے۔ جیسا کہ بعض محرمات کے مرتکبین کو بھی کافر کہا گیا ہے، اور کلینیؒ کی وہ روایت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے، کہ اس کا صرف ایک معروف معنی ہی نہیں ہے بلکہ بہت سے معانی ہیں، جو انہوں نے کافی میں درج کی ہے۔ چنانچہ کافی میں علی بن ابراہیم سے انہوں نے بکر بن صالح سے انہوں نے قاسم بن یزید سے انہوں نے ابو عمرو اور زبیری اور انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "کتاب خدا میں بیان ہونے والے کفر کے پانچ معانی ہیں: ۱۔ خدا کی امر کردہ چیزوں سے کفر ۲۔ کفر برائت ۳۔ کفر نعمت اور ۴۔ کفر جحود یعنی انکار۔ کہ اس کی دو قسمیں ہیں؛

کفر جحود یعنی انکار: اور وہ انکار یا تو ۱۔ خدا کی ربوبیت کا ہوتا ہے، وہ یوں کہ کوئی یہ کہے: "نہ کوئی خدا ہے نہ جنت ہے نہ دوزخ

ہے دغیرہ" اوراس بات کے قائل زندیقوں کے دونوں گروہ ہیں، خدا ان پر لعنت کرے، اور انہیں "دہریہ" بھی کہا جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ "وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلاَّ الدَّهْرُ" (جاثیہ / ۲۴) زمانہ ہی ہم کو مارتا (اور جلاتا) ہے۔

۲۔ کفر یعنی جحود معرفت: کسی بات کی معرفت رکھتے ہوئے اور اس کا حق الیقین کی حد تک علم رکھتے ہوئے انکار کرنا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا" (نمل / ۱۴) اور باوجودیکہ ان کے دل کو اس کا یقین تھا مگر پھر بھی ان لوگوں نے سرکشی اور تکبر سے ان کو نہ مانا۔ اسی طرح فرماتا ہے: "وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَاءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ" (بقرہ / ۸۹) اور اس سے پہلے اس کی امید پر کافروں پر فتح یاب ہونے کی دعائیں مانگتے تھے، پس جب ان کے پاس وہ چیز آگئی جسے پہچانتے تھے تو لگے انکار کرنے، پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔ تو کفر جحود کے دونوں معانی کے لحاظ سے اس کی تفسیر ہے۔

۳۔ کفر نعمت: جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کی زبانی فرماتا ہے: "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَفَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ" (نمل / ۴۰) یہ تو محض میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے تاکہ وہ میرا امتحان لے کہ میں اس پر شکر کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنی ہی بھلائی کیلئے شکر کرتا ہے۔ اور جو شخص ناشکری کرتا ہے تو یاد رکھے میرا پروردگار یقیناً بے پروا اور سخی ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" (ابراہیم / ۷) اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر نعمت کا اضافہ کروں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یقیناً میرا عذاب سخت ہے۔ یا فرماتا ہے "فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْالِيْ وَلَاتَكْفُرُوْنِ" (بقرہ / ۱۵۲) پس تم مجھے یاد رکھو تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور ناشکری نہ کرو۔

۴۔ خدا کی امر کردہ چیزوں سے کفر: جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَاِذْ اَخَذْنَامِيْثَاقَكُمْ لَاتَسْفِكُوْنَ دِمَآئَكُمْ وَلاَ تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسَارٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَاجَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ......" (بقرہ / ۸۴۔۸۵) اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم (تمہارے بزرگوں) سے عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور نہ اپنے لوگوں کو شہر بدر کرنا تو تم (تمہارے بزرگوں) نے اقرار کیا تھا اور تم بھی اس کی گواہی دیتے ہو کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ پھر وہی لوگ تو تم ہو کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک گروہ کے ناحق اور زبردستی حمایتی بن کر دوسروں کو شہر بدر کرتے ہو اور لطف تو یہ ہے کہ اگر وہی لوگ قیدی بن کر تمہارے پاس مدد مانگنے آئیں تو ان کو تاوان دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا، تو پھر کیا تم کتاب خدا کی بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں............ یہاں پر ان لوگوں کے اس کفر کو بیان کیا گیا ہے کہ جو انہوں نے خدا کی امر کردہ چیزوں کے ساتھ اختیار کیا اور انہیں ایمان کی طرف نسبت بھی دی لیکن ان کا یہ ایمان اس کے نزدیک قابل قبول بھی نہیں اور نہ ہی انہیں کوئی فائدہ پہنچائے گا۔ اسی لئے فرماتا ہے: "فَمَاجَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ

مِنكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" (بقرہ/۸۵) پس جو لوگ تم میں سے ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے غافل نہیں ہے۔

۵۔ کفر برائت۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی بیان ہوا ہے کہ: "كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ" (ممتحنہ/۶۰) ہم تم سے بری اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کی دشمنی اور بغض قائم رہے گا۔ جب تک کہ تم خدائے وحدہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ یہاں پر "كَفَرْنَا" کے معنی "تَبَرَّئْنَا" کے ہیں یعنی ہم نے تم سے برائت اختیار کرلی ہے۔ مذکورہ بالا صراحت کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفر کا اطلاق بعض فرائض کے ترک کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بعض ممنوعہ چیزوں کے ارتکاب پر بھی ہوتا ہے جبکہ یہ ارتکاب جحود و انکار کی بنا پر بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے "کفر جحودی" کو خدا کی امر کردہ چیزوں کے ترک کردینے کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

قول مصنفؒ: جب یہ ساری باتیں اچھی طرح واضح ہو گئیں تو پھر یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ: "استطاعت رکھنے کے باوجود حج کا تارک حقیقی معنوں میں کافر ہے خواہ اس پر نجاست کا حکم نہ بھی لگایا جائے" کیونکہ نجاست کا حکم خاص ہے "کفر جحودی" کے ساتھ اور اس پر آیت شریفہ کے ظاہر کی دلالت کے علاوہ وہ روایت بھی ایک دلیل ہے جسے شیخ صدوقؒ نے من لا یحضرہ الفقیہ کے آخر میں "باب النوادر" کے ضمن میں درج کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ: آنحضرتؐ حضرت علیؑ کو وصیت کے طور پر فرماتے ہیں: "یا علیؑ! استطاعت رکھنے کے باوجود حج کا تارک، کافر ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے" وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ..... "یا علیؑ! جو شخص حج کے بارے میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہے حتی کہ اسے موت آجائے تو خداوند عالم اسے یہودی یا نصرانی بنا کر محشور کرے گا"۔ اسی طرح اسی باب میں ایک روایت اور بھی ہے کہ "یا علیؑ! اس امت سے دس قسم کے لوگ خداوند عظیم کے کافر ہیں: ۱۔ چغل خور ۲۔ جادوگر ۳۔ دیوث (بے غیرت) ۴۔ حرام عورت کے ساتھ پیچھے سے بدفعلی کرنے والا ۵۔ چوپائے کے ساتھ بدفعلی کرنے والا ۶۔ محرم کے ساتھ نکاح کرنے والا ۷۔ فتنہ برپا کرنے والا ۸۔ کافر حربی کے ہاتھوں اسلحہ بیچنے والا ۹۔ زکوۃ کو روکے رکھنے والا ۱۰۔ حج کی استطاعت رکھنے والا جو حج کیے بغیر مر جائے۔"

روایات کی رو سے تارک حج اور اس کے بارے میں ٹال مٹول والے شخص کیلئے سخت عذاب بیان کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے ایسا گناہ کبیرہ بتایا گیا ہے جو بہت سی ہلاکتوں کا موجب ہے۔ اس بارے میں مذکورہ آیات کے علاوہ آیت بھی ہے کہ: "مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا" (بنی اسرائیل/۷۲) جو شخص اس دنیا میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا اور راہ نجات سے بہت دور ہٹا ہوگا۔

شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ محمد بن فضیل کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا تو امامؑ نے فرمایا: "یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود "حجۃ الاسلام" کی ادائیگی کے بارے میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اس سال حج کریں گے، اس سال حج کریں گے" اور حج نہیں کرتے اور موت

سے ہمکنار ہو جاتے ہیں"

اسی طرح معاویہ بن عمار کہتے ہیں کہ "میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے مال رکھنے کے باوجود کبھی حج نہیں کیا؟" تو امامؑ نے فرمایا "اس کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بارے میں خداوند متعال فرماتا ہے "وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی" (طٰہٰ / ۱۲۴) اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا محشور کریں گے۔" میں نے عرض کیا: "سبحان اللہ! وہ اندھا محشور ہوگا؟" فرمایا: "ہاں! اس لئے کہ وہ خیر اور نیکی کی راہ سے اندھا تھا۔

تتمہ

سر زمین کربلا کی فضیلت

ابھی آپ خانہ کعبہ کی فضیلت، مشاعر عظام کے فضائل، خانہ کعبہ کے حرم خدا اور مقام امن ہونے اور خداوند عالم کا اسے تمام روئے زمین سے منتخب کرنے کے بارے میں تفصیل سے جان چکے ہیں۔ لیکن کثرت سے ایسی اخبار و روایات بھی بیان ہوئی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سر زمین کربلا کو اس پر بھی فضیلت حاصل ہے اور کربلا معلّٰی کو خانہ کعبہ سے بھی بہت پہلے سے حرم خدا ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہم اس سلسلے میں چند ایک احادیث کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :۔

۱۔ جعفر بن محمد قولویہ "المزار" میں اسناد کے ساتھ "امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے ثواب میں" امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں: "خدا کی قسم! اگر میں تمہیں حضرت امام حسینؑ کی زیارت کی فضیلت بتا دوں تو تم سرے سے حج کرنا ہی چھوڑ دو۔ اور تم میں سے کوئی بھی حج نہ کرے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کو حرم بنانے سے پہلے کربلا معلّٰی کو بابرکت اور امن دینے والا حرم بنایا" اسی پر ابن ابی یعفور نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر حج فرض قرار دیا ہے لیکن قبر حسینؑ کی زیارت کا تذکرہ نہیں کیا" تو امام علیہ السلام نے فرمایا: "بات یونہی ہے لیکن تم نے امیر المؤمنین علیؑ کا یہ قول نہیں سنا کہ: "قدم کا باطنی حصہ اس کے ظاہری حصے سے مسح کا زیادہ سزاوار ہے لیکن اللہ نے اپنے بندوں پر ظاہری حصے کا مسح فرض کیا ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ احرام اگر حرم سے باندھا جائے تو حرم کی وجہ سے زیادہ افضل ہے لیکن اللہ نے حرم سے باہر اس کے باندھنے کا حکم دیا ہے"۔

اسی طرح یہ روایت بھی اسناد کے ساتھ عمر بن یزید کے ذریعہ امام جعفر صادقؑ سے بیان کی گئی ہے کہ: "سر زمین کعبہ نے (فخر کرتے ہوئے) کہا "میرے جیسا کون ہے؟ کیونکہ اللہ کا گھر میرے اوپر بنایا گیا ہے لوگ میری طرف دور دراز علاقوں سے کھنچ کر چلے آتے ہیں اور مجھے خدا کا حرم اور مقام امن قرار دیا گیا ہے!" تو اس کی طرف خدا نے وحی کی کہ "ٹھہرو! اور اپنی اوقات میں رہو! کربلا کی سر زمین کے مقابلے میں تجھے میں نے صرف اس قدر فضیلت عطا کی ہے جتنا سوئی کو سمندر میں ڈبو دینے سے سوئی کے سرے پر پانی موجود ہوتا ہے۔ اگر کربلا کی تربت (خاک) نہ ہوتی تو میں تجھے بھی کوئی فضیلت عطا نہ کرتا۔ اور اگر وہ (حسینؑ) نہ ہوتا کہ جسے سر زمین کربلا نے اپنی آغوش میں لینا ہے تو میں نہ تو تجھے پیدا کرتا، اور نہ ہی اس چیز کو جس کے ذریعے تو فخر کر رہی ہے۔ لہٰذا اپنی جگہ اور اپنی اوقات میں رہو۔ اور اس سر زمین کے بعد اپنے آپ کو شمار کرو، تواضع اور فروتنی اختیار کرو، انکساری کو اپنا شیوہ بناؤ تکبر اور

غرور کو چھوڑو اور کربلا کی زمین کے آگے سر تسلیم خم کر دو، ورنہ تجھے مسخ کر کے جہنم میں ڈال دوں گا"۔

انہی اسناد کے ساتھ ابو الجارود حضرت امام زین العابدینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کو حرم بنانے سے چوبیس ہزار سال پہلے کربلا معلی کو اپنا حرم بنایا۔" انہی اسناد کے ساتھ صفوان جمال کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سنا کہ: "اللہ نے بعض زمینوں اور پانیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے کچھ زمینوں اور پانیوں نے دوسروں پر فخر اور غرور کا اظہار کیا، تو جس نے بھی ایسا کیا اسے خدا کے حضور تواضع وانکساری ترک کر دینے کی وجہ سے سزا دی گئی۔ حتی کہ سرزمین کعبہ پر اللہ نے مشرکین کو مسلط کئے رکھا اور آب زمزم میں نمکین پانی ملائے رکھا جس سے اس کے ذائقہ میں فرق آگیا جبکہ کربلا کی سرزمین وہ پہلی سرزمین ہے اور فرات کا پانی وہ پہلا پانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقدس اور بابرکت بنایا ہے۔ خداوند عالم نے کربلا کی سرزمین سے فرمایا: "اے سرزمین کربلا! تو خود ہی بتا کہ اللہ نے تجھے کیا فضیلت عطا کی ہے؟" تو اس نے کہا میں خدا کی مقدس اور بابرکت زمین ہوں میری خاک اور میرے پانی میں شفا ہے اور میں فخر نہیں کرتی ہوں، بلکہ اس ذات کے آگے سرنگوں اور اظہار عجز کر رہی ہوں جس نے مجھے یہ شرف بخشا ہے۔ نہ ہی میں کسی اور سرزمین پر شیخی بگھار رہی ہوں، بلکہ خدا کی اس نعمت کا شکر ادا کر رہی ہوں" تو اللہ تعالیٰ نے اس کی انکساری اور ادائے شکر کی وجہ سے اسے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے ذریعہ، اور عزت بخشی۔"

پھر امامؑ نے فرمایا: "جو خدا کیلئے عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اور بلند کرتا ہے۔ اور جو تکبر کرتا ہے تو اللہ اسے سرنگوں کر دیتا ہے۔"

مصنفؒ کہتے ہیں (اسی طرح مترجم شیخ فاضل بھی) خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس پہلے خطبہ کی شرح (اور اس کے ترجمہ۔ از مترجم) کیلئے بہترین توفیق عطا فرمائی اور اسی سے التجا ہے کہ دوسرے خطبات کی شرح (اور ترجمہ) کی توفیق بھی عنایت فرمائے۔ آمین بحق محمد وعترتہ الطاہرین۔

خطبہ ۲

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامِ وَ هِيَ الثَّانِيَةُ مِنَ الْمُخْتَارِ فِيْ بَابِ الْخُطَبِ خَطَبَ بِهَا بَعْدَ انْصِرافِهِ مِنْ صِفِّيْنَ وَ نَشْرَحُهَا فِيْ ضِمْنِ فُصُوْلٍ۔

آپؑ کا خطبہ۔ یہ خطبوں کے باب سے دوسرا منتخب خطبہ ہے

جسے آپؑ نے صفین سے پلٹنے کے بعد ارشاد فرمایا اور ہم چند فصلوں میں اس کی شرح بیان کریں گے۔

پہلی فصل

حمد اور شکر

اَحْمَدُهُ اِسْتِتْمَامًا لِنِعْمَتِهٖ وَ اِسْتِسْلَامًا لِعِزَّتِهٖ وَاسْتَعْصَامًا مِنْ مَعْصِيَتِهٖ وَاَسْتَعِيْنُهُ فَاقَةً اِلٰى كِفَايَتِهٖ اِنَّهُ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ وَ لَا يَئِلُ مَنْ عَادَاهُ وَ لَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ فَاِنَّهُ اَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَ اَفْضَلُ مَا خُزِنَ .

اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اس کی نعمتوں کی تکمیل چاہنے، اس کی عزت و جلال کے آگے سر جھکانے اور اس کی معصیت سے تحفظ حاصل کرنے کیلئے، اور اس سے مدد مانگتا ہوں اس کی کفایت و دستگیری کا محتاج ہونے کی وجہ سے، جسے وہ ہدایت کرے، گمراہ نہیں ہوتا اور جسے وہ دشمن رکھے اسے ٹھکانہ نہیں ملتا، جس کا وہ کفیل ہو وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ اور یہ حمد و ثنا اور طلب و امداد وہ ہے جس کا ہر وزن میں آنے والی چیز سے پلڑا بھاری ہے اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے۔

تشریح

لفظ "صِفِّین" صاد کے زیر اور فا کی تشدید کے ساتھ بروزن "سِجِّین" دریائے فرات کے مغربی کنارے "رقّہ" کے قریب ایک جگہ کا نام ہے جہاں پر حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان مشہور جنگ ہوئی تھی۔ اس لفظ کا وزن یا تو "فِعِّيْل" ہے جیسے "ضِلِّيْل" تو ایسی صورت میں نون اصلی ہو گی، جیسا کہ جوہری نے بیان کیا ہے اور فیروز آبادی نے باب نون میں اسے ذکر کیا ہے، اور یہی زیادہ مشہور موقف ہے۔ یا پھر "فِعْلِيْن" مثلاً "غِسْلِيْن" کے وزن پر ہے۔ تو ایسی صورت میں یاء اور نون زیادہ ہوں گی۔ چنانچہ فیومی کا بھی یہی نظریہ ہے اور بعض اہل لغت بھی "صاد، فاء" کے باب میں اسے ذکر کرتے ہیں۔ صاحب "المصباح" کہتے ہیں کہ اسے لفظ "صف" سے لیا گیا ہے اور یہ یا تو "فعلین" کے وزن پر ہے یا پھر "صفون" سے لیا گیا ہے تو پھر ایسی صورت میں اس کی نون اصلی ہو گی۔

قول مصنفؒ: اگر اس لفظ کو "صِف" (یعنی صاد کے کسرہ کے ساتھ) سے لیا جائے تو اس کی اصل "صَف" صاد کے فتح (زبر) کے ساتھ اور یا اور نون مبالغہ کیلئے ہوں گے۔ جیسے "غِسلین" کو "غَسل" غین کے زبر کے ساتھ، سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ہر وہ چیز جس کے ساتھ غسل کیا جائے مثلاً پانی، خطمی اور صابون وغیرہ۔ تو اس میں یاء اور نون مبالغہ کیلئے ہیں اور اس لفظ کا استعمال اس پیپ کیلئے ہوتا ہے جو جہنمیوں کی جلد سے بہتی ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ" (حاقہ / ۳۶) اور نہ پیپ کے علاوہ کوئی اور غذا ہوگی۔

"صفین" کی وجہ تسمیہ یا تو اس بنا پر ہے چونکہ اس مقام پر صفوں کی کثرت کی وجہ سے گھمسان کی جنگ ہوئی اس لئے اسے "صفین" کہتے ہیں۔ اگر اسے "صفون" سے لیا جائے تو پھر اس کا معنی بھی "صَفَنَ الْفَرَسُ" سے ماخوذ ہوگا جس کے معنی ہیں گھوڑا اپنے تین پاؤں پر کھڑا ہوا اور چوتھے پاؤں کو اٹھالیا۔ اور "صَفَنَ الرَّجُلُ" کے معنی ہیں مرد نے اپنے دونوں پاؤں کو صف کی صورت میں ملایا۔

وجوہات خواہ جو بھی ہوں ان سب سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس جگہ کا نام جنگ کے رونما ہونے کے بعد رکھا گیا، جیسا کہ اسی سے ملتی جلتی صورت حال "مَسْلَخ" کے وجہ تسمیہ کی ہے جو کہ ایک مشہور و معروف میقات کا نام ہے اور "وادی عقیق" کے اول میں ہے۔ کہتے یہ ہیں کہ "مسلخ" کو "سَلْخُ الثِّيَابِ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں لباس اتارنے کی جگہ، چونکہ عازمین حج یہاں پر اپنا لباس اتار کر احرام کا لباس پہنتے ہیں اس لئے اسے "مسلخ" کہا جاتا ہے۔ تو گویا مقام کا نام واقعہ کے رونما ہونے کے بعد رکھا گیا۔

"عِزَّة" کا لفظ "عَزَّ، يَعِزُّ" سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں "غلبہ پانا" یا "غالب آنا" اور "عزت" اسم ہے جس کے معنی ہیں "قوت" اور "غلبہ"۔ اور "عزیز" اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام ہے جس کے معنی ہیں ایسا غالب کہ جس پر کوئی اور غلبہ نہیں پاسکتا۔

"كِفَايَة" مصدر ہے "كَفَىٰ، يَكْفِي" سے، جس کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح کافی ہونا کہ وہ کسی اور دوسری چیز سے اسے بے نیاز کردے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: "كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ" (احزاب / ۲۵) اللہ مؤمنین کیلئے جنگ سے کافی ہو رہا (یعنی انہیں جنگ سے بچالیا)۔ "يَئِلُ" فعل مضارع ہے جس کا فعل ماضی "وَئَلَ" ہے، جس کے معنی ہیں جب کوئی نجات طلب کرے تو اسے نجات مل جائے۔ اسی سے "مَوْئِلُ" ہے جس کے معنی ہیں مقام نجات اور جائے پناہ۔

حمد اور شکر کی تفصیلی بحث

حضرت امیر المؤمنین علیؑ اس خطبے کے آغاز میں فرماتے ہیں (اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اس کی نعمتوں کی تکمیل چاہنے کیلئے) اس جملے میں لفظ "نعمت" کو مفرد لایا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خداوند سبحان کی نعمتیں لامتناہی اور اس کے فیوض کا سلسلہ نا قابل اختتام ہے۔ چاہے تعداد کے لحاظ سے ہو یا مقدار کی نوعیت سے۔ اور وہ اپنے بندوں پر ان کی استعداد اور لیاقت کے مطابق کرامت فرماتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرماتے ہیں (......اس کی عزت و جلال کے آگے سر جھکانے کیلئے) یعنی میں اس کے قہر و غلبہ کے آگے سرنگوں ہوں اور اس کی عظمت و جلالت کے سامنے خاضع و خاشع ہوں۔ (اور ......اس کی معصیت سے حفاظت حاصل کرنے

کیلئے) کہ جو کفران نعمت کی وجہ سے سرزد ہوتی ہے۔ حضرتؑ کے اس کلام میں ایک لطیف نکتہ قابل توجہ ہے کہ آپؑ نے سب سے پہلے حمد کی علت خداوند عالم کی نعمتوں کی تکمیل کا حصول بتایا ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حمد کی علت داعیہ یا حمد کا موجب نعمتوں کی تکمیل کی درخواست ہے، اس لئے کہ حمد نعمتوں کے تمام و کمال کا موجب ہوتی ہے کیونکہ خدا نے اپنے مقدس کلام میں اس کا وعدہ فرمایا ہے جیساکہ اس کا ارشاد ہے: "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ" (ابراہیم / ۷) اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں بہت زیادہ دوں گا۔ اس کے بعد امامؑ نے اس کی ایک اور علت بھی بتائی جو پہلی علت کے ساتھ ہی منسلک ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کی تکمیل کی خواہش ذات پروردگار عالم کی معرفت پر موقوف ہے۔ وہ یوں کہ نعمتیں عطا کرنے والا خداوند متعال ہی ہے اور نعمت کی معرفت یہ ہے کہ وہ نعمت ہے اور معرفت کی تکمیل اس بات میں ہے کہ ان تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا خواہ وہ چھوٹی ہیں یا بڑی خداوند سبحانہ ہے اور وہی "مُنعِم حقیقی" ہے اور اس کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ سب اس کے حکم کے مطیع اور اس کے امر کے تابع ہے۔ اور اس معرفت کا ثمرہ خداوند قدوس کی بارگاہ جبروتی میں سر تسلیم خم کر دینا اور بے چون و چرا اس کی عزت و جلال کے آگے جھک جانا ہے۔ پھر تیسری علت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حمد کے ساتھ گناہوں اور نافرمانیوں سے حفاظت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حمد کے ترک کر دینے سے کفران نعمت لازم آتا ہے جس کیلئے خداوند عالم نے زبردست تنبیہ کی ہے اور اس بات کی دھمکی دی ہے کہ: "وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" (ابراہیم / ۷) اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

باریک بین زیرک انسان پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ امیرالمؤمنینؑ کے کلام کی شرح جو ہم نے کی ہے وہ اس سے بہتر ہے جو شرح، محقق بحرانیؒ نے کی ہے کیونکہ انہوں نے استتمام، استسلام، اور استعصام کو حمد کی غرض و غایت بتایا ہے اور شہید ثانیؒ نے بھی "لمعہ دمشقیہ" کے دیباچے میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔

حمد سے مراد شکر ہی ہے

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ حضرت امیرؑ کے کلام میں "حمد" سے مراد "شکر" ہی ہے۔ اور حضرتؑ کا یہ کلام کہ "اِسْتِتْمَامًا لِنِعْمَتِهٖ" اسی بات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے، کیونکہ مُنعِم کی تعریف و ثنا اس کی نعمت کے اعتبار سے بھی اور پھر اس کی تکمیل و اضافے کی وجہ سے بھی "شکر" ہی ہے۔ اور خداوند عالم کے اس قول "لَئِنْ شَكَرْتُمْ ......" میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

محقق طوسیؒ (شیخ نصیر الدین) کے کلام سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ: "جان لو کہ نعمت کے مقابلے میں قول، فعل اور نیت کے اظہار کے ساتھ ثنا شکر ہوتا ہے، اور اس کے تین امکان ہیں:

۱۔ مُنعِم اور اس کے شایان شان صفات اور نعمت کی معرفت اس لحاظ سے کہ وہ نعمت ہے۔ اور وہ معرفت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک یہ نہ جانا جائے کہ تمام چھوٹی بڑی نعمتیں ذات خداوند سبحانہ کی طرف سے ہیں، اور وہی مُنعِم حقیقی ہے اور درمیان کی ساری چیزیں اسی کے حکم کی پابند اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

۲۔ اس معرفت کے ثمرے میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی خضوع و خشوع اور تواضع، نیز نعمتوں کے حصول پر اظہار مسرت

اس لحاظ سے سے مسرت نہیں کہ اس کے نفس کی غرض کے مطابق ہیں کیونکہ اس طرح نفسانی خواہشات کی پیروی لازم آجاتی ہے اور ان پر راضی ہو جانا پست ہمتی کی دلیل ہے، بلکہ اس لحاظ سے مسرت کہ وہ نعمتیں منعم کی عنایت کی دلیل ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ انسان کو دنیوی نعمتوں پر خوشی نہیں منانا چاہئے بلکہ ان سے ایسے کام لینے چاہئیں جو قرب خداوندی کا موجب ہوتے ہیں۔

۳۔ عمل جو اس کیفیت کا ثمرہ ہوتا ہے، کیونکہ جب یہ کیفیت دل میں حاصل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی دل میں ایک قسم کا نشاط و سرور حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خداوند متعال کے قرب کا موجب ہوتا ہے۔ اور اسی عمل کا تعلق دل سے بھی ہوتا ہے، زبان سے بھی اور اعضاو جوارح سے بھی۔

دل، زبان اور اعضاو جوارح کا عمل

الف: دل کا عمل یہ ہوتا ہے کہ مُنعم کی عظمت، بزرگی اور حمد کی بجا آوری اور اس کی تخلیق وصنائع وافعال اور اس کے لطف و کرم کے آثار میں غور و فکر اور نیکی، بھلائی اور کار خیر کو اس کی عام مخلوق تک پہنچانے کا قصد، نیت اور ارادہ کرتا ہے۔

ب: زبان کا عمل یہ ہوتا ہے کہ دل نے مُنعم کی عظمت و بزرگی اور حمد کی بجا آوری کا جو قصد کیا ہے اس کا اظہار تہلیل و تسبیح اور حمد و ثنا کی صورت میں زبان سے کیا جائے۔ اور اس کی مخلوق کی رہنمائی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کی جائے۔

ج: اعضاؤ جوارح کا عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو اس کی اطاعت اور عبادت میں استعمال کیا جائے، اور اس کی معصیت و نافرمانی اور گناہوں میں استعمال نہ کیا جائے۔ مثلاً آنکھ کے کاموں کو اس کے عجیب و غریب مصنوعات و مخلوقات کے دیکھنے میں، اس کی آیات میں نظر کرنے میں اور اس کی کتاب کے پڑھنے میں عمل میں لایا جائے۔ کانوں کو اس کے استدلالات اور براہین اور اس کی کتاب کی تلاوت کو توجہ سے سننے میں استعمال کیا جائے۔ اسی طرح دیگر اعضاو جوارح ہیں"۔

مذکورہ بالا تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سالکین راہ حق کی اشرف ترین معراج اور عارفین کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اور اس کی حقیقت تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو دنیا کو اپنے پس پشت ڈال دیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں بہت کم ہے۔ اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ" (سبا / ۱۳) میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔ حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اور اسی سے مدد مانگتا ہوں، اس کی کفایت و دستگیری کا محتاج ہونے کی وجہ سے) حضرت کا یہ جملہ بھی سابقہ جملوں کی مانند ہے۔ کیونکہ خداوند عالم کی کفایت و دستگیری کی احتیاج علت داعیہ بن رہی ہے، اسی سے مدد حاصل کرنے کی اور اس کا معنی ہے کہ میں اس ذات باری تعالیٰ سے اعانت کا طالب ہوں کیونکہ میں اس کی بے نیازی کا محتاج ہوں جبکہ وہ تمام کائنات سے بے نیاز ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ" (زمر / ۳۶) کیا خدا اپنے بندے کو کافی نہیں ہے؟۔

بندہ نیاز مند ہے، وہ بے نیاز ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام امور کی باگ ڈور اسی ذات ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے جب تک وہ کسی چیز کو ایجاد نہ کرے اور اذن عطانہ فرمائے تو وہ معرض وجود میں آہی نہیں سکتی، کائنات میں جو چیز بھی ہے سوائے اس کی اپنی ذات کے سب اسی کے محتاج اور نیاز

مند ہیں، اسی وجہ سے وہ تمام امور میں اور تمام حالات میں کائنات کی ہر شئے سے بے نیاز ہے۔ لیکن اس سے بے نیازی ناممکن اور محال ہے۔ وہ خود بھی فرماتا ہے: "يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ" (فاطر / ۱۵) اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو اور اللہ ہی بے نیاز اور لائق حمد و تعریف ہے۔ اس کی بے نیازی سے مراد یہ ہے کہ وہ غنی مطلق ہے جس کے معنی ہیں کہ اس سے ہر قسم کی نیاز مندی سلب ہے نہ اس معنی کے لحاظ سے غنی جو عام طور پر مشہور ہے جس کے معنی تونگر اور مالدار کے ہیں، جیسا کہ فقر سے مراد مطلق حاجت ہے۔ غنی یا بے نیازی کا حقیقی معنی ہے: "کسی چیز کا بذاتہ اس حیثیت سے استقلال کہ اسے کسی بھی چیز کیلئے اور کسی بھی صورت میں کسی بھی وقت کسی کی بھی ضرورت نہ ہو" اور وہ اس معنی کے لحاظ سے سوائے ذات خدا کے کسی اور کیلئے ثابت ہے ہی نہیں۔ جبکہ فقر و فاقہ کا حقیقی معنی یہ ہے کہ "کسی چیز کا بذاتہ عدم استقلال اور غیر کے ساتھ اس کا تعلق خواہ کسی بھی چیز میں ہو" تو اس معنی کے لحاظ سے یہ ہر ممکن شئے کی صفت ہے جو بھی ذات خدا کے علاوہ ہے۔

مذکورہ بالا تعریفات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ذات خداوند متعال ہر طرح سے اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ جو چیز کسی بھی لحاظ سے بالذات محتاج ہوتی ہے وہ ہر لحاظ سے بالذات نیاز مند ہوتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں (یقیناً جسے خدا ہدایت کرے، گمراہ نہیں ہوتا، اور جسے وہ دشمن رکھے اسے ٹھکانہ نہیں ملتا) یہ جملہ حضرت امیرؑ کے سابقہ جملہ کی علت اور سبب بتا رہا ہے کہ آپؑ نے خداوند عالم سے کفایت و دستگیری کیلئے کیوں امداد طلب کی ہے۔ تو اس لحاظ سے گویا آپؑ یہ فرما رہے ہیں: "میں اس سے اس بات کی مدد مانگتا ہوں کہ مجھے ایسی کفایت و دستگیری عطا کرے جو اس ہدایت کیلئے لازم ہوتی ہے جو حقیقی بے نیازی اور ابدی ملک ہے۔ کیونکہ جسے وہ ہدایت کرے وہ گمراہ نہیں ہوتا، اور جس سے وہ دشمنی کرے اس کو عذاب سے نجات کا ٹھکانہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ اس ذات کے علاوہ کوئی ٹھکانہ، کوئی پناہ گاہ اور کوئی نجات دہندہ نہیں ہے کہ اس کی پناہ لی جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ "جو تیرے سوا ہے وہ تیرا بندہ ہے" کے مصداق سب اسی کی قدرت کے پابند اور اس کے حضور بے بس اور بے چارہ ہیں۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹھکرا نہیں سکتا، اس کی قضا کو کوئی رد کر نہیں سکتا۔ جب صورت حال یہ ہو تو اس کی حکومت سے فرار کیونکر ممکن ہے؟ یا اس کے علاوہ کسی اور کے پاس جائے پناہ کیونکر میسر ہے؟"۔ خداوند عالم کی بندے کے ساتھ دشمنی سے مراد یہ ہے کہ خدا اس سے بے توجہی کر لیتا ہے اور اسے گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ تو اس لحاظ سے حضرت امیر علیہ السلام کا کلام اس قدرت کا حامل ہو گا کہ دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ: "جسے خدا ہدایت کرتا ہے وہ گمراہ نہیں ہوتا اور جسے خدا گمراہی میں ڈال دیتا ہے وہ ہدایت نہیں پا سکتا"۔ اور خدا کے اس قول کی تصدیق کر رہا ہے: "وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ" (رعد / ۳۳) اور جس شخص کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے تو اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں۔ اور "مَنْ يَّهْدِي اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ" (زمر / ۳۷) اور جسے خدا ہدایت کرتا ہے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا خدا زبردست اور بدلہ لینے والا نہیں ہے؟ نیز اس قول کی بھی کہ: "مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا" (کہف / ۱۷) جس کو خدا ہدایت کرے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو گمراہ کرے تو پھر تم اس کا کوئی سرپرست و رہنما ہرگز نہ پاؤ گے۔

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (جس کا وہ کفیل ہو وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا) کیونکہ اس ذات سبحانہ کے قبضہ قدرت میں زمین و آسمان کے خزانے ہیں اور اسی کے ہاتھ میں ہے حاجت روائی اور وہی ہے قدرت کاملہ کا مالک اور قدرت بھی ایسی جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور وہ ایسا سخی اور جواد ہے کہ بخل کا اس کے پاس سے گزر نہیں ہو سکتا ہے۔ ایسا بے نیاز ہے جو کبھی فقیر اور محتاج نہیں ہوتا۔ لہذا ایسی ذات جب اپنے بندے کی کفالت اور کفایت کرتی ہے تو وہ ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور غیر اللہ سے اس کی آرزوئیں منقطع ہو جاتی ہیں (کیونکہ یہ۔ حمد و ثنا اور طلب امداد۔ وہ ہے جس کا ہر وزن میں آنے والی چیز سے پلہ بھاری ہے اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے)۔ لفظ "فَاِنَّهٗ" میں ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو احتمال ہیں :

ا۔ ایک احتمال تو یہ ہے کہ اس کا مرجع "حمد" ہو کیونکہ اس میں حضرتؑ کے اس جملے "اَحْمَدُهٗ" میں اس کی دلالت موجود ہے، جس طرح کہ "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" میں "هُوَ" کی ضمیر "عدل" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ایسی صورت میں حضرتؑ کی مراد یہ ہوگی کہ "کیونکہ یہ حمد و ثنا وہ ہے جس کا پلہ میزان اعمال کے ساتھ وزن میں آنے والی ہر چیز سے بھاری ہے اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر اور روز جزا کیلئے ذخیرہ ہے"۔ اس لئے کہ اس کے فوائد بہت عظیم اور ثمرات بہت زیادہ ہیں جیسا کہ عنقریب آپ کو اس بارے میں مزید معلومات حاصل ہوں گی۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مرجع ذات خداوند متعال ہے، تو پھر ایسی صورت میں حضرتؑ کے کلام کا یوں معنی ہوگا کہ "اس ذات ذوالجلال کا پلہ بھاری ہے جب میزان عقول میں اس کا وزن کیا جاتا ہے اور ہر گنج گرانمایہ سے بہتر و برتر ہے جو دلوں کے خزانے میں جمع ہے"۔ یہ تعبیر الفاظ کے لحاظ سے مقصد کے زیادہ قریب ہے جبکہ پہلی تعبیر معنی کے لحاظ سے مقصد کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ وزن اور خزینہ کا تعلق اجسام کی صفات سے ہے اور ذات خداوند متعال ان چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔ ....اس کی مزید تفصیل پہلے خطبے کی چوتھی فصل میں حضرتؑ کے ان کلمات کے ضمن میں گزر چکی ہے کہ "كَمَالُ الصِّفَاتِ لَهٗ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ"۔

شکر منعم واجب ہے

معلوم ہونا چاہئے کہ عقل و نقل دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ "مُنعِم کا شکر واجب اور بہتر ہے جبکہ کفران نعمت قبیح و بد تر ہے"۔ چنانچہ پہلے ہم نقل کی روشنی میں ثابت کریں گے کہ منعم کا شکر واجب ہے۔

اور سب سے پہلے کتاب اللہ سے :

ا۔ خداوند عالم سورہ ابراہیم میں فرماتا ہے : "وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" (آیت / ۷) اور جب تمہارے پروردگار نے تمہیں جتادیا کہ اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر نعمت کی فراوانی کروں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو یاد رکھو کہ یقیناً میرا عذاب سخت ہے۔

۲۔ سورہ نمل میں ارشاد ہوتا ہے : "وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ" (آیت

/۴۰)اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ اپنی بھلائی کیلئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا پروردگار یقیناً بے پروا اور سخی ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن مجید فرقان حمید میں اس قسم کی آیات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ سنت کی رو سے بھی شکر منعم واجب ہے، چنانچہ :

۱۔ عبداللہ بن اسحاق جعفری حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں، امامؑ نے فرمایا : "توریت میں یہ بات درج ہے کہ جو تمہیں نعمت عطا کرے اس کا شکر ادا کرو اور جو تمہارا شکریہ ادا کرے اسے نعمتوں سے نوازو! کیونکہ شکر ادا کرنے پر نعمتوں کو زوال نہیں اور کفران نعمت پر نعمتوں کو بقا نہیں ہے۔ شکر نعمت نعمتوں کو زیادہ کرتا اور انہیں تبدیل اور دگرگوں ہونے سے بچاتا ہے"۔

۲۔ معاویہ بن وہب حضرت امام جعفر صادقؑ ہی سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا : "جو اپنی طرف سے شکر ادا کرتا ہے اسے رب کی طرف سے فراوانی کے ساتھ نعمتیں ادا ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ اللہ فرماتا ہے "لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ "اگر تم میرا شکر بجالاؤ گے تو میں فراوانی کے ساتھ نعمتیں عطا کروں گا"۔

۳۔ عبداللہ بن ولید کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا : "تین چیزوں کے ہوتے ہوئے کوئی بھی چیز انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ۱۔ مصیبت کے وقت دعا ۲۔ گناہ کے وقت استغفار اور ۳۔ نعمت کے وقت شکر"۔

۴۔ معمر بن خلاد کہتے ہیں کہ میں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے فرماتے ہوئے سنا کہ : "جو شخص خدا کی نعمتوں پر اس کی حمد ادا کرتا ہے تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے، اور حمد اس نعمت سے افضل ہے"۔

۵۔ سفیان بن عُیَینہ، عمار دہنی سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی زین العابدینؑ سے سنا کہ آپؑ نے فرمایا : "اللہ تعالیٰ ہر غمگین دل کو اور ہر شکر گزار بندے کو دوست رکھتا ہے، اور رب تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو کہے گا "آیا تو نے فلاں شخص کا شکریہ ادا کیا تھا؟" تو وہ جواب دے گا "پروردگارا! میں تو تیرا شکر ادا کرتا تھا" خداوند عالم فرمائے گا "اگر تو نے اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تو میرا بھی شکر ادا نہیں کیا" پھر فرمایا "تم میں سے جو شخص بندوں کا زیادہ شکر گزار ہوتا ہے وہی شخص خدا کا بھی زیادہ شکر گزار ہوتا ہے" اس کے علاوہ اور بھی کثیر تعداد میں احادیث موجود ہیں، اس قدر زیادہ کہ "کافی" میں "باب الشکر" کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے، ہم نے بھی مذکورہ احادیث وہیں سے اخذ کی ہیں، اس بارے میں مزید احادیث کیلئے کافی کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

رہی عقلی دلائل کی بات تو عقل بھی مستقل طور پر شکر کے وجوب کی قائل اور اس کے حُسن کا حکم لگاتی ہے، اس بات پر امامیہ اور معتزلہ کا اتفاق ہے کہ منعم کا شکر حسن عقلی کے زمرے میں آتا ہے۔ جبکہ اس بارے میں اشاعرہ کو اختلاف ہے۔ حالانکہ ان کے عقیدے کی بنیاد بھی "حسن و قبح عقلی" کے مسئلہ پر قائم ہے لیکن وہ شکر منعم کے بارے میں عقلی حسن کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کے مطلقاً عقلی ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ یہ علم اصول کا ایک بنیادی مسئلہ ہے اور اس بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے اور طرفین نے اپنے موقف میں بہت ساری دلیلیں پیش کی ہیں۔

حسن و قبح عقلی کے مخالفین کے دو عمدہ دلائل ہیں جن میں سے ایک نقلی اور ایک عقلی ہے۔ جو نقلی دلیل ہے، تو وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے : "وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا "(بنی اسرائیل

۱۵) ہم اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں۔ اس آیت سے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کسی چیز کے واجب ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی خلاف ورزی پر عذاب اور سزا ملتی ہے جبکہ آیت کی رو سے کسی چیز کے شرعی ہونے سے پہلے سزا کی نفی کی گئی ہے، جب سزا منتفی ہے تو وجوب خود بخود منتفی ہو گا۔ لہذا حسن وقبح عقلی کا وجود کہاں سے آ گیا؟

اس استدلال کا کئی طرح سے جواب دیا گیا ہے:

۱۔ حسن وقبح عقلی کا تعلق "مستقلات عقلیہ" سے ہے اور آیت مذکورہ کا تعلق "غیر مستقلات عقلیہ" سے ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ "جن اعمال کی معرفت کا شرع کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہم ان اعمال کے سلسلے میں اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں جب تک ان کے پاس شرع نہ آجائے" یہاں پر تخصیص اگرچہ ظاہر کے خلاف ہے لیکن جب دلیل موجود ہو تو پھر ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور اس پر دلیل عقلی حکم کے مطابق ہے جیسا کہ ابھی دوسرے جواب میں معلوم ہو جائے گا۔

۲۔ حسن وقبح کا عقل کے ساتھ اس لئے بھی تعلق ہے کہ رسول دو طرح کے ہوتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرے باطنی، جو ظاہری رسول ہے وہ انبیاء و مرسلین ہیں اور جو باطنی ہے وہ عقل انسانی ہے، بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ اگر یہی رسول (عقل) نہ ہو تو انبیاء کرام میں سے کسی بھی نبی کی نبوت کام نہ آئے۔ بلکہ ان کا لاجواب ہونا لازم آجائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی صاحب شریعت اس دنیا میں آئے اور آکر یہ دعویٰ کرے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی ہے اور اپنے دعوے کے مطابق معجزہ بھی ظاہر کرے، تو پھر سننے والے کیلئے دو صورتیں ہوں گی ا۔ اس کی بات کو سنے اور معجزہ میں غور و فکر کرے یا ۲۔ ایسا نہ کرے۔ اس دوسری صورت میں نبوت باطل اور نبی لاجواب اور ساکت ہو جائے گا۔ اب اگر پہلی صورت کو دیکھا جائے تو پھر لازم آئے گا کہ اس کی بات کو سنا جائے اور معجزے میں بھی غور و فکر کیا جائے۔ اس صورت میں غور و فکر یا عقل کے حکم کے مطابق کیا جائے گا یا شرع کے مطابق! اگر تو عقل کے مطابق کیا جائے گا تو ایسی صورت میں ہمارا مدعا ثابت ہو جائے گا، کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ اب رہی دوسری صورت کہ اس میں غور و فکر شرع کے مطابق کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں وجوب باطل ہو گا۔ کیونکہ "شرع" یا تو خود وہی مدعی ہو گی یا کوئی اور چیز! اگر تو خود وہی مدعی ہے تو پھر ایسی صورت میں بھی وجوب باطل ہو گا، کیونکہ بات لے دے کر پھر اسی مدعی کی طرف آجائے گی وہ کہے گی کہ "میرے قول کو اس لئے ماننا واجب ہے کہ میں کہہ رہی ہوں اور وہ اس لئے کہ میرے قول کو ماننا واجب ہے" اور یہ اس لئے باطل ہے کہ اس سے اثبات الشئ بنفسہ _ کسی چیز کو اس کی اپنی ذات سے ثابت کرنا _ لازم آئے گا۔ باالفاظ دیگر اس کی باتوں کو سننا اور اس کے معجزات میں غور و فکر کرنا اس کے قول کے حجت ہونے پر منحصر ہو گا، اور اس کے قول کا حجت ہونا اس کی باتوں میں غور و فکر کرنے اور معجزے پر منحصر ہو گا، اور سمجھ میں نہیں آئے گا کہ پہلے کس کو حجت مانیں "انڈے کو یا مرغی کو؟"۔ اب رہی دوسری صورت یعنی شرع خود مدعی نہیں ہے بلکہ کوئی اور چیز ہو گی، تو بھی وجوب باطل ہو گا۔ اس لئے کہ اس سے پہلی صورت کی طرح اس کے دعویٰ کا اثبات اس کے قول پر اور اس کا قول اس کے دعویٰ پر حجت ہو گا۔ اور اس طرح سے دور یا تسلسل لازم آئیں گے جو کہ باطل اور محال ہیں۔

۳۔ عذاب کی نفی سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کوئی چیز واجب ہی نہ ہو، کیونکہ واجب وہ ہوتا ہے جس کی مخالفت کرنے والا عذاب کا مستحق ہو، اور ضروری نہیں ہے کہ اس پر اس کا اجرا بھی ہو، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عذاب کا تو مستحق ہو لیکن عفو

الٰہی یا شفاعت کی وجہ سے عذاب سے بچ جائے۔

عفواور شفاعت پر اعتراض

ضمنی طور پر عرض کرتے چلیں کہ بعض لوگوں نے عفواور شفاعت پر اعتراض کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ واجبات کے ترک کردینے اور محرمات کے انجام دینے کی وجہ سے جو سزا ملنی چاہئے وہ قیامت تک معاف ہو اور آیت بھی اس بات کی تصدیق کرے تو اس طرح سے وجوب اور حرمت کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا، کیونکہ اس سے مقصود تو واجب کی بجاآوری اور حرام کا ترک کرنا ہوتا ہے اور عفو کی صورت میں تو عام مکلف افراد کی طرف سے ایسا ہونا ناممکن ہو جائے گا_ سوائے خدا کے مخلص بندوں کے_ اور واجب کی بجا آوری اور حرام کا ترک اس وقت ممکن ہوگا جب عذاب کا خوف ہو۔ لیکن جب یہ اطمینان ہو جائے کہ خدا معاف کردے گا تو نفس کو عذاب کا خوف نہیں رہے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شرعی فرائض کی بجاآوری کی اصل غرض فوت ہو جائے گی اور شرعی فرائض اس دنیا میں لغواور عبث ہو جائیں گے.................................

اب آتے ہیں عقلی دلائل کی طرف تو اس بارے میں "حاجبی" اپنی کتاب "المختصر" میں کہتے ہیں کہ: "منعم کا شکر عقلی طور پر واجب نہیں ہے، اس لئے کہ اس کا وجوب کسی فائدہ کیلئے ہونا چاہئے۔ اگر کسی فائدہ کیلئے نہیں ہے تو پھر عبث ہوگا اور وہ ذات خدا کیلئے قبیح ہے۔ کیونکہ اس سے ذات خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس لئے کہ ذات کردگار ایسی چیزوں سے کہیں بلند و بالاتر ہے، اسی طرح نہ ہی بندے کو اس سے کوئی فائدہ ہوتا ہے، نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں۔ دنیا میں اس لئے کہ یہ ایک مشقت ہے اور نفس انسانی کو اس سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اور آخرت میں اس لئے نہیں کہ وہاں پر عقلی طور پر اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

اس کی تشریح عضدی نے "شرح مختصر" میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر شکر منعم واجب ہے تو یہ کسی فائدے کیلئے واجب ہوگا، چونکہ یہ کسی فائدہ کیلئے نہیں ہوتا لہٰذا یہ واجب نہیں ہے۔ اور اس کے چند دلائل ہیں:

۱۔ اگر اس کا فائدہ نہیں ہے تو پھر یہ فعل عبث ہوگا، اور یہ قبیح ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر واجب نہیں ہے، چونکہ یہ فعل عبث کا موجب ہوتا ہے اور قبیح ہے لہٰذا خدا کیلئے جائز نہیں ہے۔

۲۔ فائدہ یا تو خدا کو ہوگا یا بندے کو، اگر بندے کو ہوگا یا دنیا میں ہوگا یا آخرت میں اور مذکورہ تینوں فرض صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ اس سے نہ تو خدا کو فائدہ ہوتا ہے نہ ہی بندے کو، دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ خدا کو اس لئے فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ ایسی چیزوں سے بالاتر ہے۔ بندے کو دنیا میں اس لئے نہیں کہ عقل کے فیصلے کے مطابق دنیا میں بندے کو واجبات ادا کرنے پڑتے ہیں، محرمات سے رکنا پڑتا ہے اور ان چیزوں میں مشقت کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ نفس کو مشقتوں پر مجبور کرنا پڑتا ہے، اس کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے؟ آخرت میں اس لئے فائدہ نہیں ہوتا کہ اخروی امور کا تعلق غیب سے ہے اور غیب تک عقل کو رسائی نہیں ہے۔

اس قسم کے نظریئے کو یوں رد کیا جاتا ہے کہ:

۱۔ ہم نے کب کہا ہے کہ شکر منعم اس لئے واجب ہے کہ اس میں فائدہ مضمر ہے بلکہ یہ اپنی ذات کیلئے واجب ہے کسی اور

چیز کیلئے نہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ اپنی ذات کیلئے کس لئے واجب ہے؟ تو ہر شئے کی غرض و غایت اور مقصد کا ثبوت ضروری نہیں ہوتا ورنہ اس سے تسلسل لازم آئے گا، لہذا صرف اسی بات پر اکتفا کر لینا ہی کافی ہے کہ یہ اپنی ذات کیلئے واجب ہے اور اس کی غرض اپنی ذات کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جس طرح کہ "دفع ضرر" اپنی ذات کیلئے واجب ہے اور اس سے کوئی اور مقصود نہیں ہوتا، اس لئے عقلاء اس کی یہ علت پیش کرتے ہیں کہ یہ چونکہ نعمتوں کیلئے شکر ہوتا ہے اس لئے واجب ہے اور بس۔

۲۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شکر کی ادائیگی کا کوئی فائدہ ہوتا ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا میں اس سے بندے کو فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ شکر کی ادائیگی میں اگرچہ تکلیف، مشقت اور جلد ملنے والا ضرور ہوتا ہے، لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ دل میں جو یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ امر مطلوب کے ترک کرنے کی وجہ سے آخرت میں اس کی سزا ملے گی تو اس سے فوراً دل کو یہ تسلی اور اطمینان ہو جاتا ہے آخرت کی سزا سے بچ جائیں گے اور اس کا پلہ شکر کے اس فرد پر بھاری ہو جاتا ہے جو فوراً در پیش ہوتا ہے اور یہی چیز اس کے وجوب کیلئے کافی ہے۔

۳۔ چلو ہم مان لیتے ہیں کہ دنیا میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، آخرت میں تو اس کے فائدہ سے انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ شکر ادا نہ کرنے کی جو سزا آخرت میں ملے گی اس سے تو انسان بچ جائے گا۔

(مصنفؒ نے جو دلائل اور جوابات پیش کئے ہیں وہ وجوب شکر منعم کو عقلی لحاظ سے ثابت کرنے کیلئے ناکافی معلوم ہوتے ہیں، جبکہ اگر عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کے علاوہ بھی کئی اور مثالیں ہیں مثلاً یہ کہ شکر کی ادائیگی میں بہت سے فائدے مضمر ہیں جن میں ایک تو یہ ہے کہ منعم کا حق اگرچہ بہت کم ہی سہی پھر بھی ادا ہوتا ہے دوسرا یہ کہ منعم کے وعدہ کے مطابق شکر کی ادائیگی پر نعمتوں کی تکمیل ہوتی ہے تو عقل یہ کہتی ہے کہ شکر ادا کرتے جاؤ اور مزید نعمتیں اور مراعاتیں حاصل کرتے جاؤ، ادائیگی شکر پر خالق اور منعم کی اطاعت ہوتی ہے اور یہ اطاعت عقلی لحاظ سے کسی ثبوت کی محتاج نہیں، اسی طرح اس کے برعکس شکر کی عدم ادائیگی کفران نعمت اور عصیان رب و منعم ہے اور عقلی لحاظ سے بھی اور منعم کی دھمکی کے لحاظ سے بھی یہ ادائیگی ضروری اور واجب ہو جاتی ہے اور اس کی کئی قسم کی دوسری مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جو عام فہم بھی ہوں اور واضح و بدیہی بھی کہ جس سے انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی بلکہ ان مثالوں سے حسن و قبح عقلی کے اساس بھی استوار کئے جاسکتے ہیں جس طرح ظلم اور عدل کی مثالوں پر استوار کئے گئے ہیں کیونکہ ولی نعمت کا شکریہ ادا کرنا بقول مصنف بذات خود واجب ہے اور اس کا فائدہ اگر منعم کو نہ بھی ہو کم از کم شکر ادا کرنے والوں کو ضرور ہوگا۔ اور اگر عقلی لحاظ سے یہ واجب اور فائدہ مند نہیں ہے تو منعم نے کیوں مفت میں مخلوق کو تکلیف و مشقت میں ڈال کر شکر کی ادائیگی کا حکم دیا اور ایسا فعل منعم حکیم سے قبیح اور بعید ہے نہ وہ بات جو دوسرے کہتے ہیں اور فعل باری کو اپنی تراشیدہ ترازوئے عقل میں پرکھتے ہیں :از مترجم)

دو خوبصورت مثالیں

علاوہ ازیں ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ شکر منعم واجب نہیں ہے اس لئے کہ منعم کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا گویا خدا سے مذاق کرنا ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے وہ اس قسم کی مثال پیش کرتے ہیں کہ: "فرض کیجئے کہ ایک عظیم اور کریم بادشاہ نے اپنے اہل ملک کیلئے خوان کرم بچھایا ہوا ہے جس سے ہر خاص و عام مستفید ہو رہے ہیں، ایک ایسا عظیم

دستر خوان ہے جو سالہا سال سے متواتر اور کسی وقفے کے بغیر شب و روز بچھا ہوا ہے جس پر انواع و اقسام کے کھانے، مشروبات اور پھل میوے موجود ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے اور نت نئے تازے ہیں۔ اس سے ہر شریف، کمینہ، نیک، بدکار، دوست اور دشمن غرض سب بلاامتیاز استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیجئے کہ اسی دوران میں ایک فقیر اور گداگر آجاتا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا، اور بادشاہ اس گداگر کو بھرے پڑے دستر خوان سے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیتا ہے اور بس۔ جسے لے کر وہ گداگر کھانے کے بعد اس عظیم سلطان کے گن گانے اور تعریفیں کرنی شروع کر دیتا ہے کہ شہنشاہ معظم نے کتنا بڑا احسان کیا اس حقیر فقیر کو اس قدر بھرے پرے اور ہر نعمت سے معمور خوان کرم سے روٹی کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا ہے، شہنشاہ معظم، اعلیحضرت، قدر قدرت تیری سخاوت کے قربان! یہ شکریہ کبھی تو وہ انگلیاں اوپر اٹھا کر کرتا ہے اور کبھی جھوم جھوم کر اس کا ذکر کرتا ہے۔ تو آپ ہی بتایئے کہ صاحبان عقل و شعور اسے "شکر" کہیں گے یا "مذاق"؟ اس میں شک نہیں کہ ہم پر خدا کی نعمتیں خواہ کتنا ہی زیادہ ہوں لیکن اس کی عظیم سلطنت اور عمیم احسان کے مقابلے میں بالکل حقیر ہیں بلکہ اس لقمے سے بھی زیادہ حقیر۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شکر کیلئے صرف ایک لقمے یا روٹی کے ایک ٹکڑے کی عطا سے مثال دینا ہی غلط ہے۔ کیونکہ بندے پر خدا کی نعمتیں اس کی تخلیق سے ہی شروع ہو جاتی ہیں، اسے وجود کی نعمت سے نوازا، زندگی عطا کی، اس کیلئے راہیں متعین کیں، اسے عقل، صحت، سلامتی، جائے پناہ اور کروڑوں ایسی نعمتیں، آسائشیں اور سہولتیں عطا کیں۔ ان میں سے ہر ایک نعمت تمام دنیا سے زیادہ عظیم ہے۔ لہذا اس کی مثال یوں دینی چاہئے کہ: "فرض کیجئے کہ ایک مسکین اور فقیر ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے او جھل اور گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا ہے، زبان جس کی گنگ ہے، اعضا جس کے مفلوج ہیں، ہاتھ جس کے شل ہیں، پاؤں سے لنگڑا ہے، آنکھوں سے اندھا ہے، کانوں سے بہرا ہے، چلنے پھرنے سے عاجز ہے اور مختلف بیماریوں کا شکار ہے۔ بادشاہ نے اسے اس گوشہ گمنامی سے نکال کر اور اس عذاب سے باہر کر کے اسے طبیب کے پاس بیماریوں کے معالجے کیلئے بھیج دیا، جس سے اسے قوت گویائی بھی مل گئی، اعضا بھی صحیح سالم ہو گئے، چلنے پھرنے پر قدرت حاصل کر لی، تمام آلام و اسقام سے اسے نجات مل گئی، آنکھوں اور کانوں کی نعمت سے بھی مالامال ہو گیا، اپنا نفع اور نقصان بھی پہچاننے لگ گیا، ہاتھوں میں قوت آگئی، پاؤں سیدھے ہو گئے اور وہ مکمل طور پر صحیح و سالم اور تندرست ہو گیا۔ اس کے بعد پھر اس سلطان معظم نے اس پر ایک اور عظیم احسان یہ کیا کہ اس کے رہنے کیلئے بہترین گھر اور کھانے کیلئے بہترین غذا کا بندوبست بھی کر دیا اور زندگی کی خوشحالی کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ اب بالفرض اگر یہی پروردۂ احسان اس مہربان اور نیک دل بادشاہ کے حضور اس کا شکریہ نہ بجالائے بلکہ بڑی بے نیازی سے اس سے منہ پھیر لے اور اس کی کسی بھی نعمت کو خاطر میں نہ لائے تو صاحبان عقل اس کی مذمت کریں گے اور باشعور لوگ اسے طعنے دیں گے۔ جس طرح کہ عقل سلیم اور صحیح طبیعت اس بات کی شاہد ہے۔ یہ مثال موقع سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور خداوند عالم ہی سیدھی راہ کا ہادی ہے اور ہم اس کی حمد ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنی حمد کی معرفت کرائی اور اپنے شکر کا الہام کیا۔

....

دوسری فصل

کلمہ توحید کا اعراب

وَاَشْهَدُاَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ شَهَادَةً مُمْتَحَنًا اِخْلَاصُهَا مُعْتَقَدًا مُصَاصُهَانَتَمَسَّكُ بِهَا اَبَدًا مَّا اَبْقَانَا وَ نَدَّخِرُهَا لِاَهَاوِيْلِ مَا يَلْقَانَا فَاِنَّهَا عَزِيْمَةُ الْاِيْمَانِ وَ فَاتِحَةُ الْاِحْسَانِ وَمَرْضَاتُ الرَّحْمٰنِ وَ مَدْحَرَةُ الشَّيْطَانِ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ بِالدِّيْنِ الْمَشْهُوْرِ وَ الْعَلَمِ الْمَاْثُوْرِ وَ الْكِتَابِ الْمَسْطُوْرِوَالنُّوْرِالسَّاطِعِ وَ الضِّيَاءِ اللَّامِعِ وَالْاَمْرِالصَّادِعِ اِزَاحَةً لِلشُّبُهَاتِ وَ احْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ وَ تَحْذِيْرًا بِالْآيَاتِ وَ تَخْوِيْفًا لِلْمَثُلَاتِ.

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، جو یکتا اور لاشریک ہے ایسی گواہی جس کا خلوص پر کھا جا چکا ہے اور جس کا نچوڑ بغیر کسی شائبے کے دل کا عقیدہ بن چکا ہے، زندگی بھر ہم اس سے وابستہ رہیں گے اور اسی کو پیش آنے والے خطرات کیلئے ذخیرہ بنا کر رکھیں گے، یہی گواہی ایمان کی مضبوط بنیاد، حسن عمل کا پہلا قدم، اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ اور شیطان کی دوری کا سبب ہے۔ اور یہ گواہی بھی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے عبد و رسول ہیں جنہیں شہرت یافتہ دین، منقول شدہ نشان، لکھی ہوئی کتاب، ضوفشاں نور، چمکتی ہوئی روشنی اور فیصلہ کن امر کے ساتھ بھیجا تا کہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جائے اور دلائل (کے زور) سے حجت تمام کی جائے آیتوں کے ذریعے ڈرایا جائے اور عقوبتوں سے خوفزدہ کیا جائے۔

تشریح

"اَلْمُصَاص" میم کے ضمہ (پیش) اور دو "صاد" کے ساتھ ہر خالص چیز، نچوڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں ہے "لَيْسَ لِمُصَاصِ شِيْعَتِنَا فِيْ دَوْلَةِ الْبَاطِلِ اِلَّا الْقُوْتُ" باطل کے دور حکومت میں ہمارے خالص شیعوں کیلئے بقدر کفایت روزی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ "اَلْاِدِّخَار" باب افتعال سے ہے اور اسے "اَلذُّخْرُ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا تیار رکھنا اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھانا، اس کا فعل "اِدَّخَرَ، يَدَّخِرُ" ہے، "اِدَّخَرَ" اصل میں "اِذْتَخَرَ" تھا، قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب کسی کلمہ میں ذال اور تا اکٹھا ہو جائیں تو تاء کو "دال" میں تبدیل کر کے دال کو دال میں ادغام کر دیا جاتا ہے۔ "اَهَاوِيْلُ" جمع ہے "اَهْوَال" کی اور وہ جمع ہے "هَوْل" کی، جیسے اقاویل جمع ہے اقوال کی اور وہ جمع ہے قول کی۔ ہول کے معنی ہیں ڈر، خوف، بھیانک چیز۔ اور "عَزِيْمَة" کے معنی ہیں عقیدہ اور پختہ بات کے۔ اگر اسے "عَزْمَةً، عَزْمًا، عُزْمًا" سے لیا جائے۔ لیکن اگر اسے "عَزَمَ، عَزْمَةً، عَزِيْمَةً" سے لیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے جدو جہد کرنا، کوشش کرنا، جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: "اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" (شوریٰ / ۴۳) بے شک یہ بڑے حوصلے کے کام ہیں۔ یعنی ایسے پختہ امور سے ہے جن کو انجام دینے کیلئے جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی سے ہے "اولوالعزم" یعنی صاحبان جد و جہد اور ثبات قدم۔

"اَلْمَرْضَاتُ" مصدر ہے "رَضِيَ يَرْضٰى" کا، جیسے "رضا" اور "رضوان" اسی کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں رضا

مندی۔ اور یہ "سخط" یعنی ناراضگی کے خلاف معنی ہے۔ قرآن مجید میں ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (بقرہ / ۲۰۷) اور لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو خدا کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔ "اَلْمَدْحَرَةُ" باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں دور کرنے والی۔ "اَلْعَلَم" وہ نشانی ہوتی ہے جس سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ "مَاثُوْر" کے معنی منقول کے ہیں، "آثَرْتُ الْحَدِيْثَ" کے معنی ہیں میں نے حدیث کو نقل کیا۔ اسی سے "اَثَر" ہمزہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ ایک کلمہ ہے جو اس کا اسم ہے۔ "حدیث ماثور" کے معنی وہ حدیث ہے جسے بعد میں آنے والے، پہلے والوں سے نقل کریں، "ساطع اور لامع" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ چمکدار، روشن اور ضیاء پاش۔ "اَلصَّادِعْ" کے معنی ہیں "ظاہر" یا "جدا کرنے والا" یا "برحق فیصلہ کرنے والا" چنانچہ قرآن کی اس آیت "فَاصْدَعْ بِمَاتُؤْمَرُ" (حجر / ۹۴) جس چیز کا آپ کو حکم ملا اسے کو کھول کر بیان کریں۔ کے بارے میں فیروز آبادی فرماتے ہیں کہ: "اس کے کئی معانی ہیں ا۔ کلمہ توحید کے ذریعہ ان کی جماعت کو شگافتہ کردو۔ ۲۔ قرآن مجید کو بلند آواز سے پڑھو۔ ۳۔ حق کا اظہار کرو۔ ۴۔ برحق فیصلہ کرو۔ ۵۔ امر کے ذریعہ فاصلہ قائم کرو۔ ۶۔ جس کا تمہیں حکم ملا ہے اسی کا قصد کرو۔ ۷۔ حق اور باطل کے درمیان جدائی قائم کرو۔ "اِزَاحَةٌ" کے معنی "ازالہ" کے ہیں کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا، دور کر دینا۔ "اَلْمَثُلَاتُ" میم کے فتحہ اور "ثا" کے ضمہ کے ساتھ۔ "مَثُوْلَات" کے ہم معنی ہے۔ اور "مَثُلَةٌ" میم کے فتحہ اور ثا کے ضمہ کے ساتھ۔ جس کے معنی ہیں "ایسی سزا جو دوسروں کیلئے باعث عبرت ہو" بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا مفرد "مُثْلَة" میم کے ضمہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ اور جمع "مُثُلَات" ہے میم کے ضمہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ۔ جیسے "غُرْفَةٌ" کی جمع "غُرُفَات" ہے۔ جبکہ بعض دوسرے حضرات کا کہنا ہے کہ جمع "رُكَبَات" کے وزن پر "مُثُلَات" میم کے ضمہ اور ثاء کے فتحہ کے ساتھ۔

مفسر زمخشری تفسیر کشاف میں اسی آیت: "قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ" (حالانکہ ان کے پہلے (بہت سے لوگوں) کو سزائیں ہو چکی ہیں۔ کے بارے میں فرماتے ہیں: "ان سے پہلے ان لوگوں کی سزاؤں کی مثالیں گزر چکی ہیں جنہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا۔ تو اب انہیں کیا ہو گیا ہے کہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے؟ اور یہ "مَثُلَه" بروزن "سَمُرَه" ایسی سزا کو کہتے ہیں جو خود سزا اور سزا پانے والے کے درمیان مشابہت رکھتی ہو۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: "وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (شوریٰ / ۴۰) اور برائی کا بدلہ تو ویسی ہی برائی ہے۔

کلمہ توحید کااعراب

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے خطبے کے دوران فرمایا ہے کہ "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" تو یہاں پر "لا" نفی جنس کیلئے ہے اور اسے "لا تبرئیہ" بھی کہتے ہیں۔ "الٰہ" اس کا "اسم" اور مبنی بر فتح ہے۔ یہ بات تو یہاں تک مسلّم ہے۔ لیکن اختلاف اس بات میں ہے کہ اس کی "خبر" کہاں ہے؟ تو کچھ اس بارے میں کہتے ہیں کہ وہ محذوف ہے جس طرح عام معمول کے مطابق ہوتا ہے کہ جب خبر معلوم ہو تو اسے عام طور پر حذف کر دیتے ہیں۔ جیسے "لَافَوْتَ" اور "لَاضَيْرَ" ہے۔ جس کی اصل "لَافَوْتَ لَهُمْ" اور "لَا

ضَيْرَ عَلَيْنَا" ہے۔ یہ موقف بنی تمیم اور بنی طائی کا ہے۔ لیکن انہوں نے ہی "لا الٰہ" کی محذوف خبر کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں پر محذوف خبر "مَوْجُوْدٌ" ہے۔ لیکن اس نظریئے کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا گیا ہے کہ بر حق معبود کی نفی امکان کے ساتھ غیر اللہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ "امکان"، "وجود" سے عام ہوتا ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ لفظ "ممکن" اس کی خبر ہے تو گویا کلمہ یوں ہے "لا الٰہ مُمْكِنٌ الاَّ اللّٰهُ" لیکن اسے بھی مسترد کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس میں اس کے بالفعل وجود کا اقتضا نہیں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ "مُسْتَحِقٌّ لِلْعِبَادَةِ" محذوف ہے۔ لیکن اسے بھی تسلیم نہیں کیا گیا کیونکہ اس سے مطلقاً کئی خداؤں کی نفی نہیں ہوتی۔ جبکہ ابو حیان کہتے ہیں کہ "لَنَا" محذوف ہے یا "فِي الْوُجُوْدِ" محذوف ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی اقوال ہیں۔

جار اللہ زمخشری کلمہ شہادت کی ایک لطیف پیرائے میں ترکیب کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: "مفسرین نے اس طرح کہا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ "لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" ایک کلام تام ہے اور اس میں کوئی کلمہ محذوف نہیں ہے۔ اور اصل میں ہے "اللّٰهُ اِلٰهٌ" پہلا کلمہ مبتدا اور دوسرا خبر ہے، جیسے کہا جاتا ہے "زَيْدٌ مُنْطَلِقٌ"، پھر اس پر کلمہ حصر "اِلاَّ" لایا گیا ہے اور خبر کو مبتدا پر مقدم کیا گیا ہے اور اسے "لا" کے ساتھ مرکب کیا گیا ہے، بالکل ویسے ہی ہے جیسے "لاَ رَجُلَ فِي الدَّارِ" میں مرکب کیا گیا ہے۔ تو اس طرح سے "اللہ" مبتدا ہے لیکن مؤخر اور "اِلٰه" خبر ہے لیکن مقدم۔ اور یہی فارمولا اسی قسم کے دوسرے کلموں کیلئے بھی اختیار کیا جائے گا، جیسے "لاَ سَيْفَ اِلاَّ ذُوالْفِقَارُ وَ لاَ فَتىٰ اِلاَّ عَلِيٌّ"۔ شہید علیہ الرحمہ نے "روضہ بہیہ" میں اس کی نسبت، دونوں محققین کی طرف دی ہے اور فرمایا ہے: "بعض اوقات اس قول کو ترجیح دی جاتی ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اس میں حذف سے بھی بچ جاتے ہیں اور جس لبدال کا مبدل منہ کی طرف لانا جائز نہیں ہوتا اس سے بھی اجتناب ہو جاتا ہے، اور جمہور کا بھی یہی قول ہے اور اخبار و روایات میں بھی اسے ہی اپنایا گیا ہے اور مرفوع کو اس کی خبر بنایا گیا ہے۔

<u>قول مؤلف</u>: عقلیں جب خداوند سبحان کے دریائے معرفت میں غرق ہو جائیں اور اذہان و افہام جب اس کی کنہ حقیقت کی معرفت سے عاجز آ جائیں۔ بڑے بڑے صاحبان عقل و دانش اس تک رسائی سے قاصر اور صاحبان ادب لفظ جلالہ (اللہ) کی تحقیق سے _ جو اس کی ذات کیلئے وضع کیا گیا ہے اور جامع ہے اس کی تمام صفات کمال و جلال کا _ عاجز آ جائیں تو پھر حق بنتا ہے کہ اس طیب و مبارک کلمہ کے بارے میں اس قدر اختلاف کریں اور اس کی اصل حقیقت تک رسائی سے تھک ہار جائیں اور اس کے اصل معنی کے ادراک سے عاجز آ جائیں کہ جس کی توحید کو نہ بلند پرواز ہمتیں پا سکتی ہیں، نہ ہی عقل و فہم کی گہرائیاں اس کی تہہ تک پہنچ سکتی ہیں۔

البتہ حقیر کی نظر قاصر میں جو چیز آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس موقع پر یہ کہا جائے گا کہ اس بات میں تو کوئی ابہام نہیں کہ کلمہ کا مقصد اس کی ذات کی وحدانیت اور فردانیت کا اقرار و اعلان ہوتا ہے۔ لہذا یہ کلمہ ان عوام الناس کے نزدیک کہ جن کے اذہان ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک اور صاف ہوتے ہیں اور ان کے غرائز صاف اور سچے ہوتے ہیں، جب ان کے سامنے یہ کلمہ پیش کیا جاتا ہے تو اس سے ان کا ذہن فوراً اس بات کی طرف جاتا ہے کہ کائنات میں سوائے خداوند سبحان کے اور کوئی معبود نہیں اور بس۔ اور ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ دنیا میں کوئی اور بھی خدا ہو سکتا ہے جو موجود نہیں ہے یا کوئی اور معبود مستحق عبادت نہیں ہے۔ مثلاً جب ان

ے کہا جائے: "لَاسَیْفَ اِلاَّ ذُوالْفِقَار" تو ان کا ذہن فوراً حضرت علی علیہ السلام کی تلوار کی طرف جائے گا اور وہ یہ نہیں سوچیں گے کہ دنیا میں کوئی اور تلوار بھی ہو سکتی ہے جو دائرہ عدم میں ہو اور اس پر تلوار کا نام صادق آئے"۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ذہن اور دل ہر طرح کے شک و شبہ اور احتمالات سے خالی ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل خطرات اور مختلف آراء سے خالی نہیں ہوتے اور دلائل و براہین عقلیہ و نقلیہ سے مانوس ہوتے ہیں تو وہ اس کلمہ کے بارے میں سوچ و بچار کرتے اور رائے دیتے ہیں اور مبتدا کی خبر "ممکن" کو مقدر یا محذوف بتاتے ہیں اور اس بارے میں وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں............ اس بارے میں تفصیلی بحث ہے ہم نے بقدر ضرورت یہاں پر اسے نقل کیا ہے: از مترجم۔ ....

"وَحْدَہٗ" حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ جبکہ بعض علمائے نحو کہتے ہیں کہ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا فعل محذوف ہے، اور پورا جملہ مل کر حال بن رہا ہے اور وہ ہے "یَنْفَرِدُ وَحْدَہٗ" بہر حال صورت خواہ کچھ بھی ہو یہ حال ہے اور مضمون جملہ کی تاکید بن رہا ہے، جیسے کہا جاتا ہے "زَیْدٌ اَبُوْكَ عَطُوْفًا"۔ البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جملہ سے مراد "توحید فی الذات" ہو اور حال سے مراد "توحید فی الصفات" ہو اور "لَا شَرِیْكَ لَہٗ" کا جملہ، حال کے بعد ایک اور حال اور یہ تاکید کے بعد ایک اور تاکید ہو، یا اس سے مراد "توحید فی الافعال" ہو۔

"مُمْتَحَنًا" اور "مُعْتَقَدًا" دونوں صفتیں ہیں۔ اور "نَتَمَسَّكُ" کا جملہ بھی صفت ہے۔ اور "اَرْسَلَہٗ" کا جملہ حال بھی ہو سکتا ہے اور صفت بھی۔ "اِزَاحَۃً"، "اِحْتِجَاجًا"، "تَحْذِیْرًا" اور "تَخْوِیْفًا" مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔

کلمہ توحید کے فضائل

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام حمد باری تعالیٰ کے ساتھ ہی اس کی توحید کی شہادت دیتے ہوئے فرماتے ہیں (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو یکتا اور لاشریک ہے) یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توحید کے بارے میں ادا ہونے والے تمام کلمات سے بڑھ کر اس کلمہ (شہادت) کی قدر و قیمت اور شان و عظمت زیادہ ہے، اسی لئے ابو سعید خدری روایت کرتے ہیں کہ سرکار رسالت نے فرمایا: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" جیسا کلمہ نہ ہی میں نے کہا اور نہ ہی مجھ سے پہلے والے لوگوں نے"۔ اس کلمہ طیبہ کے بارے میں اہل بیتؑ عصمت و طہارت کی اخبار و احادیث میں بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں جن میں سے چند ایک ہم یہاں پر بیان کرتے ہیں:

۱۔ شیخ صدوقؒ نے کتاب التوحید میں اسناد کے ساتھ ابو حمزہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے فرماتے ہوئے سنا کہ: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت سے بڑھ کر کسی اور چیز کا ثواب نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو کوئی خداوند عزوجل کے برابر ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کے امر میں شریک ہو سکتا ہے"۔ کتاب کافی اور ثواب الاعمال میں بھی اسی طرح ہے۔

۲۔ سکونی نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے ذریعہ سے رسول پاکؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "بہترین عبادت لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا ہے"۔

۳۔ ابی فضیل کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جو بھی شخص مسلم لاالٰہ الااللہ کہتا ہے تو وہ کلمہ آسمان کی طرف بلند ہو جاتا ہے۔ ہر چھت کو شگافتہ کرتے ہوئے ہر برائی کو مٹاتے ہوئے اپنے جیسی دوسری نیکیوں تک جا پہنچتا ہے اور وہیں پر جا ٹھہرتا ہے"۔

۴۔ شیبانی حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے اپنے آباواجداد کے ذریعہ رسول خداؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "خدا کی طرف سے سرخ یاقوت کا ایک ستون ہے جس کا سرا عرش کے نیچے ہے اور ساتویں زمین میں مچھلی کے اوپر ہے۔ جب کوئی بندہ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کہتا ہے تو عرش کانپنے لگ جاتا ہے جس سے ستون میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے مچھلی بھی متحرک ہو جاتی ہے۔ اس پر خداوند عالم فرماتا ہے "میرے عرش رک جا!" تو عرش عرض کرتا ہے "جب تک تو، یہ کلمہ منہ سے نکالنے والے کو نہیں بخشے گا میں ایسے ہی بلتار ہوں گا" اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" میرے آسمان کے رہنے والو! گواہ رہو کہ میں نے لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کہنے والے کو بخش دیا ہے"۔

۵۔ عبدالسلام بن صالح، ابو صلت ہروی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت امام رضا علیہ السلام نیشاپور سے گزر رہے تھے تو اس وقت آپؑ سفید خچر پر سوار تھے، اتنے میں محمد بن رافع، احمد بن حرب، یحییٰ بن یحییٰ، اسحاق بن راہویہ اور بہت سے دوسرے اہل علم آپؑ کی سواری کی باگ تھام کر عرض کرنے لگے آپؑ کو اپنے آباواجداد کا واسطہ دے کر درخواست کرتے ہیں کہ آپؑ ہمیں وہ حدیث بیان فرمائیں جو اپنے والد سے سنی ہے۔ یہ سن کر آپؑ نے اپنا سر عماری سے باہر نکالا جس پر ریشم کی منقش چادر پڑی ہوئی تھی، تو فرمانے لگے: "مجھ سے میرے والد عبد صالح حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے ارشاد فرمایا، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد حضرت امام جعفر صادقؑ نے بیان فرمایا انہوں نے کہا کہ مجھ سے میرے والد حضرت امام محمد باقرؑ نے کہا، انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے میرے والد حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا، انہوں نے کہا مجھ سے میرے والد بزرگوار سید شباب اہل الجنۃ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا، انہوں نے کہا میں نے اپنے والد امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ سے سنا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت رسول خداؐ سے سنا، انہوں نے فرمایا کہ خداوند جل جلالہ فرماتا ہے کہ "یقیناً میں ہی اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی معبود نہیں لہذا تم میری عبادت کرو، تم میں سے جو بھی خلوص کے ساتھ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ لے آئے گا وہ میرے قلعہ میں داخل ہو جائے گا اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے بچ گیا"۔

ایک اور روایت میں بھی اسی طرح ہے لیکن اس کے آخر میں ہے کہ جب سواری آگے کو چلنے لگی تو امام رضاؑ نے ہمیں بلند آواز سے کہا: "لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ اور ان شرطوں میں سے میں بھی ہوں"۔

چنانچہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ صدوقؒ نے فرمایا: "شرطوں میں سے ایک شرط حضرت امام رضاؑ کا اقرار بھی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کے بندوں کے امام ہیں اور ان کی اطاعت بندوں پر فرض ہے"۔

۶۔ ثواب الاعمال میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "خداوند جل جلالہ نے حضرت موسیٰ بن عمرانؑ سے فرمایا: "موسیٰ! میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر تمام آسمان اور ان کے رہنے والے اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھ دی

جائیں اور لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ والا پلڑا بھاری ہو گا"۔ اسی طرح کی روایت کتاب "التوحید" میں بھی ہے۔

۷۔ جابر (بن عبداللہ انصاری) حضرت ابو جعفر (امام محمد باقر علیہ السلام) سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسالت مآبؐ نے فرمایا: "اپنے مرنے والوں کو لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کی تلقین کرو کیونکہ یہ کلمہ گناہوں کو ڈھا دیتا ہے" لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! جو شخص اپنی صحت و تندرستی کے دوران یہ کہے؟" تو آنجنابؐ نے فرمایا: "وہ تو اور زیادہ اثر رکھتا ہے اور اس سے بڑھ کر گناہوں کو ڈھاتا ہے۔ کیونکہ کلمہ توحید مؤمن کیلئے اس کی زندگی میں اُنیس ہوتا ہے اس کی موت کے وقت بھی اور اس کے محشور ہونے کے موقع پر بھی"۔ آنحضرتؐ ہی نے فرمایا کہ: "جبرائیلؑ نے کہا "یا محمدؐ! آپؐ دیکھیں گے کہ جس دن لوگ اپنی قبروں سے محشور ہوں گے تو جن کے چہرے سفید اور چمکدار ہوں گے وہ بلند آواز سے کہہ رہے ہوں گے "لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ" اور جن کے منہ کالے ہوں گے وہ پکار رہے ہوں گے "ہائے مصیبت! ہائے موت!"۔

۸۔ عبداللہ بن ولید مرفوع طریقے سے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "جو شخص لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہتا ہے تو اس کیلئے بہشت میں سرخ یاقوت کا درخت لگا دیا جاتا ہے جس کے اُگنے کی جگہ مشک ہو گی، جس کا رنگ سفید اور ذائقہ شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ برّاق اور خوشبو جس کی پاکیزہ ہو گی۔ وہاں پر اس کیلئے پستانوں والی کنواری عورتیں ہوں گی جو ستر لباسوں سے بھی نمایاں ہوں گی" کافی میں بھی اسی قسم کی حدیث ہے۔

اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں، اگر سب کو بیان کیا جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، لہٰذا انہی روایات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ البتہ حضرت امیر المؤمنینؑ بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں (ایسی گواہی جس کا خلوص پرکھا جا چکا ہے) اس کے دل کو خلوص کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے کہ اس کا دل اس شہادت کے اخلاص میں سچا ہے، باطل کے ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے اور شرک کا اس میں شائبہ تک نہیں۔ (اور جس کا نچوڑ بغیر کسی شائبہ کے دل کا عقیدہ بن چکا ہے) یعنی یہ گواہی صمیم قلب سے دی گئی ہے اور زبان دل کی رفیق ہے اور اس کیلئے خلوص کا اعلان کر رہی ہے۔

خلاصۂ کلام، کلمۂ شہادت کیلئے مذکورہ دو صفات، اس کے مرتبہ کمال پر فائز ہونے اور شہادت کے ہر قسم کے شک و شبہ اور شرک و دیگر آلودگیوں سے پاک اور صاف ہونے کی طرف اشارہ ہیں اور توحید کے باب میں بھی اسی مرتبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہ گئی وہ شہادت جو صرف زبان سے صادر ہوتی ہے اور زبان دل کی ترجمانی نہیں کرتی تو اس سے انسان کا گوشت و پوست تو پاک ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں اسے اس کا کوئی ثمر نہیں ملے گا۔ ثمر تو صرف خلوص دل کے ساتھ اداشدہ شہادت ہی کا ملے گا۔ یہی وجہ ہے آنحضرتؐ نے بروایت "التوحید" کے ارشاد فرمایا: "میں نے جو دیکھا ہے وہ یہ کہ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ ایک ایسا عظیم کلمہ ہے جس کی خدا کے نزدیک بڑی عزت ہے، کیونکہ جو شخص اسے خلوص دل کے ساتھ ادا کرتا ہے وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور جو جھوٹ کے طور پر ادا کرتا ہے اس کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں البتہ اس کا انجام جہنم ہوتا ہے"۔ کتاب "التوحید" ہی میں ہے کہ زید بن ارقم حضرت رسول خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ: "جس شخص نے خلوص دل کے ساتھ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہا تو جنت میں چلا جائے گا۔ اور اخلاص

سے مراد یہ ہے کہ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ نے اسے خدا کی حرام کردہ چیزوں سے روکا ہوا ہوتا ہے"۔ اور ثواب الاعمال میں بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ التوحید اور ثواب الاعمال میں ہے کہ جابر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "صفا اور مروہ کے درمیان حضرت جبرائیلؑ میرے پاس آکر کہنے لگے کہ "یا محمدؐ! آپؐ کی امت میں سے اس شخص کیلئے خوشخبری ہے جو خلوص کے ساتھ "لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ" کہتا ہے"۔ کافی میں ہے کہ ابان بن تغلب کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "ابان! جب تم کوفے جاؤ تو وہاں جا کر یہ حدیث بیان کرو کہ "جو شخص خلوص دل کے ساتھ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کی گواہی دیتا ہے اس کیلئے جنت واجب ہو جاتی ہے"" میں نے عرض کیا" وہاں پر میرے پاس ہر قسم کے لوگ آتے جاتے ہیں تو کیا ان سے بھی بیان کروں؟"۔ امامؑ نے فرمایا: : "ہاں ابان! بات دراصل یہ ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور خداوند تعالیٰ اولین و آخرین میں سے ہر ایک کو جمع کرے گا، تو ان سے لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کو سلب کرلے گا سوائے ان لوگوں کے جو اس امر (ولایت) پر ہیں"۔ اور سلب سے مراد یہ ہے کہ ان کا کلمہ انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا، کیونکہ جیسا کہ امام رضا علیہ السلام کی طرف سے بیان شدہ حدیث میں بیان ہو چکا ہے کہ امامت توحید کیلئے شرط ہے کیونکہ امام رضاؑ نے فرمایا کہ "بِشَرْطِهَا وَ اَنَا مِنْ شُرُوْطِهَا" یہ شرائط کے ساتھ ہے اور میں ان شرائط میں سے ایک ہوں۔

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (زندگی بھر ہم اس سے وابستہ رہیں گے اور اس کو پیش آنے والے خطرات کیلئے ذخیرہ بنا کر رکھیں گے) کیونکہ یہی چیز مؤمن کی زندگی اور اس کے مرنے کے بعد اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت اس کا مونس ہوتی ہے، جیسا کہ ثواب الاعمال کی روایت میں بیان ہو چکا ہے، اور آخرت کے ہولناک اور شدید ترین خطرات کیلئے ذخیرہ ہے۔ ابھی ثواب الاعمال اور التوحید کی روایت میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا کہ اگر ساتوں آسمان اور ان کے رہنے والوں کے ساتھ اور تمام سات زمینوں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کو دوسرے پلڑے میں تو میرے نزدیک لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ والا پلڑا بھاری ہوگا۔ اور اس سے بڑھ کر اور کونسا ذخیرہ ہے جو کام آمد ثابت ہو؟

امیر المؤمنینؑ نے اس تمسک اور ذخیرہ کی چار وجوہات بتائی ہیں۔ جن میں پہلی وجہ وہ ہے کہ جس کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا ہے (یہی کہ یہ ایمان کی مضبوط بنیاد ہے) یعنی اس کا عقیدہ اور دوسری وہ چیزیں کہ جن پر مؤمن کو عقیدہ رکھنا چاہئے۔ یا یہ کہ وہ ایمان کی ایسی بنیاد ہے جس کے بارے میں سخت جدوجہد کی ضرورت ہے، جیسا کہ لغت کے بیان میں اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ (اور) دوسری چیز (حسن عمل کا پہلا قدم ہے) یعنی احسان اور حسن عمل کا آغاز اور اس کی ابتداء ہے۔ فاتحہ کو احسان کی طرف اضافت، جزء کی کل کی طرف اضافت ہے، جیسے کہا جاتا ہے "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ" تو اس وقت لفظ فاتحہ مصدر بمعنی فتح کے ہوگا جیسے لفظ "كَاذِبَةٌ" بمعنی کذب کے ہوتا ہے۔ تو اسی بنیاد پر لفظ "احسان" سے مراد توحید اور شرعی اصول ہوں گے۔ اس کے صحت اطلاق پر وہ روایت دلالت کر رہی ہے جسے "التوحید" میں موسیٰ بن اسماعیل بن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے بیان کیا گیا ہے، اور وہ اپنے آباو اجداد سے بیان کرتے ہیں کہ امیر المؤمنینؑ نے "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلاَّ الْإِحْسَانُ" (رحمٰن / ۶۰) نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ اور بھی ہے؟۔ کے بارے میں فرمایا: "جس پر اللہ تعالیٰ نے کلمہ توحید کے ذریعے انعام فرمایا اس کی جزا جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں"۔

البتہ یہاں پر ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "فاتحہ" صفت ہے "فتح" کی جو "غلق" (بند کرنے) کی ضد ہے، تو پھر ایسی صورت میں اضافت لامیہ ہوگی اور اس کے معنی ہوں گے "شہادت، احسان و انعام کے دروازے کھولنے کا باعث اور ان کی کنجی ہے، کیونکہ بندہ اسی کے ذریعے ابدی فیوض و برکات اور سرمدی نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے"۔ اس پر گزشتہ روایات کے علاوہ احتجاج طبرسیؒ کی یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے امیر المؤمنینؑ سے نقل کیا گیا ہے، حضرت امیرؑ فرماتے ہیں: "جو شخص خلوص نیت کے ساتھ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہتا ہے، اس کے گناہ اسی طرح مٹا دیئے جاتے ہیں جس طرح سیاہ حروف سفید تختی سے مٹا دیئے جاتے ہیں۔ اور جب دوسری مرتبہ خلوص کے ساتھ کہتا ہے تو آسمان کے دروازے اور ملائکہ کی صفوف شگافتہ ہو جاتی ہیں، حتی کہ فرشتے ایک دوسرے سے کہتے ہیں عظمت پروردگار کے آگے سرنگوں ہو جایئے۔ اور جب تیسری مرتبہ خلوص کے ساتھ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہتا ہے تو عرش تک پہنچے بغیر نہیں رکتا، اور خداوند متعال اسے فرماتا ہے، خاموش ہو جا کہ میں نے تیرے قائل کے تمام گناہ بخش دیئے ہیں"۔ پھر امامؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ" (فاطر / ۱۰) اس (خدا) کی بارگاہ تک اچھی باتیں بلند ہو کر پہنچتی ہیں، اچھے کام کو وہ خود بلند فرماتا ہے۔ یعنی جب اس کا عمل خالص ہوگا تو بلند ہوگا"۔

یہاں تک تو ان کا کلام تھا البتہ میرے نزدیک ایک تیسرا معنی بھی ہے وہ یہ کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ابتدا ہی سے انسان محسن یعنی نیکوکار ہو بالفاظ دیگر اس کی ابتدا ہی نیکی سے ہو جو بدی اور گناہ کے مقابل میں ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (اور اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے) اور یہ تو واضح سی بات ہے کلمہ توحید کی خالصانہ شہادت سے رب راضی ہوتا ہے اور اسی سے خلد بریں کی راہیں کھلتی ہیں۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ آپؑ فرماتے ہیں (شیطان سے دوری کا سبب ہے) اور یہ بھی واضح ہے کیونکہ شیطان ملعون کا اصل مقصود تو انسان کو گمراہ کرنا، بہکانا اور کفر پر آمادہ کرنا ہوتا ہے، جبکہ خلوص دل سے دی گئی کلمہ توحید کی شہادت سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور اس کی کید و مکر اور لور چالوں کے سارے جال ٹوٹ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب اسی ملعون نے اللہ تعالیٰ کے سامنے گستاخی کرتے ہوئے کہا تھا: "فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ" (ص / ۸۲) تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا۔ تو بطور استثناء یہ بھی کہا تھا کہ: "اِلاَّ عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ" (ص / ۸۲) سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں خلوص عطا کیا گیا ہے۔

شیخ احمد بن فہد حلیؒ کی کتاب "عدۃ الداعی" میں ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ہر دل پر شیطان نے قبضہ کیا ہوا اور گھٹنے ٹیکے ہوئے ہیں، جب بندہ خدا کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور گھل پگھل جاتا ہے، اور جب ذکر الٰہی کو ترک کر دیتا ہے تو پھر (ایک اور) شیطان اسے جھپٹ کر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اسے اغوا کر کے لے جاتا ہے، گمراہ بنا دیتا ہے اور سرکشی کے سبق پڑھاتا ہے"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ فرماتے ہیں: "فرزند آدم کے دل پر شیطان نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، اس کی سور کی طرح سونڈ ہے جس کے ذریعہ وہ انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے اور دنیا پر اکساتا اور حرام کے ارتکاب کی ترغیب دیتا رہتا ہے، لیکن جب بندہ اپنے خدا کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا اور غائب ہو جاتا ہے"

شہادت رسالت

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے توحید کی شہادت کے ساتھ ہی ساتھ رسالت کی شہادت ان الفاظ کے ساتھ دی ہے کہ (میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کے عبد اور رسول ہیں) اور اس کی کئی وجوہات ہیں :

۱۔ مرتبہ رسالت، مرتبہ توحید کے فوراً بعد آتا ہے، جس طرح عالم وجود میں آنحضرتؐ کا دوسرا مقام ہے، اگرچہ عالم وجود میں خداوند عالم ایسا اول ہے کہ جس کا کوئی ثانی نہیں، لیکن "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کے مصداق اس کائنات میں دوسرے آپؐ ہی ہیں اس لئے آپؐ کے مقام و مرتبہ رسالت کی گواہی بھی توحید کے بعد ہوگی۔ اور یہ حقیقت واقعہ ہے۔

۲۔ تخلیق انسانیت کا مقصد ہی ذات توحید کا عرفان اور اس کیلئے اخلاص، نیز سلوک الی اللہ یا بارگاہ ایزدی تک رسائی ہے۔ تو پھر ایسی صورت میں کسی ایسے راہنما اور ہادی کی ضرورت ہے جو وہاں تک پہنچائے اور ایسے مبلغ کی ضرورت ہے جس کے قول کی تصدیق کی جاسکے اور جس کی رسالت کا اقرار کیا جائے۔ لہذا ضروری ہو جاتا ہے کہ رسالت کی تصدیق کو وحدانیت کی تصدیق کے ساتھ ملایا جائے تاکہ وہاں تک رسائی ہو سکے اور راستے طے پائے جاسکیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ حضرت محمدؐ ہمیں توحید تک پہنچاتے اور خدا تک بلاتے ہیں، اور وہ خدا کا دروازہ ہیں اور مراتب توحید کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں، اور آپؐ ہی کے وجود مبارک اور دم قدم سے معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے اور اخلاص تام پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

۳۔ اس لئے بھی کہ خود خداوند متعال نے بھی کلمہ توحید اور کلمہ رسالت کو آپس میں جوڑا ہوا ہے اور نورانی خط کے ساتھ پایہ عرش، طبقات سماوی، اطراف زمین اور شمس و قمر کی پیشانیوں پر لکھ دیا ہے "لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" جیسا کہ احادیث مبارکہ اس کی مؤید ہیں، لہذا ربانی قلم اور نورانی سطور کی اقتدا کرتے ہوئے دونوں شہادتوں کو آپس میں ملانا ہوگا۔

کلمہ توحید و رسالت کے فضائل

توحید اور رسالت کی باہمی شہادت کے بہت سے فضائل ہیں جن میں سے کچھ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :

۱۔ کافی میں ابی عبیدہ حذاء حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا : "جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ کہتا ہے تو اس کیلئے ایک ہزار نیکی لکھ دی جاتی ہے"۔

۲۔ ثواب الاعمال میں ہے بشر اوزاعی حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں آپؑ نے فرمایا : جو شخص صرف اَشْهَدُ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ کہے لیکن مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت نہ دے تو اس کیلئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جو شخص، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی کہے تو اس کیلئے چالیس لاکھ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں"۔

۳۔ سہیل بن سعد انصاری کہتے ہیں کہ : "میں نے حضرت رسول خداؐ سے خداوند عالم کے اس قول " وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا " (قصص / ۴۶) اور نہ تم طور کے کسی جانب اس وقت موجود تھے جب ہم نے (موسیٰ کو) آواز دی۔ کے بارے میں پوچھا، تو آپؐ نے فرمایا : "خداوند عالم نے انسانی مخلوق کو خلق کرنے سے دو ہزار سال پہلے درخت "آس" کو پیدا کیا اور اس کے

پتوں پر لکھ دیا اور پھر اسے عرش پر رکھ دیا، پھر اس نے آواز دی "اے امت محمدؐ! میری رحمت، میرے غضب سے سبقت کر گئی ہے، میں نے تمہیں مانگنے سے پہلے عطا کیا اور تمہارے استغفار کرنے سے پہلے تمہیں معاف کر دیا، لہٰذا تم میں سے جو بھی شخص اس حالت میں میرے پاس پہنچے گا کہ وہ میری توحید اور میرے محبوب محمدؐ کی عبدیت اور رسالت کی گواہی دے رہا ہوگا تو میں اپنی رحمت سے (اسے سیدھا) بہشت میں بھیج دوں گا"۔

۴۔ احمد بن فہد حلی کی کتاب عدۃ الداعی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ پیغمبر خداؐ نے فرمایا: "جس شخص کو یہ بات اچھی لگتی ہو کہ وہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ کے حضور اس حالت میں پہنچے کہ اس کے اعمال نامے میں "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ" کی شہادت درج ہو اور اس کیلئے بہشت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جائیں اور اس سے کہا جائے کہ اے ولی خدا! جس دروازے سے چاہو بہشت میں جاؤ، تو چاہئے کہ صبح و شام یہ دعا پڑھتا رہے:

اُكْتُبَا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَشْهَدُ اَنْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ عَلٰى ذٰلِكَ اَحْيٰى وَ عَلٰى ذٰلِكَ اَمُوْتُ وَ عَلٰى ذٰلِكَ اُبْعَثُ حَيًّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اِقْرَئَا مُحَمَّدًا مِنِّي السَّلَامَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ اللَّيْلَ مُظْلِمًا بِقُدْرَتِهٖ وَ جَاءَ بِالنَّهَارِ مُبْصِرًا بِرَحْمَتِهٖ خَلْقًا جَدِيْدًا مَرْحَبًا بِالْحَافِظِيْنَ۔ یہ تو دائیں طرف کے اور بائیں طرف منہ کر کے کہے وَ حَيَّاكُمَا اللّٰهُ مِنْ كَاتِبِيْنَ۔

اے دونوں فرشتو! لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک ہے اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ قیامت آنے والی ہے اس میں شک نہیں ہے یقیناً اللہ تعالیٰ مردوں کو ان کی قبروں سے دوبارہ اٹھائے گا، اسی عقیدے پر میں زندہ ہوں، اسی پر میری موت آئے گی اور اسی پر ہی میں دوبارہ اٹھایا جاؤں گا انشاء اللہ۔ تم دونوں حضرت رسول خداؐ تک میرا اسلام پہنچا دینا، حمد و ثنا ہے اس اللہ کیلئے جو اپنی قدرت کے ساتھ تاریک رات کو لے گیا اور اپنی رحمت کے ساتھ روشن دن کو لے آیا اور نئی تخلیق عطا کی، اے دونوں محافظ فرشتو! مرحبا (یہ داہنی طرف کہے گا، اور بائیں طرف منہ کر کے کہے) اے دونوں نامہ اعمال لکھنے والے خدا تمہیں زندہ رکھے۔

بابرکت نام۔ "محمد" ۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم مبارک "محمدؐ" سب سے پہلے خداوند متعال ہی نے رکھا، اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کے سامنے کچھ صورتیں لائی گئیں تو خداوند عالم نے ان کا تعارف یوں کرایا: "یہ محمدؐ ہے اور میں اپنے افعال میں "حمید" و "محمود" ہوں، یہ نام میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے......... " یہ مکمل روایت پہلے خطبے کی گیارہویں فصل میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔

ازاں بعد آپ کا یہ نام آپؐ کے جد امجد حضرت عبدالمطلبؑ نے ولادت کے ساتویں دن رکھا، اس نام کا الہام ان کو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ہوا۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اس سے شگون بھی لیا کہ آپ کی کثیر حمیدہ صفات کی وجہ سے خلق خدا کثرت سے آپ کی تعریف و توصیف کرے گی۔ چنانچہ جب جناب عبدالمطلبؑ سے پوچھا گیا کہ: "آپ نے اپنے فرزند کا نام "محمدؐ" کیوں رکھا ہے حالانکہ یہ نام تو آپ کے آباؤاجداد میں سے کسی کا تھا اور نہ ہی آپ کی قوم قبیلے میں اس نام کا کوئی شخص گزرا ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "اس توقع پر کہ اس کی حمد و اور تعریف آسمان اور زمین میں کی جائے!" (الحمد اللہ، اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔ از مترجم)

نام۔ محمدؐ ۔ کی عظمت

۱۔ وسائل الشیعہ میں کشف الغمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے آباواجداد کے ذریعہ سے ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "جب قیامت کا دن ہو گا تو ایک منادی آواز دے گا "جس جس کا بھی نام "محمد" ہے وہ کھڑا ہو جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کی برکت سے جنت میں چلا جائے"۔

۲۔ کافی میں ہے کہ ہمارے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے سب سے پہلے ہم اس کا نام "محمد" رکھتے ہیں۔ جب ایک ہفتہ گزر جاتا ہے تو پھر یا تو اس کا نام تبدیل کر دیتے ہیں یا وہی رہنے دیتے ہیں"

بہت سی احادیث و روایات اس بارے میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور گرامیؐ کے اسم مبارک پر نام رکھنے کے استحباب کو بیان کیا گیا ہے۔ مزید معلومات کیلئے احادیث کی کتابوں میں اولاد کے احکام کے ابواب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

"عبدہ" پہلے ۔ "رسولہ" بعد میں کیوں؟

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کلمہ شہادت میں آنحضرتؐ کی توصیف میں "عبدہ" کو پہلے کہا جاتا ہے۔ اور "رسولہ" کو بعد میں اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام عبودیت، مرتبہ رسالت سے مقدم ہے۔ اور اس کی توثیق اس روایت سے ہوتی ہے جو کافی میں زید شحام کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے سنا آپؑ فرما رہے تھے کہ: "اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو نبی بنانے سے پہلے عبد قرار دیا اور رسول بنانے سے پہلے نبی بنایا اور خلیل بنانے سے پہلے رسول بنایا اور امام مقرر کرنے سے پہلے خلیل بنایا جب ان میں مذکورہ تمام صفات جمع ہو گئے تو خداوند متعال نے فرمایا: "اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" (بقرہ / ۱۲۴) بے شک میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں" ان کی آنکھوں میں امامت کی عظمت بہت زیادہ تھی لہذا عرض کیا: "وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" "کیا میری ذریت سے بھی (امام بنائے گا)؟ فرمایا: "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ" میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچ پائے گا (ایضا) گویا اس سے یہ بات بتانا مقصود ہے کہ "سفیہ کبھی" "تقی" کا امام نہیں بن سکتا۔" اسی طرح کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں جو انشاء اللہ مسئلہ امامت کی تحقیق کے دوران اپنی مناسب جگہ پر بیان ہوں گی۔

حضرت امیر المؤمنین علیؑ عظمت رسول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (اللہ نے انہیں شہرت یافتہ دین کے ساتھ بھیجا) ایسا دین جس کی شہرت سابقہ امتوں اور گزشتہ صدیوں سے چلی آ رہی تھی (اور منقول شدہ نشان کے ساتھ بھیجا) یہ جملہ

پہلے جملے کی تاکید ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دین ان لوگوں کیلئے نشان راہ ہے جو حظیرۃ القدس کی طرف گامزن ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس دن کا "ماثور" یعنی ترجیح شدہ ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسے دوسرے تمام ادیان پر برتری حاصل ہے، یا پھر یہ کہ یہ دین نسل در نسل اور قرن در قرن منقول ہوتا چلا آرہا ہے اور اقوام و ملل اس دین سے ہدایت حاصل کرتی چلی آرہی ہیں۔ (اور یہ لکھی ہوئی کتاب ہے) جسے انفس و آفاق کے وجود میں آنے سے پہلے نور کے قلم کے ساتھ لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے۔ اور جب اس نے الفاظ و حروف کا جامہ پہنا اور آواز کی صورت اختیار کی تو اسے اوراق اور صفحات کے سینے پر لکھا جانے لگا۔ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (ضو فشاں نور اور چمکتی ہوئی روشنی کے ساتھ بھیجا) ممکن ہے کہ ان دونوں جملوں سے مراد "کتاب" ہی ہو، تو پھر ایسی صورت میں یہاں پر "عطف تاکیدی" ہوگا، جیسا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: "قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ "(مائدہ / ۱۵) تو خدا کی طرف سے ایک (چمکتا ہوا) نور اور کھل کر بیان کرنے والی کتاب (قرآن کی صورت میں) آچکی ہے، جو لوگ خدا کی خوشنودی کے پابند ہیں ان کی تو خدا اس کے ذریعہ سے نجات کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

یہ عقلی نور ہے جس کے ذریعے سے مبدا و معاد کے حالات منکشف ہوتے ہیں، اشیاء کی حقیقتوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسی روشنی ہے جس کے ذریعے سے بیابان جسمانیت اور بحر نفوس کی تاریکیوں میں راہیں تلاش کی جاسکتی ہیں، دار آخرت کے مسافروں اور جنت و نور کے راہیوں کیلئے راستے نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے مراد "علم نبوت" ہے۔ کیونکہ نور نبوت وہی تو ہے جسے وحی الٰہی سے حاصل کیا گیا ہے اور جہالت کی تاریکیوں میں اس نور سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور ایسی روشنی ہے جس سے گمراہی کے بیابانوں میں ہدایت کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں (اور فیصلہ کن امر) کے ساتھ بھیجا ہے۔ ایسا امر بالکل واضح ہے اور حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالتا ہے اور برحق فیصلے کرتا ہے۔ امیر المؤمنینؑ کا یہ جملہ خداوند عالم کے اس قول کی طرف نہایت ہی لطیف اشارہ ہے خداوند عالم فرماتا ہے: "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (حج / ۹۴) جس بات کا آپ کو حکم دیا جائے اسے کھول کر بیان کریں۔

بعثت کے اسباب

اس کے بعد حضرت امیر علیہ السلام نے بعثت کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا (تاکہ شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جاسکے) یعنی آپ کی بعثت اور آپ کو مبعوث برسالت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے باطل شبہات کا ازالہ کیا جائے اور فاسد شکوک و شبہات کو مٹایا جائے (اور دلائل کے زور سے حجت تمام کی جائے) دلائل بھی ایسے جو معجزات قاہرہ اور براہین ساطعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (اور آیتوں کے ذریعے ڈرایا جائے) آیات قرآنی اور خطابات شرعیہ سے لوگوں کو خوف خدا دلایا جائے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آیات سے مراد نافرمان اور سرکشوں پر نازل ہونے والے وہ عذاب ہیں جو خدا کے قہر و غلبے کی علامت ہیں اور عبرت حاصل کرنے والوں کیلئے نشان عبرت ہیں، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے "وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ" (حجر / ۷۴۔۷۵) اور ہم نے اس کے اوپر پتھر برسا دیئے، اس میں یقیناً تاڑ جانے والوں کیلئے قدرت کی

بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور فرماتا ہے "فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ "(یونس / ۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تا کہ تو اپنے بعد والوں کیلئے عبرت کا باعث ہو، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں۔

اس تاویل کی بنا پر امیر المؤمنینؑ کا یہ جملہ (اور عقوبتوں سے خوف زدہ کیا جائے) سابقہ جملے کیلئے عطف تاکید کے طور پر ہوگا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایسی عقوبتوں کے ذریعے خوف زدہ کیا جائے جو مجرمین کو ملتی رہی ہیں، شارح بحرانی اور ابن ابی الحدید نے بھی اس جملے کی یہی تشریح اور تفسیر کی ہے۔ بحرانیؒ نے تو صراحۃً جبکہ معتزلی نے اشاروں اشاروں میں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ تفسیر ظاہر کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ حضرتؑ نے "لِلْمَثُلاتِ "فرمایا ہے "بِالْمَثُلاتِ "نہیں۔ جبکہ میرے نزدیک ظاہر ترین صورت یہ ہے کہ اس عبرتناک سے مراد ایسی سزا ہے جو زمانہ جاہلیت میں کسی کو اس کے ناک، کان وغیرہ جیسے اعضا کاٹ کر دی جاتی تھی۔ اور یہ دوران جاہلیت کا ایک شعار تھا جس سے پیغمبر اکرمؐ نے روکا ہے اور ایسی سزا دینے سے ڈرایا ہے، جس طرح کہ اس پر حضرت امیرؑ کی وہ وصیت بھی دلالت کرتی ہے جو آپؑ نے بوقت شہادت حسنین شریفینؑ کو فرمائی تھی۔ جب آپؑ کو ابن ملجم ملعون کی ضرب لگی تھی، آپؑ نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا: "اے اولاد عبد المطلب! ایسا نہ ہونے پائے کہ تم "وہ امیر المؤمنینؑ قتل ہوگئے، امیر المؤمنینؑ قتل ہوگئے" کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کر دو۔ دیکھو! میرے بدلے میں صرف میرا قاتل ہی قتل کیا جائے، اور دیکھو! جب میں اس ضرب سے مر جاؤں تو اس ایک ضرب کے بدلے میں ایک ہی ضرب لگانا اور اس شخص کا مثلہ نہ کرنا یعنی اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹنا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ "خبردار! کسی کے بھی ہاتھ پیر نہ کاٹو، اگرچہ وہ کاٹنے والا کتا ہی ہو"۔

کافی میں اسناد کے ساتھ اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ خداوند عالم اپنی کتاب (قرآن مجید) میں فرماتا ہے "وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ "(بنی اسرائیل / ۳۳) اور جو شخص ناحق قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو (قاتل پر) قصاص کا قابو دیا ہے تو اسے چاہئے کہ قتل (خون کا بدلہ لینے) میں زیادتی نہ کرے۔ وہ کون سا "اسراف" ہے جس سے اس آیت میں روکا گیا ہے؟ "تو امامؑ نے فرمایا: "اللہ نے اس بات سے روکا ہے کہ قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل نہ کیا جائے اور نہ ہی قاتل کا مثلہ کیا جائے یعنی اس کے ہاتھ پیر نہ کاٹے جائیں"۔ اس بارے میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن میں سے بعض کو ہم اسی وصیت نامے کی شرح میں بیان کریں گے، اگر توفیق خداوندی ہمارے شامل حال رہی۔ انشاء اللہ۔

تیسری فصل

بعثت کے بارے میں

وَ النَّاسُ فِيْ فِتَنٍ انْجَذَمَ فِيْهَا حَبْلُ الدِّيْنِ وَ تَزَعْزَعَتْ سَوَارِيْ الْيَقِيْنِ وَاخْتَلَفَ النَّجْرُ وَ تَشَتَّتَ الْاَمْرُ وَ ضَاقَ الْمَخْرَجُ وَعَمِيَ الْمَصْدَرُ فَالْهُدٰى خَامِلٌ وَّالْعَمٰى شَامِلٌ عُصِيَ الرَّحْمٰنُ وَ نُصِرَ الشَّيْطَانُ وَ خُذِلَ الْاِيْمَانُ فَانْهَارَتْ دَعَائِمُهٗ وَ تَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهٗ وَدَرَسَتْ سُبُلُهٗ وَعَفَتْ شُرُكُهٗ اَطَاعُوا الشَّيْطَانَ فَسَلَكُوْا مَسَالِكَهٗ وَ وَرَدُوْا مَنَاهِلَهٗ بِهِمْ سَارَتْ اَعْلَامُهٗ وَقَامَ لِوَائُهٗ فِيْ فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِاَخْفَافِهَا وَ وَطِئَتْهُمْ بِاَظْلَافِهَا وَ قَامَتْ عَلٰى سَنَابِكِهَا فَهُمْ فِيْهَا تَائِهُوْنَ حَائِرُوْنَ جَاهِلُوْنَ مَفْتُوْنُوْنَ فِيْ خَيْرِ دَارٍ وَ شَرِّ جِيْرَانٍ نَوْمُهُمْ فِيْهَا سُهُوْدٌ وَّ كُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ بِاَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَ جَاهِلُهَا مُكْرَمٌ .

(اس وقت حالت یہ تھی کہ)لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جہاں دین کے بندھن شکستہ ،یقین کے ستون متزلزل، اصول مختلف، اور حالات پراگندہ تھے، نکلنے کی راہیں تنگ و تاریک تھیں، ہدایت گمنام اور ضلالت ہمہ گیر تھی (کھلے بندوں) اللہ کی مخالفت ہوتی تھی اور شیطان کی مدد کی جاتی تھی اور ایمان بے سہارا تھا۔ چنانچہ اس کے ستون گر گئے اور اس کے نشان تک پہچاننے میں نہ آتے تھے، اس کے راستے مٹ مٹا گئے اور شاہراہیں اجڑ گئیں، وہ شیطان کے پیچھے لگ کر اس کی راہوں پر چلنے لگے اور اس کے گھاٹ پر اتر پڑے انہی کی وجہ سے اس کے پھریرے ہر طرف لہرانے لگے تھے اور جھنڈے گڑ گئے تھے، ایسے فتنوں میں جو انہیں اپنے سموں سے روندتے تھے اور اپنے کھروں سے کچلتے تھے اور اپنے پنجوں کے بل مضبوطی سے کھڑے ہوئے تھے، تو وہ لوگ ان میں حیران سرگردان، جاہل اور فریب خوردہ تھے۔ ایسے گھر میں جو خود اچھا مگر اس میں بسنے والے برے تھے، جہاں نیند کی بجائے بیداری اور سرمے کی جگہ آنسو تھے۔ اس سرزمین میں عالم کے منہ میں لگام تھی اور جاہل معزز و سرفراز تھا۔

تشریح

"فِتَنٌ" جمع ہے "فِتْنَة" کی جس کے کئی معانی ہیں۔ مثلاً ۱۔ حیرت و سرگردانی، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے "بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ" (قلم/ ٦) تم میں سے کون حیران و سرگردان ہے؟ ۲۔ کسی چیز پر اظہار تعجب کرنا ۳۔ گمراہی ۴۔ گناہ ۵۔ کفر ۶۔ رسوائی ۷۔ عذاب ۸۔ سونے اور چاندی کا پگھلنا ۹۔ گمراہ کرنا ۱۰۔ دیوانگی ۱۱۔ مشقت ۱۲۔ مال ۱۳۔ لوگوں کا مختلف الرائے ہونا۔ چنانچہ اس خطبے میں بہت سے معانی موقع و محل کے لحاظ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ "زَعْزَعَة" ہوا کا درخت کو ہلانا، "سَوَارِيْ" جمع ہے "سَارِيَة" کی جس کے معنی ہیں ستون۔ "نِجْر" نون کے فتحہ، کسرہ اور ضمہ تینوں اعراب کے ساتھ بمعنی اصل کے ہے۔ "خَامِلٌ" گرا ہوا، "خَمَلَ الرَّجُلُ" کے معنی ہیں انسان کا گمنام اور بے قدر ہونا، "خَمَلَ الْمَنْزِلُ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں "گھر کا ڈھہ جانا اور بوسیدہ ہو جانا"۔ "دَعَائِمُ" جمع ہے "دَعَامَةٌ" کی جس کے معنی ہیں گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے والی چیز کہ دیوار گرنے نہ پائے۔ جملہ "وَالنَّاسُ فِيْ فِتَنٍ" کے بارے میں دو احتمال ہیں، ایک تو یہ کہ یہ جملہ حال

ہے اور اس کا عامل "اَرْسَلَهٗ" ہے اور یہی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے، جبکہ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جملہ استینافیہ ہے اور ابتدا کی وجہ سے مرفوع ہے۔ "فِيْ فِتَنٍ" جار اور مجرور مل کر ایک مقدر کے متعلق بن رہے ہیں جو خبر واقع ہو رہا ہے۔

بعثت کے وقت لوگوں کی کیفیت

حضرت امیر المؤمنینؑ اس خطبے میں آنحضرتؐ کے مقصد بعثت پر روشنی ڈال رہے ہیں جیسا کہ سابقہ فصل میں آپ پڑھ چکے ہیں، اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں تو (۔اس وقت حالت یہ تھی۔لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے) اگر اس جملے کو جملہ حالیہ فرض کیا جائے تو اس سے مراد زمانہ بعثت کے لوگوں کی کیفیت ہو گی اور فتنے بھی دوران جاہلیت کے ہوں گے۔ اگر اسے جملہ استینافیہ یعنی نیا جملہ تصور کیا جائے، جیسا کہ ایک احتمال یہ بھی ہے تو اس سے مراد خود ان کے دور کے لوگوں کی مذمت ہو گی، اور فتنوں سے مراد بنی امیہ اور معاویہ کے فتنے ہوں گے۔ لیکن قوی احتمال وہی پہلا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول خداؐ کو اس وقت بھیجا کہ لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، ان کی آراء مختلف تھیں اور خواہشات جدا جدا (جہاں دین کے بندھن شکستہ تھے) اور شرع مبین کی رسی ٹوٹی ہوئی تھی۔ امیر المؤمنینؑ نے دین اور شریعت کو رسی سے تشبیہ دی ہے اس لئے کہ جو بھی اسے مضبوطی سے پکڑتا ہے تو وہ ہر طرح کی لغزش سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ وہ خدائی رسی ہے جسے اللہ نے مضبوطی سے تھامنے کا ان الفاظ میں حکم دیا ہے: "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران / ۱۰۲) اے ایمان والو! خدا سے ڈرو جتنا اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم دین اسلام کے سوا کسی اور دین پر ہرگز نہ مرو۔ اور تم سب کے سب مل کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ یعنی دین خداوندی یا قرآن واہل بیتؑ کے دامن کو مضبوطی سے تھامو، جیسا کہ اس بارے میں بہت سی روایات موجود ہیں۔ صاحب کشاف اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ: "......رسی کی مثال اس لئے دی ہے کیونکہ جو بلند وبالا عمارت سے اترنا چاہے اور مضبوط رسی کا سہارا لے تو وہ اس کے ٹوٹنے سے مطمئن رہتا ہے۔ یا پھر "رسی" استعارہ ہو "خدا کے عہد" سے اور اعتصام سے مراد اس عہد کہ پختگی ہو، تو پھر اس مناسبت سے اس آیت کے معنی یوں ہوں گے کہ "تم سب خدا کی طرف سے مدد خواہی اور اس پر پختہ یقین کے بارے میں سب ایک ہو جاؤ اور اس سے کبھی جدائی اختیار نہ کرو، اور اس عہد کی اجتماعی صورت میں پابندی اختیار کرو جو اس نے اپنے بندوں سے لیا ہے۔ اور وہ ہے ایمان اور اطاعت، یا پھر اس کی کتاب کیونکہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "قرآن، اللہ کی مضبوط رسی ہے جس کے عجائبات ختم ہونے میں نہیں آتے اور اس کی طرف بار بار رجوع کرنے سے وہ بوسیدہ نہیں ہوتا۔ جو اس کے ذریعہ سے بات کرتا ہے وہ سچ کہتا ہے، جو اس پر عمل کرتا ہے وہ ہدایت پا جاتا ہے اور جو اسے مضبوطی سے پکڑتا ہے وہ صراط مستقیم پر جا پہنچتا ہے"۔

البتہ اس سے مراد اگر دین لیا جائے تو وہ بھی اللہ کی مضبوط رسی ہے اور اس کے بندھنوں کے شکستہ ہونے سے مراد مخلوق کا حق سے انحراف، ان کا اس سے تمسک کا فقدان اور راہ راست سے روگردانی ہے۔ اسی لئے (یقین کے ستون متزلزل تھے) یقین سے مراد حق اور یقینی عقائد ہیں اور ستونوں کا متزلزل ہونا کنایہ ہے اس بات سے کہ لوگ یقین پر قائم نہیں تھے۔ اور ان کے عقائد

متزلزل تھے۔ یا پھر کنایہ ہے اس بات سے کہ متدین افراد اس دنیا سے رحلت کر چکے تھے کہ جو دین کا ستون سمجھے جاتے تھے۔ اور دین پر عمل کرنے والے ایسے لوگ جنہیں خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں تھا وہ منقرض ہو چکے تھے۔ (اس وقت اصول مختلف اور حالات پراگندہ تھے) اصلِ جامع تو وہی دین فطرت ہے جس پر اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اور امور دین لوگوں کی خواہشات اور ذاتی آراء کی وجہ سے منتشر ہو چکے تھے۔ جب لوگ شبہات کے فتنوں اور ہلاکتوں میں گھس چکے تھے تو ان سے (نکلنے کی راہیں تنگ اور) وہاں سے (باہر آنے) اور نجات حاصل کرنے (کے راستے تاریک ہو چکے تھے)۔ اس جملے میں "عمیٰ" کو "مصدر" کی طرف مسند کیا گیا ہے مجاز عقلی کے باب سے ہے اور اسے "محل" کی طرف اس لئے مسند کیا گیا ہے "عمی" یعنی اندھا پن در حقیقت آنکھوں کی صفت ہے لیکن مراد اس سے بصیرت کا فقدان ہے گویا معقول کو محسوس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جس طرح مفقود البصر (نابینا) ان مقاصد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جن تک رسائی حس باصرہ کے ذریعہ ممکن ہوتی ہے اسی طرح بصیرت کا فقدان بھی راہ حق سے گمراہی اور حقیقت الامر سے دور ہو جانے کا موجب ہوتا ہے۔ اسی لئے علی امیرؑ فرماتے ہیں کہ (ہدایت گمنام تھی) اور ہدایت کی نشانیاں گر چکی تھیں، ان کے آثار مٹ چکے تھے، اور درایت کے نور بجھ چکے تھے (اور ضلالت ہمہ گیر تھی) گمراہی کے پردے ان کے دلوں پر پڑ چکے تھے، وہ مشترکہ صورت میں شبہات میں پڑے ہوئے تھے اور جہالت کی تاریکیوں کے سمندر میں مل جل کر غوطہ زن تھے۔ ان کی جہالت اور ضلالت کی کیفیت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ (کھلے بندوں اللہ کی مخالفت ہوتی تھی اور شیطان کی مدد کی جاتی تھی) چونکہ ہدایت کے آثار مٹ چکے تھے اور لوگ دل کی تاریکی کا شکار اور خواہشاتِ نفسانی کے پیروکار تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ (ایمان بے سہارا) ہو چکا (تھا)۔ اسی وجہ سے (اس کے ستون گر گئے) تھے (اور اس کے نشان تک پہچاننے میں نہ آتے تھے) اور اس کے آثار تبدیل ہو چکے تھے۔

"ایمان کے ستونوں اور نشانات" سے مراد دین کے علمبردار اور حق کی دعوت دینے والے ہیں۔ اور ان کا گرنا کنایہ ہے اس بات سے کہ یا تو یہ لوگ موجود نہیں تھے۔ یا اگر موجود تھے بھی تو ان کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔ "اس کے نشانات پہچاننے سے رہ گئے تھے" سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ تعداد میں اس قدر قلیل تھے کہ مخلوق ان کو نہیں پہچان پاتی تھی۔

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں کہ (اس کے راستے مٹ مٹا گئے اور شاہراہیں اجڑ گئیں) اب کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا جس پر چل کر دین تک پہنچا جا سکتا۔ اور یہ سب ایمان کی کمزوری اور دین کے ضعف میں مبالغے کی حد تک نشان دہی کی گئی ہے۔ حتی کہ اوامر اور نواہی کی مخالفت اور نافرمانی پر عمل درآمد کر کے (شیطان کے پیچھے لگ کر اس کی راہوں پر چلنے لگے اور اس کے گھاٹ پر اتر پڑے) اور اس کی گمراہی کے چشموں سے سیراب ہونے لگے۔ (انہی کی وجہ سے اس کے پھریرے ہر طرف لہرانے لگے اور جھنڈے گڑ گئے تھے) اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہو گیا، اس کے جال ہر طرف پھیل گئے۔ جہاں جہاں پر بھی ایسے لوگ تھے وہیں وہیں سے اس کے لشکر تیار ہونے لگے اور وہ لوگ اس کی معاونت پر کمر بستہ ہو گئے، اور اس کے ساتھ مل کر شمع ہدایت کو خاموش کرنے اور پرچم ضلالت کو سربلند رکھنے میں کوشاں ہو گئے۔ (ایسے فتنوں میں) جو مذکورہ فتنوں کے علاوہ تھے، کیونکہ ان فتنوں کو حضرت امیرؑ نے مختلف جانوروں سے تشبیہ دی ہے جن کے سُم، کُھر اور پنجے ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں (جو انہیں اپنے سموں سے روندتے تھے اور

اپنے گھروں سے کچلتے تھے اور اپنے پنجوں کے بل مضبوطی سے کھڑے ہوئے تھے)۔

بہر صورت (وہ لوگ ان) فتنوں (میں حیران، سرگردان، جاہل اور فریب خوردہ تھے) راہ راست سے ہٹے ہوئے تھے، اس بات میں سخت سرگرداں تھے کہ حق اور بہتری کس جانب ہے؟ حق سے بے بہرہ تھے، اندھے اور گونگے فتنوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ پھر ایک اور طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ ایسے گھر میں جو خود اچھا تھا) یعنی مکہ معظمہ (اور اس میں رہنے والے برے تھے) یعنی قریش۔ شارح معتزلی کہتے ہیں "یہ آخری جملہ یعنی ایسے گھر میں جو خود اچھا تھا مگر اس میں رہنے والے برے تھے" حضرت رسول اکرمؐ کا ہے جب آنجنابؐ نے مدینہ منورہ میں اپنی بعثت کے آغاز کا ذکر کیا تو یہی الفاظ ادا فرمائے۔ ایسے گھر میں (جہاں نیند کے بجائے بیداری اور سرمے کی جگہ آنسو تھے) یہ دونوں صفتیں ان ہمسایوں کی تھیں۔ شارح معتزلی فرماتے ہیں: "یہ تو ایسے ہے جیسے کہا جائے ان کی سخاوت، بخل ہے اور ان کا سکون بے اطمینان ہے" یعنی اگر حضرت محمدؐ مصطفیٰ ان سے سونے (نیند) کی خواہش کرتے تو وہ سونے کے بجائے بیدار رہتے اور اگر ان سے سرمہ لگانے کی خواہش کرتے تاکہ ان کی آنکھیں نہ دکھنے پائیں تو وہ اپنی طرف سے سرمے کے استعمال کی بجائے آپؐ کی خدمت میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے۔ (ایسی سرزمین میں عالم) یعنی محمدؐ مصطفیٰ کی صداقت کو جاننے اور ان پر ایمان لانے والے (کے منہ میں) خوف اور تقیہ کی (لگام تھی اور جاہل) جو کہ نبوت اور آنحضرتؐ کی عظمت کا منکر تھا وہ (معزز اور سرفراز تھا)۔

ایک اور تفسیر

اس سے پہلے ہم اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ مذکورہ فصل میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام کی جو تفسیر ابھی بیان کی گئی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جب "وَالنَّاسُ فِيْ فِتَنٍ" یعنی اس وقت لوگوں کی حالت یہ تھی کہ فتنوں میں پڑے ہوئے تھے۔ کے جملہ کو "جملہ حالیہ" تسلیم کریں، تو اس وقت کا تعلق اوائل بعثت کے دور سے ہوگا۔ لیکن اگر اسے دوسرے احتمال کے پیش نظر "جملہ استینافیہ" مانیں تو پھر اس وقت خود حضرت امیرؑ کے زمانے کے لوگوں کی کیفیت ہوگی، جیسے کہ بعض شارحین نے اس کا اظہار بھی کیا ہے جن میں شارح بحرانی کا شمار بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سید رضیؒ نے خطبے کا یہ حصہ جو یہاں پر درج فرمایا ہے اس سے ذہن میں اس بات کا تبادر ہوتا ہے کہ اس خطبہ کی کچھ فصلیں آپس میں گڈمڈ ہو گئی ہیں...... لہٰذا اس سے ایک یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں پر فتنوں سے مراد وہ فتنے ہیں جو پیغمبر اعظم صلوات اللہ وسلامہ علیہ کی وفات کے بعد رونما ہوئے۔ اور وہ معاویہ۔ جمل والوں اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کے فتنے ہیں"۔

لہٰذا اس احتمال کی بنیاد پر "حبل دین" سے مراد دین پیغمبرؐ ہوگا اور "نجر" سے مراد اصل فطرت ہوگی جو رسول خداؐ کے وجود ذی جود کی وجہ سے تو متفق علیہ تھی لیکن آپؐ کی وفات کے بعد لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کر دیا اور مسلم امہ فرقوں کا شکار ہو گئی اور مختلف مسالک کی پیروکار بن گئی، بقول علی ابن ابی طالبؑ "اَطَاعُوا الشَّيْطَانَ" یعنی شیطان کی اطاعت کرنا شروع کر دی۔ رسول پاکؐ کی وفات کے بعد "حق" سے منہ موڑ کر شیطان کی اطاعت کرنے لگ گئی۔ "حق" پر خروج کیا، اس کے خلاف بغاوتیں کیں، اس

کے ساتھ جنگیں لڑیں۔ حیران، سرگردان اور پریشان، ان کے تردد کی حالت یہ تھی کہ پیغمبرؐ کی زبان سے یہ "علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے" سننے کے باوجود بھی اس کشمش میں مبتلا ہو گئے کہ "حق کدھر ہے؟ علیؑ کے پاس یا کسی اور کے پاس"۔

حضرت امیرؑ کا یہ فرمانا کہ: "ایسے گھر میں جو بہترین تھا لیکن ہمسائے بدترین تھے" اس بارے میں شارحین کے درمیان اختلاف ہے۔ راوندی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے شرح ابن ابی الحدید میں کہا ہے کہ: "بہترین گھر سے مراد کوفہ ہے۔ جبکہ ایک قول ہے کہ "شام" ہے، کیونکہ شام ایک مقدس سرزمین ہے لیکن اس کے رہنے والے بدترین ہمسائے ہیں، یعنی معاویہ اور اس کے پیروکار۔ اور "ان کی نیند، بیداری ہے اور سرمہ، آنسو ہیں"۔ تو اس سے معاویہ والے لوگ مراد ہیں کیونکہ وہ رات بھر نہیں سوتے بلکہ آنجنابؐ کی تاڑ میں لگے رہتے ہیں اور آمد کے منتظر رہتے ہیں" وغیرہ۔ علاوہ ازیں اور بھی بہت سے اقوال ہیں جو تفصیل کے ساتھ شرح بحرانیؒ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

چوتھی فصل

آل محمدؐ کی تعریف و توصیف

وَ مِنْهَا وَ يَعْنِيْ آلَ مُحَمَّدٍ

وَهُمْ مَوْضِعُ سِرِّهٖ وَلَجَاءُ اَمْرِهٖ وَعَيْبَةُ عِلْمِهٖ وَ مَوْئِلُ حُكْمِهٖ وَ كُهُوْفُ كُتُبِهٖ وَجِبَالُ دِيْنِهٖ بِهِمْ اَقَامَ انْحِنَاءَ ظَهْرِهٖ وَ اَذْهَبَ ارْتِعَادَ فَرَائِصِهٖ.

اسی خطبے کا ایک حصہ جو آل محمدؐ سے متعلق ہے

وہ اس کے راز کے امین اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں۔ اس کے علم کا مخزن اور اس کے حکم کا مرجع ہیں۔ اس کی کتابوں کی پناہ گاہ اور اس کے دین کے پہاڑ ہیں۔ انہی کے ذریعے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور ضعف کی کپکپی دور کی۔

تشریح

"لَجَأ" بمعنی "مَلْجَا" کے ہے یعنی جائے پناہ۔ "عَيْبَةٌ" کے معنی ہیں وہ ظرف کہ جس میں کپڑے رکھے جاتے ہیں اور "عَيْبَةُ الرَّجُلِ" کے معنی ہیں انسان کے رازوں کا امین۔ "کہف" پہاڑ میں وسیع غار کو کہتے ہیں، اگر چھوٹی ہو تو "غار" کہلاتی ہے، اور کہف چونکہ گھر کی مانند ہوتی ہے لہٰذا محفوظ جگہ کیلئے استعارہ میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ "فرائص" جمع ہے "فَرِيْصَةٌ" کی جس کے معنی ہیں پہلو اور شانے کے درمیان گوشت کا حصہ۔ خطبہ کے اس حصے میں استعمال ہونے والی مفرد کی آٹھوں ضمیریں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہیں، جن کا سابق میں ذکر ہو چکا ہے، اور "قرینہ مقام" کے لحاظ سے یہی تعبیر زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ "كُتُبِهٖ" میں "ہ" کی ضمیر کے متعلق اگر دور کی بات سمجھی جائے تو اس کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ آگے چل کر ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ باقی ساری ضمیریں آنجنابؐ کی طرف لوٹ رہی ہیں سوائے آخری دو ضمیروں کے کہ وہ "دین" کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ البتہ یہ بعید نہیں ہے کہ بلکہ مناسب تر بھی ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ "كُتُبِهٖ" کی ضمیر کے سوا باقی سب ضمیریں آپؐ ہی کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ تمام ضمیریں "اللہ" کی طرف لوٹ رہی ہیں سوائے آخری دو ضمیروں کے کہ وہ

پیغمبرؐ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں تاویل سے سالم ہیں لیکن کلام کے اپنے نسق سے نکل جانے کا امکان ہے۔

آل محمدؐ کون ہیں ؟

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے خطبے کے اس حصے میں آل محمد علیہم السلام کی آٹھ اوصاف بیان فرمائی ہیں۔ جو ان کے بلند مرتبہ، رفیع منزلت اور عظیم الشان ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اور آل محمدؐ سے مراد ائمہ معصومین علیہم السلام ہی ہیں۔ جیسا کہ آئندہ چل کر ہم اسے تفصیل سے بیان کریں گے، انشاء اللہ۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ شارح بحرانی مرحوم نے مذکورہ اوصاف کا مصداق نبی اکرمؐ کے قریبی ترین ہاشمی رشتہ داروں مثلاً عباس، حمزہ، جعفر اور علی بن ابی طالب علیہم السلام کو قرار دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ علی علیہ السلام بھی اس کے مصداق ہیں لیکن عباس، حمزہ، جعفر اور ان کی مانند دوسرے بنی ہاشم کی اس قدر قابلیت کہاں کہ وہ اسرار الٰہی کی حفاظت کر سکیں اور ان میں اتنا استعداد کہاں کہ وہ امر الٰہی کے ملجاو ماویٰ قرار پائیں۔ کہاں اس کی کتابوں کا احاطہ کر سکتے ہیں ؟ اسی طرح دیگر اوصاف کے کیونکر مستحق قرار پا سکتے ہیں یہ تو صرف وہی لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو آل اللہ و آل الرسولؐ ہیں جو خدا کی مضبوط رسی، ہدایت کے مینار اور تقویٰ کے نشان ہیں۔ وہی دیناوالوں کیلئے جائے پناہ اور ان کے ملجاو ماویٰ ہیں۔

اور اب اس کی تفصیل

مذکورہ اوصاف میں سے پہلی صفت جس کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا ہے وہ یہ کہ :

ا۔ آل محمدؐ رازوں کے امین ہیں

چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں (وہ اس کے راز کے امین ہیں) اور راز سے مراد ایسے علوم ہیں کہ جن کا عمومی اظہار جائز نہیں ہوتا۔ اور ائمہ اطہار علیہم السلام ایسے علوم کے امین، مرکز، ٹھکانہ، خزینہ دار، حافظ اور محافظ ہیں، یہ آپ کا علم کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ اگر کرتے بھی ہیں تو ان کیلئے جن کے متعلق احتمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے متحمل ہوں گے، کیونکہ عوام الناس کیلئے اس قدر قوت برداشت نہیں ہوتی کہ اسرار الٰہیہ کے متحمل ہوں۔ اسی لئے تو حضرت امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں : "اگر ابوذرؓ کو علم ہو جائے کہ سلمانؓ کے دل میں کیا ہے تو اسے قتل کر ڈالے"۔

بحار الانوار میں سید حسن بن کبش کی کتاب سے اسناد کے ساتھ ابو بصیر سے روایت کی گئی ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا : "اے ابا محمد! یقیناً ہمارے پاس اللہ کے اسرار میں سے کئی اسرار اور اس کے علوم میں سے ایسے علم موجود ہیں کہ جن کا متحمل نہ تو کوئی ملک مقرب ہو سکتا ہے، نہ نبی مرسل اور نہ ہی کوئی ایسا مؤمن کہ جس کے دل کو اللہ نے ایمان کیلئے آزمایا ہو۔ خدا کی قسم اللہ نے ہمارے علاوہ کسی اور کو ان کے متحمل ہونے کی تکلیف نہیں دی، اور ہمارے علاوہ کسی اور سے ان کی بندگی بھی نہیں چاہی۔ ہمارے پاس اللہ کے اسراروں میں سے اسرار اور علوم میں سے علم ہیں جن کی تبلیغ کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کے حکم کی تعمیلؑ کی اور ہمیں ان لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا ہے جنہیں ہم اس بات کا امین، اہل اور متحمل سمجھیں، وہ اس کے متحمل ہوتے ہیں۔

اور اس کیلئے اللہ نے کچھ اقوام کو اسی طینت سے پیدا کیا ہے جس سے حضرت محمدؐ اور ان کی ذریت کو خلق فرمایا ہے، اور جس نور سے اس نے محمدؐ اور ان کی آلؑ کو پیدا کیا ہے اسی سے ان کو خلق فرمایا ہے، اور جو فضل واحسان محمدؐ و آل محمدؐ پر کیا ہے وہی ان پر کیا ہے۔ لہذا ہم ان تک اللہ کے ان امور پہنچاتے ہیں جن کی تبلیغ کا اس نے ہمیں حکم دیا ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ہم سے قبول کرتے اور اس کے متحمل ہوتے ہیں، جب ہمارا ذکر ان تک پہنچتا ہے تو ان کے دل ہماری معرفت اور ہماری حدیثوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تخلیق اسی طرح نہ ہوئی ہوتی تو خدا وہ اسی طرح نہ ہوتے اور نہ ہی ان میں یہ قوت برداشت ہوتی"۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جہنم کیلئے بھی کچھ قوموں کو پیدا کیا ہے اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ان تک بھی اس کے اموروپسے پہنچائیں جس طرح مذکورہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری اس تبلیغ سے ان کے تیور بدل جاتے ہیں اور دلوں میں ان کے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ہماری باتوں کی تردید کرتے ہیں اور برداشت کرنے کی بجائے الٹا جھٹلانا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں "جھوٹا جادوگر ہے"، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور یہ چیزیں ان کو فراموش کرا دیتا ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبانوں سے کچھ حق کی باتیں بیان کرا دیتا ہے، زبانی طور پر تو وہ بیان کرتے ہیں لیکن ان کے دل ان باتوں سے آشنا نہیں ہوتے، اور یہ صرف اولیاء اللہ اور مطیعان امر الٰہی کے دفاع کیلئے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین پر خدا کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہو، اسی لئے اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ایسے لوگوں سے بچتے رہیں اور ان سے رازوں کی باتیں چھپاتے رہیں۔ لہذا جن لوگوں سے خدا نے ہمیں بچنے کا حکم دیا ہے تم بھی ان سے بچتے رہو اور ان سے رازوں کی باتیں چھپاتے رہو"۔ پھر آپؑ نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور رو کر کہنے لگے: "خدایا! اس قسم کے لوگ تعداد میں بہت کم ہیں لہذا تو ان کی زندگی اور ہماری زندگی ایک کر دے اور ان کا مرنا ہمارا مرنا ایک بنا دے، اور ان پر دشمنوں کو مسلط نہ کر ورنہ ہمیں دکھ ہوگا۔ اگر ان کی وجہ سے ہمیں دکھ پہنچا تو زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا"۔ اس روایت کو کافی میں بھی ابو بصیر سے بیان کیا گیا ہے۔

مذکورہ حدیث پر مصنف کا تبصرہ

مصنف کہتے ہیں کہ اگر اس حدیث میں غور کیا جائے تو اس کے سابقہ دونوں حصوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔ ایک حصہ تو وہ جس میں کہا گیا ہے کہ "ہماری حدیث سخت اور مشکل ہے جس کا ملک مقرب، نبی مرسل یا ایسے مؤمن کہ جس کے دل کو اللہ نے ایمان کیلئے آزمایا ہے کے سوا کوئی اور متحمل نہیں ہو سکتا" جبکہ دوسرے حصے میں ہے کہ "نہ ہی ملک مقرب، نہ نبی مرسل اور نہ ہی وہ مؤمن متحمل ہو سکتا ہے کہ جس کے دل کو اللہ نے ایمان کیلئے آزمایا ہے"۔ وہ یوں کہ اس کا دوسرا حصہ صرف اور صرف ائمہ اطہار علیہم السلام کیلئے مخصوص ہے جس کے صرف وہی متحمل ہو سکتے ہیں جبکہ پہلا حصہ اس سے کم درجے کا ہے اور اس کے متحمل مذکورہ افراد بھی ہو سکتے ہیں، اور یہ وہ راز ہے جس کے متعلق ابھی بیان ہو چکا ہے کہ اسے استعداد کے مراتب کے مطابق خواص پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی کی طرف حضرت امام جعفر صادقؑ نے بھی اشارہ فرمایا ہے کہ "اگر ابوذرؓ کو علم ہو جائے کہ سلمانؓ کے دل میں کیا ہے تو وہ اسے قتل کر ڈالے"۔ کیونکہ ابوذرؓ میں اس راز کے متحمل ہونے کی وہ استعداد نہیں تھی جو سلمانؓ میں تھی۔

یونہی کمیلؓ کی کیفیت ہے، اگرچہ وہ امیر المؤمنینؑ کے اصحاب خاص میں سے تھے لیکن ان میں وہ استعداد نہیں تھی جو ابوذرؓ

میں تھی، اگرچہ وہ بھی امیر المؤمنینؑ کے صاحب سرّ تھے یعنی ان کی رازوں کے امین تھے، لیکن دوسرے لوگوں کی نسبت!۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت امیر المؤمنینؑ سے "حقیقت" کے بارے میں سوال کیا تو حضرتؑ نے فرمایا: "تمہارا حقیقت سے کیا واسطہ؟" اس پر انہوں نے مولاؑ سے عرض کیا: "کیا میں آپؑ کا رازدان نہیں ہوں؟" تو امامؑ نے بڑے پیارے انداز میں جواب دیا، فرمایا: "میرے رازداں ضرور ہو، لیکن جب میرے سینے کی ہانڈی میں ابال آئے گا اور اس وقت اس سے جو کچھ باہر آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔ حضرتؑ کے اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؑ کے رازوں کے اس حد تک امین تھے کہ جب کوئی بات حضرتؑ کے جوش بیان سے باہر آئے اور وہ اس سے استفادہ کریں، اور بس!

بہر صورت ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "خداوند سبحانہ کے اسرار" اس کے ایسے علوم ہیں جن کا اظہار ہر ایک کیلئے جائز نہیں ہو تا سوائے ان لوگوں کے جن میں ان کے تحمل کی قوت اور استعداد ہوتی ہے، اور جس کی استعداد جتنا زیادہ ہوگی اسے اسی قدر ان اسرار و رموز سے نوازا جائے گا۔ کتاب "الخرائج" میں اسناد کے ساتھ عبدالرحمٰن بن کثیر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ: "حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس تین آدمی آکر عرض کرنے لگے "یا ابا عبداللہ! ہمیں اپنی فضیلت کے بارے میں آگاہ فرمائیں کہ جو اللہ نے آپؑ کو عطا فرمائی ہے؟" حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے فرمایا "تم اس کے نہ تو متحمل ہو سکتے ہو اور نہ ہی تم میں اس کی قوت برداشت ہے!" انہوں نے عرض کیا "ہم ضرور اس کے متحمل ہوں گے!" تو آپؑ نے فرمایا "ایسا کرو کہ تم میں سے دو آدمی جدا ہو کر تنہائی میں میرے پاس سے چلے جائیں، میں ان میں سے ایک کو اپنی فضیلت بیان کروں گا، اگر اس نے برداشت کر لیا تو پھر تم سب سے بیان کروں گا"۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور دو آدمی علیحدگی میں چلے گئے، آپؑ نے اس ایک شخص کو اپنے فضائل بتانا شروع کئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی عقل کے پرندے اڑنے لگ گئے اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلتا بنا، اس کے دوسرے ساتھیوں نے اس سے بات کی تو وہ کچھ نہ بول سکا اور وہ سب لوگ وہاں سے واپس ہو گئے"۔ کتاب "الخرائج" ہی میں انہی اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ ایک شخص حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "آپؑ ہمیں اپنی کوئی ایک فضیلت بیان فرمائیں جو اللہ نے آپؑ کیلئے مقرر فرمائی ہے؟" امامؑ نے فرمایا: "تم میں اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے!" اس نے کہا: "فرزند رسولؐ! آپؑ بیان تو فرمائیے دیکھئے کہ مجھ میں قوت برداشت ہے یا نہیں؟" چنانچہ امامؑ نے اسے حدیث بیان فرمانا شروع کی، جب بیان فرما چکے تو اس کا سر اور داڑھی سفید ہو چکے تھے اور وہ حدیث بھی اسے فراموش ہو گئی۔ امام حسینؑ نے فرمایا "یہ بھی اللہ ہی کی رحمت ہے کہ اس نے اسے حدیث فراموش کرا دی ہے"۔

بحار الانوار میں مرفوع سند کے ساتھ میثم تمار سے روایت کی گئی ہے کہ وہ کہتے ہیں: "میں بازار ہی میں تھا کہ اچانک اصبغ بن نباتہ وہاں پر آگئے اور کہنے لگے "میثم! تمہارا بھلا ہو، آج میں نے مولا امیر المؤمنین علیہ السلام سے بہت ہی سخت اور مشکل حدیث سنی ہے" میں نے پوچھا "وہ کونسی حدیث ہے؟" انہوں نے کہا "مولاؑ نے فرمایا ہے کہ ہماری حدیث بہت ہی سخت اور نہایت ہی مشکل ہے جس کا متحمل یا تو ملک مقرب یا نبی مرسل یا پھر وہ مؤمن ہی ہو سکتا ہے جس کے دل کو اللہ نے ایمان کیلئے آزما لیا ہو"۔ یہ سن کر میں فوراً مولا علیؑ کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا "امیر المؤمنینؑ! اصبغ نے مجھے ایسی حدیث بیان کی ہے جس سے میرا دل بہت

تنگ ہو گیا ہے !" پوچھا "کیا کہا ؟" تو میں نے بتایا، اس پر آپؑ مسکرائے اور فرمایا" میثم! بیٹھو!! مجھے یہ بتاؤ کہ کوئی عالم تمام علوم کا متحمل ہو سکتا ہے ؟ خداوند عالم نے ملائکہ سے فرمایا" اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "(بقرہ / ۳۰) کہ میں ایک خلیفہ زمین میں بنانے والا ہوں تو فرشتے (تعجب سے) کہنے لگے، کیا تو زمین میں ایسے شخص کو (خلیفہ) بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی برپا کرتا پھرے ؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی ثابت کرتے ہیں، خدا نے فرمایا اس میں شک نہیں کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔ امامؑ نے پوچھا" آیا فرشتے علم کے متحمل تھے ؟" میں نے عرض کیا" جنابؑ! یہ تو آپؑ نے اسؑ سے بھی بڑی بات بیان فرما دی !" فرمایا" اور سنو! حضرت موسیٰ بن عمران پر اللہ نے توریت نازل فرمائی تو انہوں نے سمجھا کہ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر کوئی اور عالم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں باور کرا دیا کہ نہیں، تم سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے، اللہ نے یہ اس لئے کیا تا کہ موسیٰؑ خود پسندی کا شکار نہ ہو جائیں، موسیٰؑ نے عرض کیا کہ خداوندا! مجھے اس عالم کی طرف راہنمائی فرما! چنانچہ اللہ نے ان کی حضرت خضرؑ سے ملاقات کرا دی، حضرت خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کیا تو موسیٰؑ اس کے متحمل نہ ہو سکے، بچے کو قتل کیا تو اس کو برداشت نہ کر سکے اور دیوار کو از سر نو اٹھایا تو بھی ان کیلئے نا قابل برداشت تھا، غرض تمام انبیاء کی داستانیں ہیں۔ ان میں سے ہمارے پیغمبرؐ نے غدیر خم کے دن میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا" خدایا! جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس کا مولا ہے" تو تم نے دیکھا کہ اسے کن کن لوگوں نے برداشت کیا ؟ سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں اللہ نے محفوظ رکھا، اور کسی نے بھی اسے برداشت نہیں کیا، لہٰذا اے میثم! تمہیں زیادہ سے زیادہ خوشخبری ہو کہ اللہ نے تمہیں ایسی چیزوں سے خصوصیت بخشی ہے جن سے ملائکہ، انبیاء اور مرسلین کو خصوصیت عطا نہیں کی۔ لہٰذا رسول خداؐ کے امر اور علم میں سے تم جس قدر ان کے متحمل ہو اسی قدر ہمارے متعلق لوگوں کو بتاؤ کہ ہمارے کیا فضائل ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بڑی بات ہے اور نہ ہی کسی قسم کا گناہ ہے۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ "ہم انبیاء کے گروہ کو حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں کے مطابق بات کریں"۔

مذکورہ حدیث پر علامہ مجلسیؒ کا تبصرہ

محدث مجلسیؒ حدیث مذکور کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ حدیث کے آخری حصے سے مراد شاید امیر المؤمنینؑ یہ فرمانا چاہتے ہوں کہ: "ہمارے جس قدر بھی فضائل بیان کرو پھر بھی ہمارے درجے سے کم ہوں گے کیونکہ ہم لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں کے مطابق بات کرتے ہیں"۔ یا پھر یہ معنی ہوں کہ: "جن چیزوں کا ہمیں مکلف بنایا گیا ہے تمہیں نہیں بنایا گیا لہٰذا تم ہمارے فضائل میں جو کہنا چاہتے ہو کہو"، لیکن یہ ہے بعید امر۔

۲۔ آل محمدؐ دین کی پناہ گاہ ہیں

دوسری فضیلت جس کی طرف حضرت امیر المؤمنینؑ نے ان الفاظ کے ساتھ متوجہ فرمایا ہے (اور اس کے دین کی پناہ گاہ ہیں) شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں کہ آنجنابؑ نے یہ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آل محمدؐ امر دین کیلئے پناہ گاہ ہیں، یعنی وہ دین خدا کے ناصر، امر الٰہی کے قائم کرنے والے اور دین خدا کی حفاظت کرنے والے ہیں، انہی کے پاس پناہ ملتی ہے اور دین کی سلطنت انہی

کی وجہ سے قائم ہے۔

قول مصنفؒ حضرتؑ کے کلام سے بظاہر جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ "امر" سے مراد امور دینی ہی ہیں۔ اور آل محمدؑ خود انہی اوامر دینی کیلئے جائے پناہ ہیں۔ اور میرے نزدیک زیادہ ظاہر اور قوی امر یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرات آل محمدؑ دینی امور میں بندگان خدا کیلئے جائے پناہ ہیں، بایں معنیٰ کہ جب ان کے درمیان کسی دینی امر میں تنازع پیدا ہو جائے اور وہ حقیقت امر تک نہ پہنچ سکیں تو انہیں چاہئے کہ اس کا فیصلہ آل محمدؑ کے پاس لے جائیں تاکہ وہ ان تنازعات کا فیصلہ کریں کیونکہ وہی اس بارے میں کائنات کے ملجاو ماویٰ ہیں، اس لئے کہ "اولوالامر" ہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ وَ أُولِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَ الرَّسُولِ إِنْ كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَ الْيَوْمِ الآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَّ أَحْسَنُ تَأْوِيلاً" (نساء / ۵۹) اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے (رسول ہی کی طرح) صاحبان امر ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو، پس اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس (امر) میں خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

علی بن ابراہیم قمی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: مجھ سے میرے والد نے انہوں نے حماد بن حریز سے اور انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی طرف سے بیان کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "یہ آیت اس طرح نازل ہوئی ہے"...... فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَارْجِعُوهُ إِلَى اللهِ وَ إِلَى الرَّسُولِ وَ إِلَىٰ أُولِي الأَمْرِ مِنكُمْ......"، "اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ، رسول اور اولی الامر کی طرف پلٹادو۔"

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "فَرُدُّوهُ" کی جگہ "فَارْجِعُوهُ" ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس کی تفسیر ہو تنزیل نہ ہو، اور مصحف اہل بیت میں "والی اولی الامر منکم" بھی موجود ہے۔ اور اسی بنا پر آیت صراحتاً اس مطلوب پر دلالت کر رہی ہے کہ جن جن دینی امور میں لوگوں کو اختلاف ہو انہی میں کتاب خدا، رسول اللہ اور ائمہ اطہارؑ کی طرف ہی رجوع کریں۔

اگر قرآن کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی اس سے ہمارے مؤقف کی تائید ہوتی ہے وہ یوں کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد ان کے مقدس اور معصوم جانشین جو ائمہ ہدیٰ ہیں، کی طرف رجوع بھی ویسے ہی ہے جیسے آنحضرتؐ کی زندگی میں ان کی طرف رجوع ہے کیونکہ ائمہ اہلبیت ہی محافظین شریعت اور خلفاء امت ہیں۔ اور جانشینان رسولؐ ہیں۔ اسی بارے میں خداوند متعال فرماتا ہے: "وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (نساء / ۸۳) اور اگر وہ اس بات کو رسول یا اپنے میں سے صاحبان امر تک پہنچاتے تو بے شک جو لوگ ان میں اس کی تحقیق کرنے والے ہیں اس کو سمجھ لیتے۔ چنانچہ بحار میں تفسیر عیاشی سے اسی آیت کے بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "اولی الامر، ائمہ ہدیٰ ہی تو ہیں"۔ عبداللہ بن جندب کہتے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے میرے ایک خط کا مفصل جواب تحریر فرمایا اور آخر میں لکھا کہ: "......اللہ تعالیٰ اپنی محکم کتاب میں ارشاد فرماتا ہے "وَ لَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَ إِلَىٰ أُولِي الأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ" (نساء / ۸۳) اولی الامر سے مراد آل محمد علیہم السلام ہیں اور وہی ہیں جو قرآن سے استنباط

کرتے ہیں، حلال و حرام کو پہچانتے ہیں اور مخلوق خدا پر اس کی حجت ہیں"۔

مذکورہ بالا تصریحات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام ہی اولی الامر ہیں اور قرآن مجید کی مذکورہ دونوں آیات میں بھی "اولی الامر" سے مراد آپ حضرات ہی ہیں۔ دوسری آیت میں اولی الامر سے مراد اس روایت کی رو سے ہیں جو ابھی حضرت امام رضا علیہ السلام سے بیان ہوئی ہیں اور پہلی آیت کے بارے میں تو کثیر تعداد میں روایات موجود ہیں۔ جن میں سے چند ایک کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ بحار الانوار میں تفسیر ابن فرات سے منقول ہے کہ عبید بن کثیر سلسلہ اسناد کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ راوی نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول: "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (نساء / ۵۹) خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے (رسول ہی کی طرح) صاحبان امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔ کے بارے میں پوچھا تو امامؑ نے فرمایا: "اس میں صاحبان علم و فقہ مراد ہیں!" راوی نے پوچھا: "ہر صاحب علم و فقہ یا نہ صرف خاص لوگ؟" فرمایا: "نہ، بلکہ اس سے مراد خاص ہم لوگ ہیں"۔

۲۔ کافی میں جابر جعفی کہتے ہیں کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: "اس سے مراد اوصیاء پیغمبرؐ ہیں"۔

۳۔ کافی ہی میں ہے کہ برید عجلی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" (نساء / ۵۸) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کی امانتیں ان کے اہل کے حوالے کر دو اور جب لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ امامؑ نے فرمایا کہ اس آیت میں ہمیں مراد لیا گیا ہے کہ ہم میں سے ہر امامؑ اپنے بعد میں آنے والے امامؑ کو کتابیں، علم اور اسلحہ سپرد کر دے۔ اور عدالت کے مطابق فیصلہ کرے، پھر لوگوں کو فرمایا "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (نساء / ۵۹)۔

اس آیت میں اولی الامر سے مراد خصوصی طور پر ہمیں ہی لیا ہے۔ اور قیامت تک آنے والے تمام مؤمنین کو ہماری اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ "اے مومنو! اگر تمہیں کسی امر میں جھگڑے کا خطرہ ہو تو اسے اللہ، رسولؐ اور اپنے میں سے اولی الامر کی طرف پلٹاؤ" اور یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ جب متنازعہ امور میں لوگوں کو کھلی چھٹی دے دے تو پھر انہیں اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کا حکم کیونکر دے سکتا ہے؟" اس بارے میں بے حد حساب روایات موجود ہیں۔

ایک عقلی دلیل

اس کیلئے عقلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "اولی الامر کی اطاعت کا عمومی اور مطلقاً" حکم دیا ہے اس لئے کہ ان کی اطاعت کیلئے کوئی شرط نہیں لگائی اور نہ ہی مخصوص کیا ہے کہ کن امور میں ان کی اطاعت کی جائے اور کن میں اطاعت نہ کی جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت کا عمومی اور مطلق حکم ہے اور یہی عمومی حکم ان کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ خداوند عالم قبیح کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ غیر معصوم سے قبیح افعال کے سرزد ہونے کا پورا امکان ہوتا ہے، اور مذکورہ حکم کے مطابق فعل قبیح میں بھی اس کی اطاعت لازم ہوگی، اور ایسا کرنا خدا کیلئے ناممکن ہے۔ بعد از پیغمبر خدا۔ اجماع امت کے

فعل قبیح میں بھی اس کی اطاعت لازم ہو گی، اور ایسا کرنا خدا کیلئے ناممکن ہے۔ بعد از پیغمبر خدا۔ اجماع امت کے مطابق معصوم صرف ائمہ اہل بیتؑ ہی ہیں جن کے بارے میں تفصیلی دلائل خطبہ " شقشقیہ " کی شرح کے دوران پیش کئے جائیں گے انشاءاللہ۔

حضرت امام امیرؑ کے اسی خطبے کے اس جملہ "وَلَجَاءُ اَمْرِہٖ" کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ "امر" سے مراد عمومی دینی امور ہوں، ان دونوں آیات میں بھی بعض مفسرین نے امر سے مراد عمومی امور دینیہ لئے ہیں۔ تو پھر ایسی صورت میں امر سے مراد تمام مقدر امور بھی ہوں گے۔ جن کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ۱۔ "تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ" (قدر / ۳) اس رات میں اپنے پروردگار کی طرف سے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور روح (امری) آتی ہے۔ اور خداوند عالم فرماتا ہے: ۲۔ "فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ" (دخان / ۴) اسی رات میں تمام دنیا کے حکمت و مصلحت کے کام فیصل کئے جاتے ہیں۔

چنانچہ اس کی مکمل تفصیل پہلے خطبے کی نویں فصل میں حضرت کے ان کلمات "وَمُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهٖ وَقَدْرِهٖ" کی شرح میں گزر چکی ہے۔ بصیرت میں اضافہ کیلئے اس طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ آل محمدؐ علم کا مخزن ہیں

آل محمدؐ کی تعریف و توصیف میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (اس کے علم کا مخزن ہیں) یعنی انہیں علم یوں ودیعت کیا گیا ہے۔ جیسے بیش قیمت اور نفیس لباس کو کسی محفوظ ظرف میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ آل محمدؐ کو ایسے مخزن یا صندوق سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں بیش بہا اور نفیس لباس رکھا جاسکتا ہے اس طرح سے اس لباس کی ہر ممکن حفاظت کی جاتی ہے۔ اسے چوروں اچکوں سے بھی بچایا جاتا ہے اور گرد و غبار سے بھی محفوظ رکھا جاتا ہے اور وہ میلا کچیلا ہونے سے بچا رہتا ہے۔ اسی طرح آل محمدؐ ہیں جو خدائی علم کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہیں اسے سرقہ ہونے سے بھی بچاتے ہیں اور اس پر گرد و غبار کی تہہ بھی نہیں چڑھنے دیتے۔ اور یہ ایک حسین استعارہ ہے۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں کہ: "علم کا مخزن ہونا اسرار کا مرکز ہونے کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ فلاں اس کے علم کا مخزن ہے، جب وہ کسی کے اسرار کا مرکز ہو، اور اس بارے میں یہ کہنا کہ لغوی اور عرفی لحاظ سے "علم کا مخزن" ہونا اور "اسرار کا مرکز" ہونا ایک ہی معنی میں آتے ہیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ علم الٰہی اور علم پیغمبرؐ جو خدا ہی سے حاصل کردہ ہے سب آل محمدؐ کے پاس ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اس کے محافظ ہیں" اس دعویٰ پر قطعی متواتر روایات دلالت کر رہی ہیں جن میں سے چند ایک کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ کافی میں اسناد کے ساتھ یونس بن رباط کہتے ہیں میں اور کامل تمار حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے کامل نے امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: "آپؑ کے قربان جاؤں فلاں شخص نے ایک حدیث بیان کی ہے" امامؑ نے فرمایا: "بیان کرو!" اس نے کہا حدیث یہ بیان کی ہے کہ "حضرت رسول خداؐ نے بوقت رحلت حضرت علیؑ کو ہزار باب علم تعلیم فرمائے اور پھر

حضرت امیرؑ نے ہزار باب اور کھولے، اس طرح سے تو پھر دس لاکھ باب کھل چکے ہوں گے!'' امامؑ نے فرمایا: ''ہاں ایسا ہی ہے'' کامل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''قربان جاؤں تو کیا یہ سب باب آپؑ کے شیعوں اور موالیوں کیلئے بھی ظاہر ہوئے ہیں؟'' فرمایا: ''کامل! ایک یا دو باب، اس سے زیادہ نہیں'' پھر عرض کیا قربان جاؤں آپ کے دس لاکھ فضائل کے باب سے صرف ایک یا دو باب فضائل ظاہر ہو سکتے ہیں؟'' فرمایا ''تم ہمارے جتنا بھی فضائل بیان کرو پھر بھی ان کا ایک ہزارواں حصہ ہوگا''۔

۲۔ بحارالانوار میں کتاب ''المحتضر'' سے مرفوعاً ابوبصیر سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت امام جعفر صادقؑ کے پاس موجود تھا کہ اتنے میں مفضل بن عمر بھی آگئے اور عرض کیا: ''فرزند رسولؐ! ایک مسئلہ پوچھنا ہے'' فرمایا: ''ہاں پوچھو'' مفضل نے کہا: ''عالم اس سے مراد امام ہے کے علم کی کیا حد ہے؟'' امام نے فرمایا: ''تم نے ایک بہت ہی عظیم اور جسیم سوال کیا ہے! تو، لو سنو اس کا جواب'' فرمایا'' یہ دنیوی اور پہلا آسمان، دوسرے آسمان کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے کسی وسیع اور عریض بیابان میں زرہ کے حلقوں (کڑیوں) میں سے صرف ایک حلقہ پڑا ہوا ہو، اسی طرح دوسرا آسمان تیسرے کے مقابلے میں ایسا ہے اور تیسرا چوتھے کے...... اسی طرح چھٹا ساتویں کے مقابلے میں ایسے ہے اور ساتواں آسمان، ظلمت کے مقابلے میں ایسے ہے اور ظلمت، نور کے مقابلے میں، اور یہ سب مل ملا کر فضا کے مقابل میں ایک حلقہ کی مانند ہیں اور کائنات خداوندی کی یہ تمام چیزیں عالم یعنی امامؑ کے علم کے مقابلے میں ایسی ہیں جیسے تین پاؤ کے برابر رائی کے دانوں کو باریک پیسا جائے اور اس میں خوب پانی ملایا جائے اور اس قدر ملایا جائے کہ اس میں جھاگ پیدا ہو جائے اور تم وہاں سے اپنی انگلی پر چاٹنے کیلئے اٹھا لو۔ اور امام کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں ایسا ہے جیسے رائی کا ایک دانہ لو اور اسے کوٹ پیس کر اس میں پانی ملاؤ اور اس پانی سے جھاگ اٹھے اور تم اس جھاگ میں سے سوئی کی نوک پر جو کچھ اٹھاؤ۔'' پھر فرمایا: ''اس قدر قلیل ترین وضاحت کو کافی سمجھو......''۔

۳۔ اسی کتاب ''المحتضر'' ہی میں کتاب ''الاربعین'' سعد اوبلی کی روایت نقل کی گئی ہے وہ عمار بن خالد سے اور وہ اسحاق ارزق سے اور وہ عبدالملک بن سلیمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک حواری کے ذخیرے سے سریانی زبان میں لکھی ہوئی ایک تختی ملی، جس میں توریت سے منقول عبارت تحریر تھی، اور عبارت میں موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا تمام ماجرا درج تھا کہ کشتی میں سوراخ کرتے وقت ان کی کیا کیا باتیں ہوئیں، بچے کے قتل کے وقت موسیٰؑ نے خضرؑ سے کیا پوچھا، دیوار کھڑی کرتے وقت موسیٰؑ نے ان پر کیا اعتراض کیا وغیرہ، اور جب موسیٰؑ اپنی قوم میں واپس آئے تو ان کے بھائی ہارونؑ نے ان سے خضرؑ کے ساتھ مل کر سمندر کے عجائبات کے مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا، تو حضرت موسیٰؑ نے بتایا کہ: ''میں اور حضرت خضرؑ سمندر کے کنارے چل رہے تھے کہ اتنے میں ایک پرندہ ہمارے سامنے آن گزرا، اس نے اپنی چونچ میں سمندر کے پانی سے ایک قطرہ لیا اور اسے مشرق کی طرف پھینک دیا، ایک اور قطرہ لیا اسے مغرب کی جانب گرا دیا، تیسرا قطرہ لے کر آسمان کی طرف پھینکا اور چوتھا قطرہ زمین پر گرا دیا، پھر پانچواں قطرہ لے کر خود سمندر ہی میں ڈال دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر میں اور خضرؑ دونوں حیران و ششدر رہ گئے، میں نے حضرت خضرؑ سے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اتنے میں ہمیں ایک شکاری نظر آیا جو شکار کر رہا تھا اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا: ''آپ لوگوں کو حیران و پریشان دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟'' ہم

نے کہا: "ہم پرندے کے معاملے میں فکر اور تعجب میں ڈوبے ہوئے ہیں!" اس نے کہا میں ایک شکاری ہوں اور اس کے اشارے کو سمجھ گیا ہوں اور آپ لوگ اللہ کے نبی ہو کر اسے نہیں سمجھ پائے" ہم نے کہا: "ہمیں تو وہی کچھ معلوم ہے جو خدا نے ہمیں علم عطا کیا ہے" تو اس شکاری نے بتایا کہ یہ سمندری پرندہ ہے جس کا نام "مسلم" ہے کیونکہ جب وہ بولتا ہے تو "مسلم، مسلم" کہتا ہے اور اس نے اپنے تعجب آور انداز سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آخری زمانے میں ایک پیغمبر آئے گا جس کے علم کے مقابلے میں تمام مشرق و مغرب اور آسمان و زمین والوں کا علم ایسے ہوگا جیسے سمندر کے مقابلے میں پانی کا ایک قطرہ ہوتا ہے۔ اور اس نبی کے علم کا وارث اس کا چچازاد بھائی اور اس کا وصی ہوگا"۔ یہ سن کر ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اسی علم کو کافی جانا جو کسی کے پاس تھا اور اس واقعہ سے تعجب کرتے ہوئے آگے کو چل دیئے اور صیاد بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بعد میں ہمیں علم ہوا کہ وہ فرشتہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس اس لئے بھیجا تا کہ ہمیں اس طرف توجہ دلائے کہ ہم اپنے جس علمی کمال کا دعویٰ کرتے تھے درحقیقت ابھی تک وہ ناقص ہے"۔

۴۔ آلِ محمدؑ مرجع احکام ہیں

حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے آل محمدؐ کی ایک اور فضیلت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ (وہ اس کے حکم کا مرجع ہیں) اور حکم سے مراد یا تو احکام شرعیہ ہیں یعنی خداوند عالم کا مکلّفین کے افعال کے متعلق خطاب کہ اس میں اقتضا ہے یا تخییر یا اس سے مراد تنازعات اور جھگڑوں کے فیصلے ہیں۔

بہر حال معنی خواہ کوئی بھی ہوں اہل بیت اطہارؑ اسی لحاظ سے مرجع احکام ہیں کہ انہی کے پاس ان کا حل ہے اور ان ہی کے ذریعہ چھٹکارا اور نجات ہے۔ کیونکہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ وحی الٰہی سے حاصل کردہ ہے اور واقعہ کے مطابق ہے جس طرح واقعہ اس کے مطابق ہے اور جو کچھ بھی ہے سب عین حقیقت ہے اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں، آل محمدؐ اسی حق و حقیقت اور صواب و حقانیت کیلئے رہنما اور ہادی و مرشد ہیں، اس بات کی شہادت بحار الانوار میں مجالس شیخ مفیدؒ سے منقول وہ روایت دے رہی ہے جسے:

ا۔ اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے، امامؑ نے فرمایا: "ان لوگوں کے پاس جو بھی حق و صداقت ہے وہ سب انہوں نے ہم اہل بیتؑ سے لیا ہے۔ اور جو شخص بھی حق اور عدل کے فیصلے کرتا ہے اس کی چابی، اس کا دروازہ، اس کی ابتدا اور اس کا مؤسس امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی ہیں۔ وہ لوگ اگر فیصلوں میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ غلطی ان کی اپنی طرف سے ہوتی ہے اور اگر صحیح فیصلے کرتے ہیں تو یہ حضرت علیؑ کی طرف سے ہوتا ہے"۔

۲۔ اسی طرح کافی میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: "خداوند عالم لیلۃ القدر اور اس کی عظمت کے بارے میں فرماتا ہے "فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ" (دخان / ۴) اس سے وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس رات ہر حکمت والا امر اتارا جاتا ہے اور محکم دو چیزیں نہیں بلکہ ایک شئے ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص ایسا فیصلہ کرتا ہے جس میں اختلاف نہیں ہوتا تو وہ خدا کی طرف سے ہوتا

ہے۔ اور جو ایسا فیصلہ کرتا ہے جو حکم خدا سے مختلف ہوتا ہے اور وہ اسے صحیح سمجھتا ہے تو وہ طاغوت کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔
اس کی مکمل تفصیل خطبہ اول کی نویں فصل میں گزر چکی ہے۔

۳۔ ابو بصیر کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "ابو بصیر! ہم اہل بیتؑ ہیں، ہمیں خدا کی طرف سے "علم المنایا"، "علم البلایا" اور "فصل الخطاب" عطا ہوا ہے۔ اور ہم نے اپنے شیعوں کو اسی طرح سمجھادیا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے گھر والوں کو سمجھاتا ہے"۔ "فصل الخطاب" سے مراد وہ فیصلہ جات ہوتے ہیں جو حق اور باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ یا ایسے واضح فیصلے ہوتے ہیں جو اپنے مقصود پر دلالت کرتے ہیں یا وہ مخصوص فیصلے ہیں جو صرف اہل بیتؑ ہی کے ساتھ خاص ہیں اور ہر واقعہ کیلئے موجود ہوتے ہیں اور ہر مسئلہ میں مخالف کے مسئلہ کیلئے مسکت جواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ اگلے خطبے کی شرح میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے چند فیصلوں کو ذکر کیا جائے گا۔ ہماری اس ساری گفتگو سے واضح ہو گیا کہ ہر قسم کے احکام کا اہل بیتؑ سے لینا اور ہر معاملے میں ان کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اور احکام شرعیہ میں اپنی ناقص عقول اور فاسد رائے پر ڈٹے نہیں رہنا چاہئے، اور اپنے قیاسوں اور خود پسند آراء پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، جیسا کہ ہم خطبہ اول کی گیارہویں فصل میں بیان کر چکے ہیں۔

۴۔ حضرت ابوالحسن (امام موسیٰ کاظم) علیہ السلام سے بصائر الدرجات میں محمد بن حکیم کے ذریعہ سے روایت کی گی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "تم سے پہلے لوگ قیاس کی وجہ سے ہلاک ہو گئے، اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو اپنی بارگاہ میں اس وقت تک نہیں بلایا جب تک ان کیلئے تمام دین مکمل اور تمام حلال و حرام کو واضح نہیں فرمادیا، وہ اپنی زندگی میں تمہارے لئے وہ وہ احکام خدا کی طرف سے لائے جن کی تمہیں ضرورت تھی اور ان کے رحلت فرمانے کے بعد ان کے اور ان کے اہل بیتؑ کے ذریعے تمہیں ہر طرح کے احکام کیلئے بے نیاز کر دیا۔ کیونکہ آنحضرتؐ کے بعد ان کا تمام علم ان کے اہل بیتؑ کے پاس خزینہ کی مانند موجود ہے حتی کہ خراش تک کی دیت کا حکم بھی ان کے پاس موجود ہے"۔ امامؑ نے پھر فرمایا: "ابو حنیفہ ان لوگوں میں سے ہے جو کہتا ہے "حضرت علیؑ نے اس طرح کہا ہے لیکن میں یوں کہتا ہوں"۔ یعنی علیؑ کے مقابلے میں اپنے قول پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے مقدمات، فیصلے کیلئے بدکار قاضیوں کے پاس نہ لے جایا کرو اور جو شخص مقدمات کیلئے ایسے لوگوں کی طرف مراجعہ کرے گا تو وہ ایسے لوگوں میں شمار ہو گا جن کے متعلق خدا فرماتا ہے: "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ آمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ" (نساء / ۶۰) آیا آپؐ نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جو یہ گمان کرتے ہیں کہ جو آپؐ پر نازل ہوا اور جو آپؐ سے پہلے نازل ہوا سب پر ایمان لائے ہیں اور ان کی دلی تمنا یہ ہے کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل ابھی ساتویں اور آٹھویں صفت میں بیان ہو گی۔

۵۔ اہل بیتؑ کتابوں کی پناہ گاہ ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ آل محمدؐ کی تعریف و توصیف میں فرماتے ہیں کہ (اس کی کتابوں کی گھاٹیاں اور جائے پناہ ہیں) یہاں پر اہل بیتؑ کو "کہف" سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے معنی گھاٹی کے ہیں، چونکہ گھاٹی پہاڑ میں ہوتی ہے اور غار سے بڑی ہوتی ہے اور اس

میں گھر جیسا سکون ملتا ہے اور خطرات کے وقت اس کی پناہ لی جاتی ہے اسی لئے اہل بیتؑ کو کتابوں کی پناہ گاہ اور گھاٹیوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ کتابوں کے محافظ ہیں اور ان کے پاس کتابوں کی ہر طرح کی پناہ اور حفاظت حاصل ہے۔ اگر "کُتُبِه" کی ضمیر کو خدا کی طرف پلٹایا جائے تو اس سے خدا کی آسمانی کتابیں مراد ہوں گی، خواہ وہ قرآن پاک ہو یا اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابیں اور صحیفے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ حضرات آل محمدؐ قرآن کیلئے پناہ گاہ، اس کا ملجا و ماویٰ، اس کے حافظ و محافظ، اس کی تاویل و تنزیل کے عالم، اس کے ظاہر و باطن در باطن حتیٰ کہ اس کے سات باطنوں تک سے واقف ہیں، اسی طرح اس کے دیگر اوصاف مثلاً عموم و خصوص، مطلق و مقید اور محکم و متشابہ وغیرہ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پہلے خطبے کی سترہویں فصل کے ذیل میں اس بارے میں قدرے گفتگو ہو چکی ہے۔ مزید معلومات کیلئے اُدھر رجوع کیا جائے۔

رہی بات دوسری آسمانی کتابوں کی، تو اس بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں، جن میں سے چند ایک کو یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت رسول خداؐ سے سوال کیا کہ: "آسمان سے کتنی کتابیں نازل ہوئیں؟" تو آپؐ نے فرمایا: "ایک سو چار کتابیں، جن میں سے پچاس صحیفے حضرت شیثؑ پر، تیس صحیفے حضرت اخنوخ_ادریس_ پر، حضرت ابراہیمؑ پر دس صحیفے اور حضرت موسیٰؑ پر توریت سے پہلے دس صحیفے نازل ہو چکے تھے۔ اور توریت، انجیل، زبور اور قرآن مجید بھی نازل ہوئے حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے تمام تر مثالوں پر مشتمل تھے"۔

۲۔ بحار الانوار میں حضرت سلمان فارسیؓ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا: "افسوس اور سخت افسوس ہے ان لوگوں پر جو ہمارے حق معرفت کو نہیں سمجھتے اور ہمارے فضائل کا انکار کرتے ہیں، سلمان! یہ بتاؤ کہ حضرت محمدؐ افضل ہیں یا جناب سلیمانؑ بن داؤدؑ؟" سلمانؓ نے کہا: "جی، حضرت محمد مصطفیٰؐ افضل ہیں" پھر فرمایا: "سلمان! دیکھو نا، آصف بن برخیا میں اس قدر طاقت تھی کہ اس نے تخت بلقیس کو پلک جھپکنے کی دیر میں فارس سے سبا میں پہنچا دیا، جبکہ اس کے پاس کتاب کے کچھ حصے کا علم تھا۔ کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟! جبکہ میرے پاس اللہ کی ہزار کتابیں ہیں۔ جن میں سے پچاس صحیفے شیث بن آدمؑ پر، تیس صحیفے ادریسؑ پر، بیس صحیفے ابراہیم خلیلؑ پر نازل ہوئے جبکہ توریت، انجیل، زبور اور فرقان اس کے علاوہ ہیں" تو میں نے عرض کیا: "مولا! آپؑ سچ فرماتے ہیں" امیر المؤمنینؑ نے پھر فرمایا: "ہمارے امور اور ہمارے علوم میں شک کرنے والا ایسا ہے جیسے ہماری معرفت اور حقوق کا مذاق اڑانے والا ہوتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری ولایت اپنی کتاب میں کئی مقامات پر فرض کی ہے اور جن چیزوں پر عمل کرنا واجب قرار دیا ہے اسے بھی واضح طور پر بیان فرمایا ہے"۔

۳۔ کتاب "التوحید" میں ہشام بن حکم سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں نصاریٰ کا ایک لاٹ پادری حاضر ہوا اور کہنے لگا: "میں آپؑ کے قربان جاؤں! توریت، انجیل، اور انبیاءؑ کی دیگر کتابیں آپؑ کے پاس کہاں سے آگئیں؟" امامؑ نے فرمایا: "یہ ہمیں انبیاءؑ سے وراثت میں ملی ہیں، ہم ان کو اسی طرح ہی پڑھتے ہیں جس طرح انہوں نے پڑھا تھا اور اسی طرح بولتے ہیں جس طرح وہ بولتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر اپنی کوئی حجت ایسی

نہیں بنائی جس سے کوئی سوال کیا جائے یا کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ کہے "میں نہیں جانتا"۔

۴۔ بصائر الدرجات میں اسناد کے ساتھ ہے کہ ابو بصیر حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "اے ابو محمد! ہمارے پاس وہ صحیفے ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے "صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَ مُوْسٰى" "میں نے عرض کیا کہ ان سے مراد تختیاں ہیں؟" فرمایا: "ہاں"۔

یہ سب اس وقت ہے جب حضرتؑ کے کلام میں "کُتُبِهٖ" سے مراد آسمانی کتابیں ہوں اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو، لیکن اگر "کُتُبِهٖ" کی ضمیر پیغمبر اکرمؐ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو تو پھر اس سے مراد قرآن مجید اور دوسری وہ کتابیں ہوں گی جن کی طرف اخبار و احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً:

ا۔ بحار الانوار میں بصائر الدرجات سے اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ مجھ سے میرے والد محترم نے فرمایا، انہوں نے بھی ذکر کیا کہ جس سے بھی سنا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ: "ہمارے پاس رسول خداؐ تشریف لے آئے اور اس وقت آپؐ کے دائیں ہاتھ میں بھی ایک کتاب تھی اور بائیں ہاتھ میں بھی ایک کتاب تھی۔ جب آپؐ نے داہنے ہاتھ والی کتاب کو کھولا اور پڑھا "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ کتاب ہے بہشت والوں کیلئے ان کے نام اور ان کے باپ دادا کے ناموں کے ساتھ۔ ان میں نہ تو کسی کے نام کا اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کمی کی جا سکتی ہے"۔ اس کے بعد آپؐ نے بائیں ہاتھ والی کتاب کو کھولا اور پڑھا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ کتاب جہنم والوں کیلئے ان کے نام کے ساتھ اور ان کے باپ دادا اور قبائل کے ناموں کے ساتھ، نہ تو ان میں کسی کے نام کا اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کمی کی جا سکتی ہے"۔

۲۔ بصائر الدرجات ہی میں اسناد کے ساتھ اعمش سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ کلبی نے کہا: "اے اعمش! تم نے امیر المؤمنینؑ کے اہم ترین فضائل میں سے کوئی چیز سنی ہے؟" اعمش نے کہا: "مجھے موسیٰ بن ظریف نے بتایا ہے اور وہ عبایہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی علیہ السلام کو فرماتے سنا کہ: "میں جہنم تقسیم کرنے والا ہوں، لہذا جو لوگ میری پیروی کریں گے وہ مجھ سے ہوں گے اور جو لوگ میری نافرمانی کریں گے وہ جہنمی ہوں گے"۔ یہ سن کر کلبی نے کہا: "میرے پاس تو اس سے بھی بڑھ کر موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ حضرت رسول پاکؐ نے حضرت علیؑ کو ایک کتاب دی جس میں تمام اہل بہشت اور اہل دوزخ کے نام درج تھے وہ کتاب انہوں نے حضرت ام سلمہؓ کے پاس رکھ دی، جب حضرت ابو بکر خلیفہ بنے اور اسے حضرت ام سلمہؓ سے طلب کیا تو انہوں نے نہ دی، جب عمر خلیفہ بنے اور ان سے وہ کتاب مانگی مگر انہوں نے نہ دی لیکن جب علیؑ خلیفہ بنے تو انہیں واپس لوٹا دی"۔

۳۔ اسی کتاب میں اسناد کے ساتھ ابو بصیر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "اے ابو محمد! ہمارے پاس "جامعہ" ہے، لوگوں کو کیا معلوم کہ جامعہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا: "قربان جاؤں! "جامعہ" کیا ہوتا ہے؟" تو آپؑ نے فرمایا: "ایک صحیفہ ہے جس کی لمبائی رسول خداؐ کے ہاتھوں سے ستر ہاتھ ہے، آپؐ نے اپنی زبانی حضرت علیؑ کو تحریر کرایا اور انہوں نے اسے اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا، اس میں حلال و حرام بھی ہے اور ہر وہ چیز بھی جس کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے حتیٰ کہ چوٹ کی دیت بھی"۔

۴۔ احتجاج طبرسیؒ میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک طویل حدیث منقول ہے کہ آپؑ فرماتے تھے: "ہمارا علم "غابر"

ہے اور "مذبور" ہے اور "دلوں کے نکات" اور "کانوں میں ٹکرانے والی آوازیں" ہیں۔ ہمارے ہی پاس "جفر احمر" اور "جفر ابیض" اور "مصحف فاطمہ علیہا السلام" ہے۔ اور ہمارے پاس ہی "جامعہ" ہے جس میں لوگوں کی ضروریات کی تمام چیزوں کا علم ہے"۔ امام سے اس قول کی تفسیر پوچھی گئی تو آپؑ نے فرمایا: "غابر" سے مراد مستقبل کا علم ہے اور "مذبور" سے مراد ماضی کا علم ہے۔ "دلوں کے نکات" سے مراد "الہام" ہے اور "کانوں سے ٹکرانے والی آوازیں" فرشتوں کی باتیں ہوتی ہیں جنہیں ہم سنتے تو ہیں لیکن فرشتوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں "جفر احمر" وہ صندوق ہے جس میں حضرت رسول خداؐ کے ہتھیار ہیں اور قائم آل محمدؑ کے ظہور سے قبل اس سے کوئی ہتھیار نہیں نکالا جائے گا۔ "جفر ابیض" وہ صندوق ہے جس میں موسیٰ کی توریت، عیسیٰ کی انجیل اور داؤدؑ کی زبور ہے، اس کے علاوہ اولین کی تمام کتابیں ہیں۔ "مصحف فاطمہؑ" وہ ہے جس میں آئندہ کے حالات ہیں، ان تمام لوگوں کے نام ہیں جو کسی چیز کے مالک بنیں گے اور جو نہیں بنیں گے، غرض قیامت تک کے تمام حالات درج ہیں، اور "جامعہ" وہ کتاب ہے جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے، اسے رسول خداؐ نے اپنی زبانی حضرت علیؑ سے تحریر کرایا، خدا کی قسم اس میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی قیامت تک لوگوں کو ضرورت ہو گی، حتیٰ کہ اس میں چوٹ کی دیت اور ایک کوڑے بلکہ نصف کوڑے تک کا ذکر موجود ہے"۔

۵۔ بحار الانوار میں بصائر الدرجات سے منقول ہے اسناد کے ساتھ ابو بصیر سے روایت کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: "آپؑ کے قربان جاؤں، ایک مسئلہ پوچھنے کیلئے حاضر ہوا ہوں! آیا یہاں اور تو کوئی نہیں ہے جو میری بات سن رہا ہو؟ اس بات پر امام نے میرے اور ایک گھر کے درمیان سے پردہ اٹھادیا_ اس پردہ اٹھانے کی بھی شاید کوئی مصلحت تھی_ پھر فرمایا: "ابو محمد! پوچھ کیا پوچھتے ہو؟ میں نے عرض کیا آپؑ کے قربان ہو جاؤں! شیعہ حضرات باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے علی علیہ السلام کو علم کا ایک ایسا باب تعلیم فرمایا جس سے ہزار باب اور کھولے جاسکتے ہیں" آیا یہ سچ ہے؟" امام نے فرمایا: "تم تو ایک باب کی بات کرتے ہو رسول خداؐ نے تو علیؑ کو ہزار باب تعلیم فرمائے تھے۔ جن میں سے ہر ایک باب سے ہزار ہزار باب اور کھولے گئے ہیں" یہ سن کر میں نے کہا: "خدا کی قسم یہ ہے علم!!" جب میں نے یہ کہا تو آپؑ گھڑی بھر کیلئے زمین پر لکیریں مارنے لگے پھر فرمایا: "ہاں علم تو ہے لیکن وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو"_ یعنی یہ اس سے بھی بالاتر ہے_ پھر فرمایا: "ابو محمد! اس کے علاوہ ہمارے پاس "جامعہ" بھی ہے، لوگوں کو کیا معلوم کہ "جامعہ" کیا ہے؟" میں نے عرض کیا: "صدقے جاؤں! وہ "جامعہ" کیا چیز ہے؟" آپؑ نے فرمایا: "ایسا صحیفہ ہے جس کی لمبائی رسول اللہؐ کے ہاتھوں کے مطابق ستر ہاتھ ہے۔ اسے آپؐ نے اپنی زبانی حضرتؑ سے لکھوایا اور انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لکھا، اس میں ہر حلال و حرام ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے حتیٰ کہ چوٹ کی دیت بھی ہے" پھر اپنا ہاتھ مجھ پر مار کر فرمایا: "ابو محمد! اجازت ہے؟" میں نے عرض کیا: "قربان جاؤں! آپؑ کو اجازت ہے جو چاہیں کریں" امام نے مجھ پر اپنے ہاتھوں سے زور دے کر_ گویا غصے کی حالت میں ہوں_ فرمایا: "حتیٰ کہ اس کی دیت کا حکم بھی ہے"۔ راوی نے کہا، میں نے عرض کیا: "خدا کی قسم یہ ہے علم!" امام نے فرمایا: "علم تو ہے لیکن صرف یہی نہیں!" پھر چپ ہو رہے۔ اس کے بعد فرمایا: "ہمارے پاس جفر بھی ہے، اور لوگوں کو کیا معلوم کہ جفر کیا ہوتا ہے؟ انہیں کیا پتہ کہ بکری کی کھال کے برابر (چھوٹا) ہے یا اونٹ کے چمڑے کے برابر (بڑا) ہے؟" میں نے عرض کیا: "قربان جاؤں! پھر جفر ہے کیا

چیز؟" آپ نے فرمایا: "سرخ چمڑے کا صندوق ہے جس میں تمام انبیاء اور تمام اوصیاء کا علم ہے" میں نے کہا: "خدا یہ ہے علم!" امام نے فرمایا: "یہ بھی علم ہے لیکن صرف یہی نہیں!" پھر تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا: "ہمارے پاس مصحف فاطمہ بھی ہے! اور دنیا والوں کو کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟ اس قرآن کا تین گنا ہے، خدا کی قسم اس میں اس قرآن کے علاوہ باتیں ہیں جو تمہارے پاس ہے اور اس قرآن سے ایک حرف بھی نہیں ہے بلکہ یہ وہ مصحف ہے جسے اللہ نے حضرت فاطمہ کو لکھوایا ہے......" میں نے کہا: "خدا کی قسم علم یہ ہے!" امام نے فرمایا: "بے شک یہ علم ہے لیکن صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی ہے" پھر کچھ دیر کیلئے خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے بعد فرمایا: "ہمارے پاس ان چیزوں کا علم بھی ہے جو ہو چکی ہیں اور اس کا علم بھی ہے جو قیامت تک ہونے والا ہے" میں نے کہا: "خدا! یہ ہے علم!" آپ نے فرمایا: "بے شک یہ بھی علم ہے لیکن صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی ہے" میں نے کہا: "قربان جاؤں! تو وہ کونسا علم ہے؟" فرمایا: "جو کچھ دن کو ہوتا ہے یا جو رات کو واقع ہوتا ہے، ایک کے بعد دوسرا امر اور ایک کے بعد دوسری چیز اور جو قیامت تک ہونے والا ہے"۔

علامہ مجلسیؒ بحار میں فرماتے ہیں کہ: "حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "اس میں موجودہ قرآن سے ایک حرف بھی نہیں ہے" اسکا مطلب یہ ہے کہ اس میں ماکان ومایکون کا علم ہے"۔

چند ایک سوال: قرآن مجید میں بھی تو بعض خبریں موجود ہیں، تو اس میں اور اس میں کیا فرق ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے شاید اس میں نہ ہو۔

اسی طرح ایک سوال یہ بھی ہے کہ: بعض روایات کے مطابق مصحف فاطمہ بھی احکام پر مشتمل ہے، تو پھر اس میں اور قرآن مجید میں کیا فرق ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید اس میں وہ احکام ہوں جو قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں وہ تمام احکام اور خبریں ہیں جن کا تعلق گزشتہ اور قیامت تک کیلئے آئندہ کے ساتھ ہے اور مصحف فاطمہ میں بھی یہی چیزیں ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اس سے مراد یہ ہو کہ "جو ہم قرآن سے سمجھتے ہیں نا کہ جو وہ قرآن سے سمجھتے ہیں" اس لئے امام نے فرمایا: "تمہارے اس قرآن کا تین گنا ہے" اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد لفظ قرآن ہو۔ اور یہ بھی کہ اکثر اخبار و روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصحف فاطمہ فقط اخبار پر مشتمل ہے۔ جس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ اس میں قرآن کے بیان شدہ احکام نہ ہوں۔

ایک زبردست اشکال: یہاں پر ایک زبردست اشکال پیدا ہوتا ہے کہ: امامؑ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا "ہمیں گزشتہ اور قیامت تک کے حالات کا علم ہوتا ہے"۔ اور ائمہ اطہارؑ تمام گزشتہ اور آئندہ کے شرائع اور احکام کو جانتے ہیں۔ اسی طرح اس بارے میں بہت سی روایات مذکور ہیں، تو پھر ان کیلئے اور کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے جو ان کیلئے ہر دن اور رات کو نئی صورت میں پیش ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس حدیث کا آخری حصہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی کئی وجوہات ہیں:

۱۔ علم صرف وہی نہیں ہوتا جو سننے یا کتابوں کے پڑھنے سے یا ان کے یاد کر لینے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم نہیں بلکہ تقلید

ہے، علم تو وہ ہوتا ہے جو فیض الٰہی کی صورت میں مؤمن کے دل پر نازل ہوتا رہتا ہے، روز بروز اور لحہ بہ لحہ، جس سے حقائق کا انکشاف ہوتا اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے، سینہ کشادہ ہوتا ہے اور دل نورانی ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جو سابق میں بیان ہو چکا ہے وہ بھی صحیح ہے اور یہ جو بیان ہوا ہے وہ اس کیلئے تاکید مزید اور قند مکرر کا کام دیتا ہے اور جو ایمان ویقین اور کرامت وشرافت کے اضافے کا موجب ہوتا ہے، کیونکہ انہیں یہ علم انبیاء ومرسلینؑ کے واسطے کے بغیر فیض الٰہی کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

ب۔ ائمہ اطہارؑ کے پاس مجمل ہوتا ہے اور یہ علم جو فیض الٰہی کی صورت میں ہوتا ہے وہ تفصیلی ہوتا ہے اگرچہ ان کے پاس علم کا جو اصولی مواد ہوتا ہے وہ اس سے تفصیلی کیفیت کا استخراج بھی کر سکتے ہیں۔

ج۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی زندگی کی دو منزلیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ حیات جسمانی ہوتی ہے اور دوسری ان کی وفات کے بعد کی زندگی ہوتی ہے جس میں انہیں معارف ربانی کی ایسی معراج ہوتی ہے جس کے کمال کی کوئی حد وانتہا نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ عرفان باری تعالیٰ اور اس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

علامہ مجلسیؒ کیا فرماتے ہیں اس آخری وجہ کو علامہ مجلسیؒ زیادہ قوی سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: "یہی وجہ بہت سی روایات سے بھی ظاہر ہوتی ہے اور ظاہر امر یہ ہے کہ جب ائمہ اطہارؑ کو ان کی ابتدائے امامت میں علم حاصل ہوتا ہے تو وہ اس مرتبہ پر رک نہیں جاتے بلکہ مزید قرب اور اطاعت کی وجہ سے ان کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور معرفت رب میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ تو عام مخلوق کو بھی حاصل ہوتا ہے حالانکہ عام مخلوق کی قابلیت اور استعداد ناقص ہوتی ہے اور ائمہ اطہارؑ ہر لحاظ سے اولیٰ اور کامل تر ہوتے ہیں اور ان میں استعداد اور قابلیت حد کمال پر ہوتی ہے"۔ علامہؒ پھر فرماتے ہیں کہ: "ائمہ اطہار کے روزانہ ستر مرتبہ یا زیادہ مرتبہ توبہ اور استغفار کی اور وجوہات میں سے شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر لحہ درجہ بدرجہ عرفان کی بلندیوں پر فائز ہوتے رہتے ہیں۔ جب اس سے پہلے کے درجے کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ درجہ اس موجودہ درجے سے کم تھا۔ اور اس وقت نقص کے درجے پر تھے اسی لئے وہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کیا کرتے تھے"۔

۶۔ آل محمدؐ دین کا پہاڑ ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ نے اہل بیتؑ اور آل محمدؐ کی چھٹی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ (اس کے دین کے پہاڑ ہیں) شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں کہ: "وہ دین پر قائم ہیں اور اس سے سر مو انحراف نہیں کیا ہوا۔ یا پھر یہ کہ دین انہی کی وجہ سے قائم ہے، جس طرح پہاڑوں کی وجہ سے زمین اپنی جگہ پر قائم ہے اگر پہاڑ نہ ہوتے تو وہ زمین اپنے اہل کے ساتھ ہلتی اور کانپتی رہتی"۔

شارح بحرانیؒ فرماتے ہیں کہ: "حضرت امیرؑ نے آل محمدؐ کو دین کے پہاڑ سے تعبیر کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان ہستیوں کی وجہ سے دین، شیطانی رخنوں، تبدیلیوں اور تحریفات سے محفوظ ہے۔ جیسے کوئی ڈرا ہوا انسان جو کسی سے ڈر کر پہاڑ کی پناہ لیتا ہے"۔

قول مصنفؒ: دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں، اور دونوں کا مقصود ایک ہے اور وہ یہ کہ: ان کا وجود سبب بقائے دین

اور مسلمانوں کے امر کو منظم کرنا، دین کو غالیوں کی تحریف، باطل کے پیروکاروں کی دستبرد اور جاہلوں کی تاویل سے محفوظ رکھنا ہے۔ جیسا کہ بحار الانوار میں قرب الاسناد سے منقول ہے کہ ہارون بن صدقہ امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ، حضرت رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ: "میری امت کے ہر بعد میں آنے والے گروہ میں میرے اہل بیتؑ کے کچھ عادل افراد موجود ہوں گے جو دین کو غالیوں کی تحریف باطل کے پیروکاروں کی دستبرد اور جاہلوں کی تاویل سے محفوظ رکھیں گے یاد رکھو! کہ تمہارے امام خدا تک تمہارے نمائندے ہیں لہذا اچھی طرح دیکھ بھال کر لو کہ تم اپنے دین اور اپنی نمازوں میں کسے نمائندہ بنا رہے ہو"۔

علل الشرائع میں اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے روایت ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "خداوند عالم نے زمین کو کسی عالم کے بغیر نہیں چھوڑا۔ یعنی امام کے بغیر نہیں چھوڑا۔ جو دین خداوندی میں کمی اور بیشی کو سمجھتا ہے۔ لہذا جب مؤمنین دین میں کوئی زیادتی کریں گے تو وہ اسے اس سے بچائے گا اور اس سے کمی کریں گے تو وہ اس کی تلافی کرے گا، اگر ایسا نہ ہو تو مسلمانوں کیلئے دین کا معاملہ مشتبہ ہو کر رہ جائے"۔ ابو حمزہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "زمین کی بقا اس بات میں ہے کہ اس میں ایسا شخص موجود رہتا ہے جو حق کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ جب لوگ اس میں زیادتی کرنے لگتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ زیادتی کر رہے ہیں اور جب اس میں کمی کرنے لگتے ہیں تو کہتا ہے کہ کمی کر رہے ہیں اور جب حق کو بجا لاتے ہیں تو ان کی تصدیق کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حق کو باطل سے نہ پہچانا جا سکے"۔ اس بارے میں اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔

۷۔ آل محمدؐ دین کا خم سیدھا کرتے ہیں

۸۔ آل محمدؐ دین کے اضطراب کو دور کرتے ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ فرماتے ہیں (انہی کے ذریعے اس کی پشت کا خم سیدھا کیا اور ضعف کی کپکپی دور کی) اس طرح سے آپؑ نے آل محمدؐ کی دو اور صفات کی نشاندہی کی ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ اگر ضمیروں کو دین کی طرف لوٹایا جائے، جو کہ واضح ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بیت اطہارؑ دین کے قائم رہنے کا سبب اور اس کے اضطراب کو دور کرنے کا موجب ہیں۔ جیسا کہ ابھی آپ جان چکے ہیں۔

اگر ضمیروں کو پیغمبر اکرمؐ کی طرف لوٹایا جائے تو پھر اس بات کی طرف اشارہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آنحضرتؐ کا پشت پناہ بنایا ہے، اور وہ آنجنابؐ کے ہر قدم پر مدد کرتے رہے اور "پشت کے خم کا سیدھا کرنے" سے مراد وہ کمزوری ہے جس سے آغاز اسلام میں آپؐ دوچار تھے۔ اور ضعف کی کپکپی اور اضطراب سے مراد خوف کی شدت ہے۔ تو گویا معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آل محمدؐ کے تعاون سے آنحضرتؐ کے اس خوف کو دور کر دیا جس کا اندیشہ آنحضرتؐ کو مشرکین سے تھا کہ وہ دین کو تباہ کر دیں گے۔

آل محمدؐ کا ان دو صفات سے متصف ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ انہوں نے پیغمبرؐ کی نصرت اور ان کے دین کی تقویت کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ قول سے اور نہ ہی فعل سے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: "وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ" (انفال / ۶۲) اور اگر وہ لوگ آپ کو

انْ يُّرِيْدُوْا انْ يَّخْدَعُوْكَ فَانَّ حَسْبَكَ اللهُ هُوَ الَّذِيْ ايَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ" (انفال / ۶۲) اور اگر وہ لوگ آپ کو فریب دینا چاہتے ہیں تو (کچھ فکر نہیں) خدا آپ کیلئے یقیناً کافی ہے، وہی تو وہ خدا ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مؤمنین سے تمہاری تائید کی) شیعہ سنی مفسرین حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ عرش پر یہ لکھا ہوا ہے کہ "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا وَحْدِيْ لَا شَرِيْكَ لِيْ وَمُحَمَّدٌ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ اَيَّدْتُهُ بِعَلِيٍّ" "میرے علاوہ کوئی معبود نہیں، محمدؐ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے علیؑ کے ذریعہ ان کی مدد کی"۔ اسی لئے خداوند عالم فرماتا ہے: "هُوَ الَّذِيْ ايَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ" (ایضاً) اس آیت میں "نصر" یعنی مدد خود حضرت علیؑ ہیں۔ اور پھر مؤمنین کے زمرے میں بھی داخل ہیں، تو گویا علیؑ دونوں طرح سے پیغمبرؐ کے معاون اور مددگار ہیں۔

چنانچہ اسی مضمون کی بہت سی روایات فریقین کی طرف سے موجود ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" (انفال / ۶۴) اے پیغمبرؐ! آپ کو تو بس خدا اور جو مؤمنین آپؐ کے تابع فرمان ہیں کافی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور "المومنین" سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اگر پیغمبرؐ اسلام کو دین کی سربلندی کیلئے کسی کی نصرت کی ضرورت ہوئی تو وہ علی بن ابی طالبؑ ہی تھے جنہوں نے آنحضرتؐ کی ہر مقام پر زبان اور ہاتھوں سے امداد فرمائی اور اعلاء کلمہ اسلام میں آپؑ کی جدوجہد بیان سے باہر ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

بَدْرٌ لَّهٗ شَاهِدٌ وَّالشِّعْبُ مِنْ اُحُدٍ وَالْخَنْدَقَانِ وَيَوْمُ الْفَتْحِ انْ عَلِمُوْا

اس سے ملتا جلتا شعر کسی اردو شاعر کا ہے کہ ۔

بدر و اُحد کے، خیبر و خندق کے تذکرے نازاں ہیں جانشین محمدؐ کی تیغ پر

علیؑ کی اس نصرت و حمایت کی دلیل کیلئے یہ کوئی تھوڑی بات نہیں ہے کہ شب ہجرت آپؑ نے خطرات کو مول لے کر اور اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے پیغمبرؐ کے بستر پر سو کر اپنی حمایت اور نصرت پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور اس قدر جاں نثاری کا ثبوت دیا کہ خدا کو اس پر فخر و مباہات سے کہنا پڑا: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ" (بقرہ / ۲۰۷) اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی رضا حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔ جب آپؑ جنگ خندق میں عمرو بن عبدود کے مقابل گئے تو خداوند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَكَفَى اللهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ" (احزاب / ۲۵) اور اللہ نے اپنی مہربانی سے مؤمنین کو لڑنے سے بچالیا۔ یعنی "علی بن ابی طالبؑ کے ذریعے" اور جب آپؑ نے عمرو بن عبدود کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو بنابر روایات کثیرہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ضَرْبَةُ عَلِيٍّ افْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ" یعنی علیؑ کا ایک وار ثقلین کی عبادت سے افضل ہے۔ یہ تو تھی امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ کی نصرت و حمایت اور جاں نثاری کی بات، دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام نے بھی پیغمبرؐ اور ان کے دین کی نصرت و حمایت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور اپنی مقدور بھر کوششیں احیاء دین اور احکام سید المرسلین کیلئے صرف کر دیں، ان میں سے بعض نے تو جہاد و قتال کے ذریعے جیسے سید الشہداء امام حسینؑ تھے اور بعض نے زبان اور بیان کے ذریعے جیسے ان کے علاوہ دوسرے ائمہ اطہار تھے۔ اللہ کے بے پایاں درود و سلام ہوں ان پر۔ اور ان کی یہ جدوجہد خوف اور تقیہ کے باوجود

رہی۔ لیکن جوں ہی کسی معصوم کو خوف اور تقیہ سے کچھ فرصت ملتی تو انہوں نے خوب کھل کر دین کی نشر واشاعت کی جیسے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں انہیں احکام اسلام کے اظہار اور شریعت مطہرہ کی نشر واشاعت کا موقعہ ملا، تقیہ کی وہ ضرورت نہیں تھی جو سابقہ یا بعد میں آنے والے ائمہ علیہم السلام کے دور میں تھی۔ تو انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں شریعت مطہرہ کے احیاء اور سنت نبوی کے قائم کرنے میں صرف کر دیں۔ جو اظہر من الشمس ہیں چنانچہ انہی کے دور میں چار سو کتابیں لکھی گئیں جو "اصول اربعماۃ" کے نام سے مشہور ہیں۔ اور اس وقت ان کے حلقہ درس میں چار ہزار افراد شریک ہوئے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ انہی کے وجود سے دین کو استقامت ملی، شریعت خاتم المرسلین کو استحکام نصیب ہوا، اور جب حضرت قائم آل محمدؑ اس دنیا میں تشریف لائیں گے تو زمین کو عدل وانصاف سے اسی قدر پُر کر دیں گے جتنا کہ اس سے پہلے ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ فعجل اللهم ظهوره۔ از مترجم

پانچویں فصل

وَمِنْهَا يَعْنِي قَوْمًا آخَرِيْنَ ۔ مِنْهَا فِي الْمُنَافِقِيْنَ

زَرَعُوْا الْفُجُوْرَ وَ سَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَ حَصَدُوْا الثُّبُوْرَ لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ وَلَا يُسَوّٰى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَدًا هُمْ أَسَاسُ الدِّيْنِ وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ إِلَيْهِمْ يَفِيْءُ الْغَالِيْ وَ بِهِمْ يَلْحَقُ التَّالِيْ وَ لَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ وَ فِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ، الْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلٰى أَهْلِهٖ وَنُقِلَ إِلٰى مُنْتَقَلِهٖ

اسی خطبے کا ایک حصہ جو دوسروں کے بارے میں ہے

بروایتے۔ جو منافقوں کے بارے میں ہے

انہوں نے فسق وفجور کی کاشت کی، غفلت وفریب کے پانی سے اسے سینچا اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی، اس امت میں سے آل محمدؐ پر کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں، وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے، وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والوں کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کی خصوصیات انہی کیلئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبرؐ کی وصیت اور انہی کیلئے نبی کی وراثت ہے اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ منتقل ہو گیا۔

تشریح

کچھ غیروں کے بارے میں

"حَصَدَ" کھیتی کا پھل دینا، "غلو" حد سے تجاوز کرنا، "تَالِيٍ" پیچھے آنے والا، "اَلْآنَ" ظرف زمان ہے کہ جس میں ہم رہ رہے ہیں یعنی "اب، اس وقت" مبتدا ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے۔ "اِذْ" خبر ہونے کی وجہ سے محلاً مرفوع ہے اور اپنے بعد کے جملے کی طرف مضاف ہے، جس کے معنی ہیں "اب یہ حق کے اپنے اہل کی طرف رجوع کرنے کا وقت ہے" اور یہ بھی امکان ہے کہ "اَلْآنَ" خبر مقدم ہو اور "اِذْ" مبتدا ہو، جیسے قرآن مجید میں ہے: "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ" (آل عمران / ۱۶۴) یقیناً اللہ نے مؤمنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ یعنی مؤمنین پر اللہ کے احسانات میں سے آنحضرتؐ کی بعثت کا وقت ہے، اسی بات کو زمخشری نے بھی بیان کیا ہے۔ اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "اِذْ" بمعنی "قَدْ" کے ہے، اور یہ معنی کے بھی زیادہ قریب ہے، اور بعض مفسرین نے اسی نظریئے کو اپنایا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ" (زخرف / ۳۹) آج تم کو (عذاب کی کمی میں) کوئی، فائدہ نہیں پہنچا سکتا جبکہ تم ظلم کر چکے ہو۔

یا تاکید اور زیادت کیلئے ہے اور ابی عبیدہ اور اور ابن قتیبہ کا موقف ہے۔ ارشادِ باری ہے: "وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ" (بقرہ / ۳۰) اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔

"قَوْمٌ آخَرِيْنَ" کون لوگ ہیں؟

حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے اس فصل میں اپنے خطبے کے آغاز میں آل محمدؐ کے غیروں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد خوارج ہیں، جبکہ بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ منافقین مراد ہیں۔ لیکن شارح بحرانی فرماتے ہیں: "احتمال یہ ہے کہ آپؑ کا یہ کلام ان لوگوں کیلئے ہے جو آپؑ کے ساتھ دشمنی اور مخالفت کر کے آپؑ کی اطاعت سے خارج ہو گئے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ اپنے دین میں پکے اور اس کے مدد و معاون ہیں۔ اور اس میں "قاسطین" یعنی معاویہ اور اس کے ہم نوا اور "مارقین" یعنی خوارج اور ان کے ہم مسلک شامل ہیں۔ کیونکہ ہر گروہ اپنے زعم باطل کے مطابق یہی سمجھتا تھا کہ علیؑ کے ساتھ جنگ میں حق بجانب ہیں اور دین حق کی نصرت کر رہے ہیں"۔ جبکہ شارح معتزلی کہتے ہیں: "آپؑ کا یہ اشارہ منافقین کی طرف نہیں ہے جیسا کہ سید رضی نے بیان فرمایا ہے، بلکہ امامؑ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو آپؑ پر غلبہ پانے اور آپؑ کے حق کا انکار کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ جیسا کہ معاویہ وغیرہ، ہو سکتا ہے کہ سید رضی نے یہ بات سمجھ لی ہو اور اسے کنایہ کے طور پر ذکر کیا ہو!"۔

بہر حال صورت حال خواہ کچھ بھی ہو امامؑ نے ان لوگوں کے فسق و فجور اور حق سے انحراف کو استعارے کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ کیا خوبصورت استعارہ ہے، اس استعارے کو بطور ترشیح بیان فرماتے ہیں کہ (انہوں نے فسق و فجور کی کاشت کی) کیونکہ کھیتی نام ہی اس بات کا ہے کہ زمین میں دانہ ڈالا جائے، جسے آپؑ نے اپنے حسن استعارہ سے فجور کے بیج سے تعبیر کیا ہے جو ان کے دلوں کی سرزمین میں ڈالا گیا ہے، اور چونکہ وہ بیج جب دلوں میں اُگا، پھلا، پھولا، پروان چڑھا اور اپنے ارد گرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو اسے کھیتی سے تشبیہ دی جو زمین میں بڑھتی، پھلتی اور پروان چڑھتی ہے۔ چونکہ ان کا فسق و فجور اور گمراہی پر ڈٹے رہنا ان کے فریب اور مسلسل غفلت کی وجہ سے ہے لہذا فرمایا (غفلت اور فریب کے پانی سے اسے سینچا) آپؑ نے اسے پانی کے ساتھ سینچنے سے اس لئے تشبیہ دی چونکہ پانی جس طرح کھیتی کی حیات، زندگی، نشوونما کا سبب اور پروان چڑھنے کا اہم عنصر ہوتا ہے اسی طرح غفلت اور فریب بھی ان کے فجور کی حیات اور ان کی سرکشی کے پروان چڑھنے کا اہم عنصر ہیں۔ اسی لئے آپؑ نے یہاں پر آبیاری کے حسن استعارہ کو استعمال کیا ہے جو پانی کی خاصیت ہے اور ان کی طرف اس کی نسبت ہے۔ چونکہ اس فجور کا انجام دنیا میں اولیاء اللہ کی تلوار سے ہلاکت اور تباہی اور آخرت میں جہنم کی آگ ہے لہذا اس انجام کو خوبصورت انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ (اور اس سے ہلاکت کی جنس حاصل کی) ہلاکت، فجور کا پھل ہے۔ اور گویا انہوں نے فجور کو بویا اور اس سے ہلاکت کا پھل حاصل کیا۔

آل محمدؑ پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا

حضرت امیرؑ دشمنوں کے معائب بیان کرنے کے بعد دوستوں کے مناقب بیان فرماتے ہیں کہ (اس امت میں سے کسی کو آل محمدؑ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا) نہ ہی کوئی غیر ان کا ہم پلہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی ان کی برابری کر سکتا ہے۔ اس کیلئے بہت سے دلائل ہیں جن کو روایات میں ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ:

۱۔ بحار الانوار میں اسناد کے ساتھ حضرت امیر المؤمنینؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "ہم اہل بیت ہیں، ہمارا قیاس لوگوں پر نہیں کیا جاسکتا"۔ یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوگیا اور سیدھا عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس پہنچ گیا اور یہ کچھ انہیں بتادیا، تو انہوں نے کہا: "علیؑ نے سچ کہا ہے! کیا پیغمبرؐ کو لوگوں پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟" یعنی جس طرح پیغمبرؐ کو لوگوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اسی طرح آل پیغمبرؐ کو بھی لوگوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ پھر ابن عباسؓ نے فرمایا: "یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کی شان میں اتری ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ" (بینہ / ۷) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال انجام دیئے، یہی لوگ ہی سب سے بہترین مخلوق ہیں۔

۲۔ عبدالعزیز بن یحییٰ جلودی کی کتاب "الخطب" سے حسن بن سلیمان نے اپنی کتاب "المحتضر" میں نقل کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے کے دوران یہ فرمایا: "مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ! کیونکہ میں رسول اللہؐ (کے علم) کا خزانہ ہوں، اور میں نے ہی فتنہ کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں۔ اس کے ظاہر سے بھی اور اس کے باطن سے بھی۔ تم اس سے پوچھو جس کے پاس علم المنایا ـ موتوں کا علم ـ علم البلایا ـ مصیبتوں اور آزمائشوں کا علم ـ اور وصیتوں کا علم ہے، جو فصل الخطاب کو جانتا ہے۔ تم مجھ

سے پوچھو، کیونکہ میں ہی حقیقی طور پر مؤمنوں کا سردار ہوں۔ جو بھی گروہ کسی سو کی ٹولی کو گراتا یا سو کو گمراہ کرتا ہے میں اس کے قائد کو بھی جانتا ہوں اور اس کے سائیں کو بھی، مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میرے لئے مسند بچھادی جائے اور میں اس پر بیٹھ کر فیصلے کروں تو توریت والوں کے درمیان توریت سے، انجیل والوں کے درمیان انجیل سے، زبور والوں کے درمیان زبور سے اور فرقان_ قرآن_ والوں کے درمیان قرآن سے فیصلہ کروں گا......"۔

یہ سن کر ابن گوا کھڑا ہو گیا اور امیر المؤمنینؑ کے پاس آ گیا جبکہ آپؑ خطبہ بیان فرمارہے تھے کہنے لگا۔ "یا امیر المؤمنینؑ! مجھے آپ اپنے بارے میں بھی بتایئے؟" یہ سن کر حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: "تیرا برا ہو! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے منہ میاں مٹھو بنوں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے منع کیا ہے۔ حالانکہ میری کیفیت یہ ہے کہ جب میں حضرت رسول کریمؐ سے سوال کرتا تھا تو مجھے عطا فرماتے اگر خاموش رہتا تو از خود ابتدا فرماتے، میرے پہلوؤں میں علم_ سمندر کی مانند_ ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور......

......ہم اہل بیتؑ ہیں ہمیں کسی کے ساتھ قیاس نہیں کیا جاسکتا"۔

بہر حال اہل بیت پیغمبرؐ اور آل محمد علیہم السلام وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کا کسی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان پر کسی کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ کوئی شخص ان کے مراتب کو پہنچ سکتا ہے نہ ان کے مقامات تک کسی کو رسائی حاصل ہے (اور جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے) درحقیقت یہ جملہ علت پیش کر رہا ہے کہ آل محمدؐ اور ان کے غیروں کے درمیان قیاس مساوات کرنا باطل ہے۔

مختصر مگر جامع جملہ

اگرچہ یہ جملہ مختصر ہے لیکن اس قدر جامع ہے کہ اس میں کئی اس قدر قیمتی مطالب پوشیدہ ہیں جن میں سے ہر ایک، کائنات کی قیمت کا حامل ہے۔ ان میں سے چند ایک مطالب پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے:

۱۔ نعمتیں خواہ موجود ہوں یا غیر موجود، ظاہر ہوں یا باطن، آل محمدؐ ان سب کیلئے ولی نعمت کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ آل محمدؐ کی نعمتیں اس وقت تک جاری وساری ہیں جب تک دنیا قائم ہے اور بندگان الٰہی ان کے پروردہ نعمت ہیں، نہ تو اس میں کسی وقت کی قید اور شرط ہے نہ کسی آن وزمان کی۔ ان کے فیوض ونعمات دن رات تسلسل کے ساتھ ہر ایک کو فائدہ پہنچارہے ہیں۔

۳۔ سابقہ خصوصیات کو دیکھتے ہوئے بڑی آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے ساتھ کسی غیر کا قیاس کرنا اور ان کے برابر لانا غلط ہے، کیونکہ یہ ایک واضح سی بات ہے کہ: "نعمت عطا کرنے والا، نعمت پانے والے سے افضل ہوتا ہے"۔

۱۔ آل محمدؐ ولی نعمت ہیں

اس لئے کہ وہ خدا کی نعمتوں کے اصول اور اس کے فیض وعطا کے خزانے ہیں۔ انہی کے وجود کی خاطر دنیا ومافیہا خلق ہوئی ہے۔ اور انہی کے دم قدم سے زمین وآسمان کا وجود باقی ہے۔ جیسا کہ کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ

نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں خلق فرمایا اور ہماری بہت خوبصورت تخلیق فرمائی، ہماری تصویر بنائی اور بہت خوبصورت تصویر کشی کی۔ اور اپنے بندوں میں ہمیں اپنی "آنکھ" قرار دیا، اور اپنی مخلوق میں اپنی "زبان" کی حیثیت دی۔ اور اپنے بندوں پر اپنے رحم و کرم کا "کھلا ہاتھ" مقرر فرمایا۔ اور وہ "چہرہ" بنایا کہ جس تک بندوں کی رسائی ہوتی ہے، اور وہ "دروازہ" قرار دیا کہ جو اس تک پہنچاتا ہے اور اپنے زمین و آسمان میں اپنا خزانچی مقرر فرمایا۔ ہماری ہی وجہ سے درخت پھل دیتے ہیں، پھلوں میں پختگی آتی ہے، دریا چل رہے ہیں، آسمان سے مینہ برستا ہے، زمین پر گھاس اور سبزے اگتے ہیں۔ اور ہماری ہی عبادت کی وجہ سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو خدا کی بھی کوئی عبادت نہ کرتا" اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرات محمدؐ و آل محمدؐ خدا کے نازل ہونے والے فیوض و برکات اور اس کی مسلسل ملنے والی نعمتوں کیلئے وسیلہ اور اسی کا کشادہ ہاتھ ہیں۔ جیسا کہ یہ بات بھی عیاں ہے کہ مخلوق کی پیدائش اور جو امور اس سے متعلق ہیں مثلاً عبادات، شرعی امور، بندگانِ خدا پر عائد ہونے والے فرائض غرض ہر چیز مرہون منت ہے ان کے وجود ذی جود کی۔

لَهُمْ خَلَقَ اللّٰهُ الْعَوَالِمَ كُلَّهَا ‏ ‏ وَحَكَّمَهُمْ فِيْهَا بِهَا مِنْ خَلِيْقَةٍ

فَهُمْ عِلَّةُ الْاِيْجَادِ وَاللّٰهُ مُوْجِدٌ ‏ ‏ بِهِمْ قَالَ لِلْاَشْيَاءِ كُوْنِيْ فَكَانَتْ

انہی ذوات مقدسہ کیلئے اللہ نے تمام عالم اور جہان کو خلق فرمایا اور کائنات میں انہی کو حاکم بنایا ہے یہی حضرات ہی علت غائیہ ممکنات ہیں اور خدا موجد کائنات ہے۔ انہی کی وجہ سے چیزوں سے کُن کہا، تو معرض وجود میں آگئیں۔ اسی نعمت ولایت اہل بیت علیہم السلام کی طرف بہت سی آیات میں خدا نے اشارہ فرمایا ہے۔ جن میں سے :

۱۔ ایک یہ ہے : "وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً" (لقمان / ۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردیں۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ : "نعمت ظاہری" تو حضور پیغمبر اکرمؐ اور ان کے لائے ہوئے امور مثلاً معرفت الٰہی اور توحید باری تعالیٰ وغیرہ۔ اور "نعمت باطنی" ہم اہل بیت اطہار علیہم السلام کی ولایت اور عقیدہ مؤدت ہے۔"

۲۔ اسی بارے میں ایک اور آیت ملاحظہ فرمائے، ارشاد ہوتا ہے : "ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ" (تکاثر / ۸) پھر تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور باز پرس کی جائے گی۔ بحار الانوار میں ہے کہ ابو خالد کابلی کہتے ہیں کہ : "میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، امامؑ نے مجھے کھانا عنایت فرمایا، لیکن میں نے عمدہ چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ امامؑ نے پوچھا۔ "ابو خالد! ہمارا کھانا کیسا لگ رہا ہے ؟" میں نے عرض کیا : "آپؑ کے قربان جاؤں کھانا تو بہت ہی عمدہ ہے لیکن اس موقع پر مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے جس نے کھانے کا سارا مزہ کرکرا کردیا ہے۔" امامؑ نے فرمایا : "کونسی آیت ؟" میں نے کہا : "ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ" اس پر امامؑ نے فرمایا : "واللہ! تم سے اس کھانے کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔" پھر آپؑ ایسے پیارے انداز میں مسکرائے کہ دانت مبارک نظر آنے لگے اور فرمایا : "جانتے ہو کہ "نعیم" کیا ہے ؟" میں نے عرض کیا : "یہ تو میں نہیں جانتا" فرمایا : "جس نعیم یعنی جن نعمتوں کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔ وہ ہم اہل بیتؑ ہی ہیں"۔

۳۔ اسی سلسلے میں ایک اور آیت ہے : "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا" (ابراہیم / ۲۸) آیا آپؐ نے ان

لوگوں سے حال پر غور نہیں کیا جنہوں نے میرے احسان کے بدلے ناشکری اختیار کی۔ تفسیر عیاشی میں اصبغ بن نباتہ سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں روایت ہے کہ حضرت امیرؑ نے فرمایا: "ہم ہی وہ نعمت ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نوازا ہے"۔

۴۔ ایک اور آیت کے تلاوت کرنے کا شرف حاصل کیجئے، ارشاد ربانی ہے: "فاذکروا آلاء اللّٰہ" (اعراف / ۷۴) پس تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو......"۔ کافی میں ہے ابو یوسف بزاز کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور کہا: "جانتے ہو کہ "آلاءُ اللّٰہ" خدا کی نعمتیں کیا ہیں؟" میں نے کہا: "نہیں" فرمایا: "اللہ کی مخلوق پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہماری ولایت ہے"۔

۵۔ ایک اور آیت کی زیارت فرمائے جسے سورہ الرحمٰن میں باربار دہرایا گیا ہے۔ وہ ہے: "فبایّ آلاءِ ربّکما تکذّبان" (الرحمٰن) تو (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ داؤد رقی کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: "درحقیقت خدا یہ فرمارہا ہے کہ تم میری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ محمدؐ کو یا علیؑ کو...... ؟ کیونکہ میں نے ان ہی کی بدولت تو اپنے بندوں کو نعمتیں عطا کی ہیں!۔" غرض آیات اس قدر زیادہ ہیں کہ "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے۔"

دنیوی نعمتیں

خلاصہ کلام ائمہ اطہار علیہم السلام کا وجود بھی نعمت ہے اور ان کی ولایت بھی نعمت ہے۔

وَمَا نِعْمَةٌ اِلاَّ وَهُمْ اَوْلِيَاؤُهَا　　　فَهُمْ نِعْمَةٌ اَتَتْ كُلَّ نِعْمَةٍ

اس دنیا میں جو بھی نعمت ہے آل محمدؐ اس کے ولی اور مالک ہیں۔ اور وہ خود ایک ایسی نعمت ہیں جس کی وجہ سے ساری نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔

۲۔ چشمہ فیض ہر وقت جاری ہے

ان کے فیوض وبرکات کا تعلق کسی خاص وقت سے مخصوص نہیں اور نہ ہی ان کی نعمتیں کسی خاص زمانے سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ یہ سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمہ وقت کسی قسم کے تعطل کے بغیر ابد الآباد تک جاری ہے۔ اس کی اجمالی وجہ تو پہلے ہی کافی کی روایت سے بیان کی جاچکی ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے بیان کی ہے۔ اس کی تفصیل یہاں پر بیان کی جاتی ہے اور وہ یوں کہ:

نعمتیں اپنی تعداد میں کثرت کے لحاظ سے دو طرح کی ہیں ۱۔ دنیوی ۲۔ اخروی

سابقہ روایات سے واضح ہو گیا کہ آل محمدؐ وجہ تخلیق کائنات ہیں، اور وہی خدا کی دیکھنے والی آنکھ، کشادہ ہاتھ، زمین وآسمان میں اس کے خزانے اور ایسا باب ہیں کہ جہاں تک پہنچ کر خدا تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے خطبے کی پندرہویں فصل میں "حجۃ لازمۃ" کی شرح کے ضمن میں بتایا جاچکا ہے کہ "بندوں کا نظام اور شہروں کا انتظام تا روز قیامت امامؑ کے وجود ذی جود کا مرہون منت ہے۔ اور اگر زمین پر حجت خدا نہ رہے تو زمین اندر کو دھنس جائے یا زمین پر موجود چیزیں اسی میں دھنس جائیں"۔

گزشتہ روایات کے علاوہ یہ روایت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، جسے بحار الانوار میں کتاب اکمال الدین اور امالی شیخ صدوق سے لیا گیا ہے۔ اعمش سے اسناد کے ساتھ روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ اپنے والد بزرگوار سے اور وہ اپنے

اخروی نعمتیں اخروی نعمتوں کا دارومدار خدا کی معرفت اور اس کی عبادت پر ہے۔ اور آل محمدؑ اس کے اصل واصول ہیں۔ کیونکہ اگر وہ نہ ہوتے نہ تو خدا کی معرفت حاصل کی جاتی اور نہ ہی خدا کی عبادت کی جاتی گویا خدا کی معرفت اور عبادت انہی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ جیساکہ اس پر کافی کی سابقہ اور دیگر کئی روایات دلالت کر رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ہم پہلے خطبے کی چوتھی فصل کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں کہ اہل بیتؑ کی ولایت اعمال کی صحت اور قبولیت کیلئے شرط ہے اور اسی پر آخرت کے نتائج کا دارومدار ہوتا ہے، اور اس کے بغیر سب کچھ بے سود ہے۔ ؎

هُمُ الْعُرْوَةُ الْوُثْقى الَّتِيْ كُلُّ مَنْ بِهَا تَمَسَّكَ لَمْ يُسْئَلْ غَدًا عَنْ خَطِيْئَتِهِ

یہی ہستیاں ہی خدا کی ایسی مضبوط رسی ہیں کہ جو بھی ان سے تمسک اختیار کرے گا کل قیامت کے دن اس کے گناہوں کے متعلق اس سے نہیں پوچھا جائے گا۔

انہی کی ولایت کی بدولت سعادت عظمیٰ اور شفاعت کبریٰ کا حصول ممکن ہے۔ اسی کی وجہ سے جنان ورضوان حاصل ہوں گے جو عظیم ترین نتیجہ اور والاترین لذت ہے۔ جیساکہ خداوند متعال فرماتا ہے: "وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ" (توبہ / ۷۲) خدا نے مومنین اور مومنات سے جنت کے ان باغوں کا وعدہ کر لیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے (بہشت) عدن کے باغوں میں عمدہ مکانات کا بھی وعدہ فرمایا ہے اور خدا کی خوشنودی ان سب سے بالاتر ہے۔ یہی تو بڑے اعلیٰ درجے کی کامیابی ہے۔

۳۔ نعمت عطا کرنے والا افضل ہوتا ہے

اس کیلئے تو کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں کہ "نعمت عطا کرنے والا" نعمت حاصل کرنے والے سے افضل ہوتا ہے، خصوصاً جب نعمتیں ہی اس قبیل کی ہوں جن کی جلالت شان کے بارے میں ابھی تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ اور سب سے عظیم نعمت، خدا کی طرف لوگوں کی ہدایت، خدا کی معرفت کرانا اور رضوان اللہ کی طرف رہنمائی کرنا ہے۔ ہمارے اس دعوے پر مندرجہ ذیل روایت اس کی واضح ترین دلیل ہے:

احتجاج طبرسیؒ میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت امام زین العابدینؑ کے پاس کسی آدمی کو لے کر آیا جس کے متعلق اس کا گمان تھا کہ وہ اس کے باپ کا قاتل ہے۔ اپنے بیان کے ضمن میں اس نے قتل کا اعتراف بھی کر لیا جس کی وجہ سے اس سے قصاص لینا واجب ہو گیا تھا۔ امام علیہ السلام نے مدعی سے کہا کہ اسے معاف کر دے اللہ تعالیٰ اسے اس کا عظیم اجر عطا کرے گا۔ لیکن مدعی کا دل یہ بات نہیں مان رہا تھا۔ امامؑ نے اس مقتول کے وارث سے کہا: "اگر اس قاتل نے تمہارے ساتھ کوئی اچھائی کی ہے تو اسے یاد کر کے اس کے اس جرم سے درگزر کر دو۔" مقتول کے وارث نے کہا: "فرزند رسولؐ! اس کا مجھ پر حق تو بنتا ہے لیکن اس حد تک نہیں ہے کہ میں اسے اپنے باپ کا خون معاف کر دوں!" امامؑ نے فرمایا: "تم اس سے کیا چاہتے

ہو؟" اس نے کہا: "میں اس سے قصاص لینا چاہتا ہوں! لیکن اگر وہ اپنے اس حق کے بدلے میں مجھ سے خوں بہا۔ دیت۔ پر مصالحت کرنا چاہتا ہے تو پھر میں قصاص سے دستبردار ہوتا ہوں۔" حضرتؑ نے اس سے پوچھا: "تم پر اس کا کیا حق بنتا ہے؟" اس نے کہا: "یابن رسول اللہؐ! اس شخص نے مجھے اصول دین یعنی توحید خداوندی، نبوت محمد مصطفیؐ اور امامت علی مرتضیٰ وائمہ ہدیٰ کے درس پڑھائے ہیں" یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: "خدا کی قسم! یہ تو ایسا حق ہے جسے تیرے باپ کا خون تو بجائے خود، اگر اولین و آخرین میں سے تمام روئے زمین کے انسانوں کو ماسوائے انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے قتل کر دیا جائے تب بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا"۔

آل محمدؐ کی چند اور صفات

حضرت امیر المؤمنین علیؑ آل محمدؐ، ائمہ اہل بیتؑ کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ (وہ دین کی بنیاد ہیں) اور انہی سے دین قائم و دائم ہے، جس طرح عمارت اپنی بنیادوں پر قائم و استوار ہوتی ہے۔ اس کی تشریح کچھ دیر پہلے کر چکے ہیں مزید تفصیل کیلئے ادھر رجوع کیا جائے البتہ حضرت امیرؑ یہ بھی فرماتے ہیں کہ (وہ یقین کے ستون ہیں) جن کے سہارے دین ثابت و پائیدار ہے، کیونکہ انہی کے ذریعے شکوک دور اور شبہات رفع کئے جاتے ہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یقین سے مراد معارف حقہ اور عقائد دینیہ ہوں۔ اور شاید کہ "دین کی بنیاد" کے ساتھ یہی معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کو ان سے آکر ملنا ہے) اس کے بارے میں شارح بحرانی فرماتے ہیں کہ: "حضرتؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "غالی" ۔ آگے بڑھ جانے والے ۔ کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص انسانی فضائل سے کہ جن پر انسانیت کا دارومدار ہے مثلاً حکمت، عفت، شجاعت اور عدالت وغیرہ سے تجاوز کر جاتا ہے اور افراط کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو وہ ان کی طرف پلٹ کر جاتا ہے اور ان کے ذریعے ہدایت حاصل کر کے ان فضائل کو پالیتا ہے، کیونکہ یہی حضرات انہی فضائل پر قائم ہیں۔ اسی طرح امامؑ نے یہ فرمایا ہے کہ "پیچھے رہ جانے والوں کو ان سے آکر ملنا ہے" تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان فضائل تک رسائی حاصل کرنے والے اور ان کے حصول میں کوتاہی برتنے والے بھی ان تک جا پہنچتے ہیں جب وہ ان حضرات کے ذریعے انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ان حضرات کی وجہ سے مدد کرتا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں"۔

قول مصنفؒ: مرحوم بحرانی نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ اگر ہم حضرت امیرؑ کے کلام کے سیاق اور "هُمْ أَسَاسُ الدِّيْنِ" ۔ وہ دین کی بنیاد ہیں ۔ کے مذکورہ جملے کو پیش نظر رکھیں تو "غالی" سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو دین میں افراط سے کام لیتے ہیں اور "تالی" سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو دین میں کوتاہی برتتے ہیں جبکہ ائمہ اطہارؑ کا شرعی فریضہ تمام امور میں "عدل" ۔ اور "اعتدال" ۔ ہے، وہی ائمہ وسط ہیں اور درمیانی جماعت ہیں جیسا کہ خود ائمہ فرماتے ہیں کہ "ہم درمیانی جماعت ہیں، ہم سے آگے بڑھ جانے والا ہمیں مل نہیں سکتا اور پیچھے رہ جانے والا ہم سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ہم اہل بیتؑ ہی وہ نقطہ اعتدال ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے کو اس سے آکر ملنا ہے اور آگے بڑھ جانے والے کو اس کی طرف پلٹ کر

آتا ہے"۔(۱)

غالیوں سے بچنے کی تلقین

بحار الانوار میں امالی شیخ سے اسناد کے ساتھ فضل بن یسار سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "اپنے نوجوانوں کو غالیوں سے بچائے رکھو کہیں انہیں خراب نہ کر دیں، کیونکہ غالی روئے زمین پر اللہ کی بدترین مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کی عظمت کو گھٹاتے اور خدا کے بندوں کیلئے ربوبیت کے دعویدار ہیں۔ خدا کی قسم! غالی تو یہود و نصاریٰ، مجوس اور مشرکین سے بھی بدتر ہیں، ......" پھر فرمایا: "......اگر ہماری طرف غالی لوٹ کر آئے تو ہم اسے قبول نہیں کریں گے اور اگر مقصر لوٹ کر آئے تو ہم اسے قبول کر لیں گے"۔ آپؑ سے پوچھا گیا: "فرزند رسولؐ! یہ کیسے؟" فرمایا: "اس لئے کہ غالی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی عادت ترک کر چکا ہوتا ہے پس وہ اپنی ترک عادت پر قدرت نہیں رکھتا لہذا خدا کی فرمانبرداری کی طرف واپس نہیں آسکتا، جبکہ مقصر کو معرفت ہو جاتی ہے تو عمل بھی کرتا ہے اور اطاعت و فرمانبرداری بھی"۔

حضرت امیر المؤمنینؑ اہل بیتؑ کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "ریاست عظمیٰ اور سلطنت الہیہ یعنی خلافت کبریٰ اور (ولایت) عظمیٰ (کے حق کی خصوصیات انہی کیلئے ہیں) اس جملہ میں اس بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ "ولایت" کے کچھ خصوصیات اور شرائط ہیں جن کے ذریعے اس کیلئے اہلیت اور استحقاق حاصل ہوتا ہے اور وہ سب اہل بیتؑ اطہار میں بدرجہ اتم موجود اور انہی کے ساتھ خاص ہیں، ان کے علاوہ کسی اور میں موجود نہیں ہیں۔ اور یہ اس لئے ہے کہ "لَھُمْ" میں "لام" اختصاص کیلئے ہے اور پھر یہ کہ خبر مقدم اور مبتدا مؤخر انحصار پر دلالت کر رہی ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اختصاص صرف اہل بیتؑ ہی میں منحصر ہے۔

غرض کہ یہ جملہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ آل محمدؐ ہی ولایت اور ریاست عامہ کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ان کے ساتھ مختص ہیں اور بالفاظ دیگر دوسرا کوئی شخص اس کا مستحق نہیں ہے کیونکہ وہ ان خصوصیات سے عاری ہے۔

شارح معتزلی کا انحراف: ابن ابی الحدید معتزلی نے حضرتؑ کے اس جملے کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ: "جو شخص یہ کہتا ہے کہ مخلوق خدا پر آل رسولؐ کو ولایت رسولؐ کی خصوصیت حاصل ہے، تو وہ اس جملے کی ایسی تاویل کرتا ہے جو بعید از عقل ہے اور آنجنابؑ کے ظاہری کلام کے مخالف ہے، اور یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے"۔

مصنف کا جواب: تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ موصوف نے اس سے پہلے "ولایت" کی "امارت اور حکومت" سے

(۱) دراصل حضرت کا کلام کچھ اس طرح ہے کہ "نَحْنُ النُّمْرُقَةُ الْوُسْطٰی" — "جس کی جمع "نمارق" ہے قرآن مجید میں ہے کہ "وَنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ" (غاشیہ / ۱۵) یعنی گاؤ تکیے لگے ہوں گے۔ تو "نُمْرُقَةُ الْوُسْطٰی" کے معنی گاؤ تکیہ کے ہیں جو درمیان میں ہوتا ہے چونکہ یہ صدر محفل میں ہوتا ہے اسی لئے اس کا معنی نقطہ اعتدال کیا گیا ہے، حدیث میں دعائیہ کلمات ہیں "اللّٰھُمَّ لاتجعلنامن الذین تقدّموا فمرقوا ولا من الذین تاخّروا فمحقوا و اجعلنا من النُّمْرُقَةِ الاوسط" خدایا ہمیں ان لوگوں میں سے نہ بنا جو آگے بڑھ چکے ہیں کہ اس طرح وہ دین سے نکل گئے اور نہ ہی ان لوگوں میں سے قرار دے جو پیچھے رہ گئے ہیں کہ اس طرح سے وہ مٹ گئے ہیں بلکہ ہمیں نقطہ اعتدال بنا نیز شیعوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ "تم نقطہ اعتدال بنو کہ آگے بڑھ جانے والا تمہاری طرف لوٹ کر آجائے اور پیچھے رہ جانے والا تم سے آن ملے" اور غالی وہ ہوتا ہے جو اہل بیتؑ کے بارے میں وہ کچھ کہتا ہے جو وہ خود بھی اپنے بارے میں نہیں کہتے اور "تالی" وہ ہے جو خیر کی امید رکھتا ہے اور آگے آنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کو اجر ملے۔

تفسیر کی ہے، لیکن یہاں پر وہ اپنے موقف سے منحرف ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ان کے بقول "صاف اور ظاہر سی بات ہے کہ لوگوں پر رسول خداؐ کو جو حق حکومت وامارت حاصل ہے وہی حق اہل بیت رسول کو بھی حاصل ہے کیونکہ یہ ان کی خصوصیات میں شامل ہے"۔

اس گفتگو میں غور کرنے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں :

ا۔ اگر موصوف نے خلق خدا پر رسول خداؐ کی امارت سے مراد "ریاست عامہ" اور "سلطنت کلیہ" لی ہے تو پھر اس کے معنی ہوں گے "اولیٰ بالتصرف" کے اور "ولایت" سے ان کی مراد "امارت" اس معنی میں صحیح ہوگی۔ لیکن اس کیلئے ایسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ لفظ "ولایت" میں اس معنی کیلئے جو دلالت موجود ہے وہ "امارت" کی دلالت سے زیادہ واضح، زیادہ ظاہر اور زیادہ بہتر ہے۔ اگر موصوف کی "امارت" سے مراد "اللہ کی مخلوق پر سیاسی امور اور حربی مسائل میں امارت وحکمرانی" ہے تو یہ حضرت امیرؑ کے ظاہری کلام کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ جب اس کلام کے سیاق وسباق کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ ان کی مدح وستائش فرما رہے ہیں اور انہیں خدا کی طرف سے عطا کردہ فضائل اور مناصب ومدارج کا ذکر کر رہے ہیں۔ اور ظاہری سی بات ہے کہ سیاسی امور کی قیادت یا حربی مسائل کی امارت ایسے عہدے ہیں کہ منصب نبوت ورسالت میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

۲۔ ہم نے آج تک امت کے کسی فرد کے کلام میں اور قرآن کی کسی آیت میں اور معصوم کے کسی فرمان میں یہ نہیں دیکھا کہ آنجناب کو "امارت" کے منصب سے یاد کیا گیا ہو۔ تو پھر موصوف کو ایسی تاویل کیلئے حیلہ سازیوں کی کیا ضرورت تھی جو سارے کلام ہی کو بدمزہ کر دے۔ لہذا بہتر ہے کہ ایسی تاویلات سے اجتناب کیا جائے اور ولایت کے خصوصیات کو بیان کیا جائے۔

اوصاف امامؑ بزبان امامؑ

بہت سی روایات میں ولایت بمعنی امامت اور منصب نبوت ورسالت کی جانشینی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان تمام روایات سے جامع ترین وہ روایت ہے جسے کافی میں ابو محمد قاسم بن علائی مرفوعاً عبدالعزیز بن مسلم سے نقل کیا ہے۔ عیون اخبار الرضا اور بحار الانوار میں کتاب "اکمال الدین"، "معانی الاخبار" اور امالی صدوقؒ سے اور ان سب نے طالقانی سے انہوں نے قاسم بن محمد بن علی ہارونی سے، انہوں نے عمران بن موسیٰ سے انہوں نے قاسم بن مسلم سے، انہوں نے اپنے بھائی عبدالعزیز بن مسلم سے روایت کی ہے کہ: "ہم حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے ساتھ ان ایام میں تھے جب آپ بمقام "مَرْو" تشریف فرما تھے۔ ہم اپنی آمد کے ابتدائی دنوں ہی میں جمعہ کے دن جامع مسجد میں اکٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان امامت کا ذکر چل نکلا، اور اس بارے میں ان میں کافی حد تک اختلاف پیدا ہو گیا، میں اپنے مولا حضرت امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لوگوں کی مذکورہ چہ میگوئیوں کا تذکرہ کیا تو آپؑ مسکرا کر فرمانے لگے: "عبدالعزیز! یہ لوگ جاہل ہیں اور شیطان نے ان کو دھوکہ دے کر دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اکرمؐ کو اس وقت تک اس دنیا سے نہیں اٹھایا جب تک اپنے دین کو مکمل اور قرآن کو پوری طرح نازل نہیں کر دیا، اسی قرآن میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ اس میں حلال وحرام اور حدود واحکام غرض ہر اس چیز کو بیان کر دیا گیا ہے جس کی لوگوں کو ضرورت تھی جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتا ہے: "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِن شَيْءٍ" (انعام / ۳۸) ہم نے کتاب (قرآن) میں

کوئی بات چھوڑی نہیں ہے۔اسی طرح حضور سرور دوعالمؐ کی آخری عمر میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی(۱) : ”اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا“(مائدہ / ۳) آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اس دین اسلام کو پسند کیا۔

امامت ایک ایسا امر ہے جس سے دین کی تکمیل ہوئی(۲) ہے۔ اور حضرت پیغمبر خداؐ اس وقت تک اس دنیا سے تشریف نہیں لے گئے جب تک اپنی امت کیلئے دین کی تمام معلومات نہیں بتا دیں اور ان کیلئے ان کے راستے کو واضح طور پر بیان نہیں کر دیا، اور انہیں اپنی امت کو سیدھے راستے پر لگا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ افراد امت کیلئے علیؑ کو ان کا امام مقرر فرمایا اور اپنی امت کیلئے اس کی تمام ضروری چیزوں کو واضح طور پر بیان فرمادیا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ نے اپنے دین کو کامل نہیں بنایا وہ کتاب خدا کی تردید کرتا ہے اور جو کتاب خدا کی تردید کرتا ہے وہ کافر ہے۔ آیا وہ لوگ امامت کی قدر کو پہچانتے اور امت میں اس کے مقام و محل کو سمجھتے ہیں کہ ان کو اختیار ہو اور اپنی مرضی سے کسی کو امام مقرر کر لیں ؟(۳)

امامت کی قدر و منزلت بہت اونچی، شان بہت عظیم، مقام بہت بلند، اطراف بہت محفوظ (۴) اور گہرائی بہت زیادہ ہے، اس قدر زیادہ کہ لوگوں کی عقلیں وہاں تک پہنچ سکیں یا اپنی رائے سے اس تک رسائی حاصل کر لیں یا اپنے اختیار اور مرضی سے کسی کو امام بنالیں۔ یقین جانو! امامت تو ایسا عہدہ ہے جس سے اللہ نے اپنے خلیل، ابراہیمؑ کو اس وقت نوازا جب انہیں نبوت، خلت اور دیگر تمام فضیلتیں عطا ہو چکیں اس کے بعد خدا نے اس کا اعلان یوں فرمایا :”اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا“(بقرہ / ۱۲۴) بے شک میں تمہیں لوگوں کیلئے امام بنانے والا ہوں۔ تو حضرت ابراہیمؑ خلیل الرحمٰن نے خوش ہو کر کہا :”وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي “(ایضا) اور میری اولاد میں سے ؟ خدا نے فرمایا :”لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ“(ایضاً) (ہاں مگر) اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی فائز نہیں ہو سکتا۔ اس آیت نے قیامت تک ہر ظالم کیلئے امامت کا دروازہ بند کر دیا اور مخصوص ہو کر صاحب عصمت و طہارت اور خدا کے منتخب و برگزیدہ افراد کے پاس آگئی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حضرت ابراہیمؑ کیلئے ایک اور بڑی مہربانی تھی اور انہیں کرامت اور بزرگی سے نوازا کہ ان کی ذریت میں معصوم(۵) اور صاحبان عفت و طہارت افراد قرار دیئے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے :”وَ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً وَ كُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِيْنَ وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ“(انبیاء / ۷۲۔۷۳) اور ہم نے (ابراہیمؑ کو) انعام میں اسحاق (جیسا بیٹا) اور یعقوب (جیسا پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے

(۱) اس آیت سے دو طرح سے استشہاد کیا گیا ہے ا۔ چونکہ امامت عظیم ترین مسئلہ ہے لہذا اس کا اس میں ذکر ہونا نہایت واجب و ضروری ہے ۲۔ چونکہ خداوند تعالیٰ نے قرآن میں ہر چیز کو بیان کیا ہے اور اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ غیر امام قرآن کی ہر چیز کو نہیں جانتا۔ لہذا امام منصوص کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب کتاب سے مراد قرآن مجید ہو ،جیسا کہ واضح ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

(۲) اس میں شک نہیں کہ امامت کا شمار دین کے عظیم ترین امور میں ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ”وہ“لوگ رسول خداؐ کی تجہیز و تکفین کو، جو کہ واجب ترین امر تھا، چھوڑ کر ”جانشین رسولؐ“ کے انتخاب میں نہ لگ جاتے۔

(۳) مقصد یہ ہے کہ آیا ان لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ امام کی صفات اور شرائط امامت کیا ہیں ؟ جب وہ ان چیزوں سے بے خبر ہیں تو وہ اس کو منصوب اور متعین کیسے کر سکتے ہیں ؟

(۴) اس کا ہر پہلو اس قدر محفوظ ہے کہ وہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔

(۵) ”اہل عصمت“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں عصمت و طہارت پائی جاتی ہے اور خدا کے پسندیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں۔

سب کو نیکی کرنے والا بنایا، اور ان سب کو امام و پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے (ان کی) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی بھیجی تھی اور یہ سب کے سب ہماری ہی عبادت کیا کرتے تھے۔ امامت کا یہ زرین سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں برابر چلتا رہا اور صدیاں گزرنے کے بعد آخر کار سرکار ختمی مرتبتؐ کی ذات گرامی تک پہنچ گیا، چنانچہ خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ(۱) بِاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ" (آل عمران / ۶۸) ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصیت تو ان لوگوں کو تھی جو خاص ان کی پیروی کرتے تھے اور اس پیغمبرؐ اور ایمانداروں کو بھی ہے اور مؤمنوں کا مالک خدا ہے۔

امامت کا عہدہ جلیلہ آپؐ کی ذات گرامی کیلئے خاص تھا، پھر یہ منصب آپؐ نے حکم رب ذوالجلال سے ایک رسم کے ساتھ علی بن ابی طالبؑ کو عطا فرمایا۔ اور علی بن ابی طالبؑ کے بعد یہ منصب ان کی برگزیدہ اور معصوم ذریت کو عطا ہوا جنہیں اللہ نے علم و عمل کی دولت سے مالامال فرمایا تھا، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ(۲) لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ" (روم / ۵۶) اور جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے جواب دیں گے کہ تم تو خدا کی کتاب کے مطابق روز قیامت تک برابر ٹھہرے رہے۔ اب یہ امامت اولاد علیؑ کیلئے قیامت تک کیلئے مخصوص ہے، کیونکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے(۳) تو یہ جاہل لوگ امام اپنی طرف سے کہاں سے لے آئیں گے؟

امامت یقیناً انبیاء کی منزلت اور اوصیاء کی وراثت ہے، بے شک امامت اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خلافت امیر المؤمنینؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی میراث ہے۔ بے شک امامت ـ یا بقولے زمام(۴) ـ دین کی باگ ڈور، مسلمانوں کا نظام دنیا کی بھلائی اور مؤمنین ـ کیلئے ـ ان کی عزت ہے۔ امامت اسلام کی بڑھتی اساس اور پھیلتی شاخ ہے، امام کے ذریعے نماز، زکوٰۃ، روزے حج اور جہاد کی تکمیل ہوتی ہے۔ فے، غنیمت اور صدقات اکٹھے ہوتے ہیں، حدود و احکام الٰہی کا اجرا ہوتا ہے اور اسلامی حدوں اور علاقوں کی حفاظت کی ہوتی ہے۔ امام، اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، حدود الٰہی کو قائم کرتا ہے، خدا کے دین کی حفاظت کرتا ہے۔ حکمت، موعظہ حسنہ اور حجۃ بالغہ کے ذریعے رب کے رستے کی دعوت دیتا ہے۔ امام چڑھتے، چمکتے سورج کی طرح ہے جس کے نور سے عالم جگمگا اٹھتا ہے اور خود افق کی ایسی بلندیوں پر ہوتا ہے جس تک اوہام و عقول کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ امام چودھویں کا دمکتا چاند، چمکتا چراغ، ابھرتا نور، تاریکیوں، آبادیوں، جنگلوں، صحراؤں، بیابانوں، اور سمندر کی گہرائیوں میں ہادی ستارہ

---

(۱) "اَوْلٰى" کا لفظ "وَلِيٌّ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی قرب کے ہیں، یا پھر اس کے مقام کے حقدار ہونے کے۔ اور آیت سے اس وجہ سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہاں پر "مؤمنین" سے مراد ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں اور امامت پیغمبر خداؐ تک آن پہنچی اور پیغمبر خداؐ نے حکم خدا بالاتفاق علیؑ کے علاوہ کسی اور کو اپنا جانشین نہیں بنایا۔

(۲) "اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ ــــ" سے پہلے کی آیت ہے "يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ــــ" (روم / ۵۵) یعنی اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن مجرمین قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک ساعت سے بھی زیادہ دنیا میں نہیں ٹھہرے ہیں، اور حقیقت یہ ہے اسی طرح دنیا میں بھی افترا پردازیاں کیا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد کی آیت مجرمین کے قول کے جواب میں ہے اور جواب دینے والے صاحبان علم و ایمان ہیں جن کے مصداق اکمل پیغمبر خداؐ اور ائمہ اطہارؑ ہیں، کیونکہ اس سے مقصود صرف یہی لوگ ہیں اور کوئی نہیں۔ بعض اوقات کچھ لوگ اس وہم میں ڈال دیتے ہیں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب ائمہ اطہارؑ ہیں، اور رہنے سے مراد علم کتاب میں رہنا ہے لیکن آیت کا سیاق و سباق اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ ہاں البتہ علی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ آیت میں تقدم و تاخر ہے یعنی "قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ لَقَدْ لَبِثْتُمْ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ" ہے۔ (۳) چونکہ حضرت محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے لہٰذا امامت کہاں سے لائیں گے؟ اور کسی کو کیسے امام بنائیں گے؟ یا یہ کہ انبیاء کی امامت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ (۴) "زمام" مہار کو بھی کہتے ہیں اور سواری کو بھی۔

ہوتا ہے۔ امام پیاسوں کیلئے ٹھنڈا پانی، ہدایت کار ہنما اور ہلاکتوں سے بچانے والا ہوتا ہے۔ امام بلند ٹیلوں پر آگ تاپنے والوں کیلئے تپش اور ہلاکت کے مقامات پر ہادی اور رہنما ہوتا ہے جو اس سے جدا ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔ امام بارش برسانے والا ابر سخا اور موسلا دھار بارش، نیر تاباں، سایہ فگن آسمان، کشادہ زمین، پر آب چشمہ، تالاب اور چمن ہوتا ہے۔ امام انیس ساتھی، شفیق باپ، امین دوست، مہربان والد، سگا بھائی، چھوٹے بچے پر مہربان ماں اور سخت گھبراہٹوں اور مصائب و آلام میں بندوں کی جائے پناہ ہوتا ہے۔ امام اللہ کی مخلوق میں اللہ کا امین، اس کے بندوں پر حجت، اس کے شہروں میں اس کا خلیفہ، خدا کی طرف دعوت دینے والا اور اللہ کی حرمتوں (۱) کا محافظ ہوتا ہے۔ امام گناہوں سے پاک، عیبوں سے مبرا، علم کے ساتھ مخصوص، حکم کے ساتھ نشان زدہ، دین کا نظام، مؤمنین کی عزت، منافقین کیلئے قہر الٰہی اور کافروں کے واسطے خدا کی موت ہوتا ہے۔ امام یگانہ روزگار ہوتا ہے، اس کی کوئی برابری نہیں کر سکتا، کوئی عالم اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا، اپنی مثال آپ ہوتا ہے، وہ بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے، فضل کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی تلاش اور حصول کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ فیاض ازل کے فیض کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کس کے بس میں ہے کہ امام کی کماحقہ معرفت حاصل کر سکے یا اس کی تہہ تک پہنچ سکے؟ یہ بڑی دور کی بات ہے نہایت ہی دور کی، عقلیں پریشان ہیں، دماغ سرگردان ہیں، ذہن بھٹک چکے ہیں، آنکھیں تھک گئی ہیں، بڑے باعظمت لوگوں نے اپنی حقارت کا اعتراف کر لیا ہے، حکماء متحیر ہیں، صاحبان حلم عاجز آچکے ہیں، خطیب گنگ ہو گئے ہیں، عقلمندوں نے اقرار جہالت کر لیا ہے، شعراء نے اظہار عجز کر لیا ہے اور ادیب و بلیغ افراد اس کی ایک شان بیان کرنے سے عاجز ہیں کہ اس کے فضائل میں سے ایک فضیلت کو ذکر کر سکیں، اس لئے انہوں نے اپنے عجز و کوتاہی کا کھلم کھلا اقرار کر لیا ہے۔

اس کی مکمل طور پر تعریف یا کماحقہ صفت کیونکر بیان کی جاسکتی ہے یا اس کے امور میں کسی امر کو کس طرح سمجھا جاسکتا ہے یا اس کا قائم مقام کہاں مل سکتا ہے یا کہاں اس سے بے نیازی حاصل کی جاسکتی ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں، کبھی نہیں!! اس لئے کہ وہ ایک ایسی جگہ ستارہ کی مانند چمک رہا ہوتا ہے جہاں تک لوگوں کے ہاتھ اور تعریف کرنے والوں کی تعریف نہیں پہنچ سکتی۔ لوگوں کو امام کے بنانے کا اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا؟ اور عقلیں امام تک کیسے رسائی حاصل کر سکتی ہیں؟ امام کے جیسا کوئی کہاں ملتا ہے؟ آیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ امام آل محمدؐ کے علاوہ کہیں اور سے ملے گا؟ واللہ ان کے دلوں نے ان سے جھوٹ بولا ہے اور باطل نے ان کے اندر غلط آرزوئیں ڈال دی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دشوار گزار سیڑھیوں چڑھ گئے لیکن وہاں سے ان کے پاؤں ایسے پھسلے کہ گہری پستیوں میں جاگرے۔ انہوں نے اپنی حیران و پریشان، ناقص و گمراہ کن عقلوں سے امام کو کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ حقیقی امام سے کوسوں دور ہو گئے۔ خدا انہیں غارت کرے۔ خدا انہیں غارت کرے کہاں بھٹکے پھر رہے ہیں؟

انہوں نے نہایت ہی سخت اور دشوار معاملے کو اپنا لیا اور جھوٹ موٹ کی باتیں کرنے لگے اور دور کی گمراہی میں جا پھنسے اور سرگشتگی کی گہرائیوں میں جاگرے کیونکہ بصیرت کے امام کو چھوڑ دیا۔ بقول خداوند عالم: "وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ

(۱) حرمتوں کے معنی ہیں ایسی چیزیں جن کی ہتک اور توہین کرنا جائز نہیں اور نہ ہی انہیں ضائع کرنے کی اجازت ہے بلکہ ان سے ہر قسم کے نقصان اور فساد کو دور کرنا واجب ہے۔ اور اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ نے عظمت عطا کی ہے اور دنیا کو ان کی تعظیم کا حکم دیا ہے، جیسے بیت اللہ شریف، قرآن مجید، حقیقی جانشینان پیغمبرؐ، فرائض، اوامر اور نواہی۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ" (عنکبوت / ۳۸) اور شیطان نے ان کی نظر میں ان کے کاموں کو اچھا کر دکھایا تھا اور انہیں سیدھی راہ پر چلنے سے روک دیا تھا حالانکہ وہ بڑے ہوشیار تھے۔ انہوں نے خدا اور رسولؐ کے منتخب کردہ امام سے منہ موڑ کر اپنی مرضی سے امام بنالیا، حالانکہ قرآن انہیں اس طرح پکار رہا ہے: "وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَ يَخْتَارُ مَاكَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ تَعَالىٰ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" (قصص / ۶۸) اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور یہ انتخاب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے، جس چیز کو یہ لوگ خدا کا شریک بناتے ہیں، اس سے خدا پاک و کہیں برتر ہے۔ اور خداوند عزوجل فرمارہا ہے: "وَمَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا مَاكَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ" (احزاب / ۳۶) اور نہ کسی مؤمن مرد کو اور نہ کسی مؤمنہ عورت کو یہ مناسب ہے کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کسی بات کا حکم دیں، ان کو اپنے اس کام کے کرنے نہ کرنے کا اختیار ہو۔ اسی طرح خالق کہتا ہے: "مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ اَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلىٰ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَاتُوْا بِشُرَكَائِهِمْ اِنْ كَانُوْا صَادِقِيْنَ" (قلم / ۳۶ تا ۴۱) تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ یا تمہارے پاس کوئی ایمانی کتاب ہے جس میں تم پڑھ لیتے ہو کہ جو چیز تم پسند کرو گے تم کو وہاں ضرور ملے گی؟ یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو روز قیامت تک چلی جائیں گی کہ جو کچھ تم حکم دو گے وہی تمہارے لئے ضرور حاضر ہو گا؟ ان سے پوچھو تو کہ ان میں اس کا کون ذمہ دار ہے؟ یا اس باب میں ان کے اور لوگ بھی شریک ہیں؟ تو اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو سامنے لائیں۔ خداوند متعال فرماتا ہے: "اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلىٰ قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا" (سورہ محمد / ۲۴) تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں۔ نیز فرماتا ہے: "وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلىٰ قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" (توبہ / ۹۳) اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ اور فرماتا ہے: "قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّا سْمَعَهُمْ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ" (انفال / ۲۱۔۲۲) کہتے ہیں کہ ہم سن رہے ہیں حالانکہ وہ سنتے نہیں ہیں، اس میں شک نہیں کہ زمین پر چلنے والے تمام حیوانات سے بدتر خدا کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔ اور اگر خدا ان میں کوئی نیکی (کی بو بھی) دیکھتا تو ضرور ان میں سننے کی قابلیت عطا کرتا (مگر یہ ایسے ہیں کہ) اگر ان میں سننے کی قابلیت بھی دیتا تو بھی منہ پھیر کر بھاگتے۔ نیز فرماتا ہے: "وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" (بقرہ / ۹۳) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا تو ہے لیکن ہم اس کو مانتے نہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے: "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَ اللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" (جمعہ / ۴) یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرماتا ہے اور خدا تو بڑے فضل و کرم کا مالک ہے (۱)۔

وہ لوگ اپنی طرف سے امام کا انتخاب کیونکر کر سکتے ہیں جبکہ امام ایسا عالم ہوتا ہے جس کے پاس جہالت کا کبھی گزر نہیں

---

(۱) یاد رہے کہ "قَالُوْا سَمِعْنَا" کے جملے سے پہلے یہ الفاظ ہیں "وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ ......" اسی طرح "وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" ہے۔ "وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ" سے مراد یہ ہے کہ اگر انہیں سنائے پھر بھی وہ اسی حالت پر رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بھلائی نظر نہیں آرہی۔

ہو سکتا۔ ایسا سربراہ۔ یا بروایتے۔ ایسا دعوت دینے والا ہوتا ہے جو کبھی بزدل ہو کر پیچھے نہیں ہٹتا۔ امام تقدس، طہارت، عبادت، زہد، علم اور پرہیزگاری کی کان ہوتا ہے۔ رسولؐ کی دعوت(۱) اور دعا اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ بتول معظمہؑ کی پاکیزہ نسل سے ہوتا ہے۔ اس کے نسب میں کسی قسم کی زبان نہیں کھولی جاسکتی اور کوئی بڑے سے بڑا شریف ان کا مقابل نہیں ہو سکتا۔ وہ قریش کے خاندان سے، بنی ہاشم کی نسل سے اور رسولؐ کی اہل بیت عترتؑ سے ہوتا ہے۔ اللہ کی رضا اس کے ساتھ ہوتی ہے، اشراف کیلئے باعث شرف ہوتا ہے اور عبد مناف کی شاخ سے ہوتا ہے۔ اس کا علم بہت بلند، اس کا حلم نہایت کامل اور امامت پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ امام سیاست کو جانتا ہے، اس کی اطاعت ہر ایک پر فرض ہے، اللہ کے حکم سے کھڑا ہوتا ہے اور امور الٰہی کا اجرا کرتا ہے، اللہ کے بندوں کا خیر خواہ ہوتا ہے اور دین خداوندی کا محافظ ہوتا ہے۔

انبیاء اور ائمہ صلوات اللہ علیہم اجمعین کو توفیق الٰہی حاصل ہوتی ہے، خدا انہیں اپنے مخفی علم و حکمت سے وہ کچھ عطا کرتا ہے جو دوسروں کو نہیں دیتا۔ ان کا علم اپنے زمانے کے تمام لوگوں کے علم سے بالاتر ہوتا ہے، خداوند عالم فرماتا ہے: "اَفَمَنْ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُتَّبَعَ اَمَّنْ لَا يَهِدِّيْ اِلَّا اَنْ يُهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ" (یونس / ۳۵) وہ شخص جو دوسرے کی ہدایت تو درکنار خود جب تک (کوئی) دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے دیکھ نہیں پاتا، تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ خداوند عالم ہی کا ارشاد ہے: "وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" (بقرہ / ۲۶۹) اور جسے حکمت عطا ہوئی (گویا) اسے بہت زیادہ خوبیوں کی دولت ہاتھ لگی۔ خالق جل و علا طالوت کے بارے میں فرماتا ہے: "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ" (بقرہ / ۲۴۷) نبی نے کہا "خدا نے اس (طالوت) کو تم پر فضیلت دی ہے (مال میں نہ سہی) علم اور جسم کا پھیلاؤ اسی کا زیادہ فرمایا ہے، اور خدا جسے چاہے اپنا ملک دے اور خدا بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے"۔ پروردگار عالم اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے: "اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا" (نساء / ۱۱۳) اور خدا ہی نے تم پر اپنی کتاب اور حکمت نازل کی اور جو باتیں تم نہ جانتے تھے سکھادیں اور تم پر تو خدا کا بڑا فضل ہے۔ اسی طرح ائمہ اہل بیتؑ اور عترت و ذریت پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے: "اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ(۲) فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا" (نساء / ۵۴-۵۵) یا وہ اللہ کے خاص لوگوں سے اس فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو انہیں اللہ نے دیا ہے (تو اس کا کیا علاج ہے) ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور عقل کی باتیں اور ملک عظیم عطا کیا ہے۔ پھر ان میں

---

(۲) "دعوت رسولؐ" سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر خداؐ لوگوں کو اس بات کی طرف بلاتے ہیں کہ دیکھو یہ میرے نائب ہیں۔ جس طرح ایک موقع پر آپؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق فرمایا تھا کہ: "خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ یہ پیغام یا تو میں خود پہنچاؤں یا وہ مرد جو مجھ سے ہو" یا جس طرح قرآن مجید میں ہے: "اُدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ" (یوسف / ۱۰۸) یا اس سے مراد امامت کیلئے پیغمبر خداؐ کی دعا ہوتی ہے یا حضورؐ کی اس کے حق میں یہ دعا ہوتی ہے: "اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ" یا حضورؐ کی دعا: "اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ" یا آپؐ کی دعا: "اَللّٰهُمَّ ارْزُقْهُمْ فَهْمِيْ وَ عِلْمِيْ" علاوہ ازیں اور بھی بہت سی دعائیں ہیں۔

(۱) "فضل" سے مراد علم، حکمت اور خلافت ہے، جیسا کہ سابقہ دو آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ فضل و شرف، علم اور حکمت کے ساتھ ہوتا ہے اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ ائمہ اطہار آل محمدؑ ان دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ عالم تھے جو دعویداران خلافت تھے۔ اسی طرح "وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ" کی آیت سے بھی استشہاد کیا جاسکتا ہے۔

سے کچھ (عطائے فضیلت پر) ایمان لائے اور کچھ اس سے انکار کر بیٹھے، اور (اس انکار کی سزا کیلئے) جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کیلئے امام کا انتخاب کر لیتا ہے تو اس کیلئے اس کے سینے کو کشادہ کر دیتا ہے، اس کے دل میں حکمت کی نہریں جاری کر دیتا ہے، اسے علم کا اس طرح الہام کر دیتا ہے کہ کسی موقع پر کسی بھی قسم کے جواب سے عاجز نہیں آتا اور نہ ہی راہ صواب میں سرگردانی کا شکار ہوتا ہے۔ امام معصوم ہوتا ہے، خدا کا تائید یافتہ ہوتا ہے، توفیق خداوندی کا حامل ہوتا ہے، خطاؤں سے محفوظ ہوتا ہے اور لغزشوں، خطاؤں اور ٹھوکروں سے بچا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ پروردگار کی خاص عنایات سے ہوتا ہے تاکہ وہ اس کے بندوں پر خدا کی حجت اور اس کی مخلوق میں اس کا گواہ قرار پائے، اور "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَ اللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ" (حدید / ۲۱) یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے اور خدا کا فضل و کرم تو بہت بڑا ہے آیا یہ لوگ اس قسم کی صفات کے حامل شخص کے انتخاب پر قادر ہیں کہ اسے منتخب کریں؟ یا ان کا منتخب کردہ شخص ان صفات سے موصوف ہوتا ہے کہ اسے آگے بڑھائیں؟ کعبہ بیت اللہ کی قسم! ان لوگوں نے حق سے تجاوز کیا اور کتاب خدا کو پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ حالانکہ کتاب خدا قرآن مجید میں ہدایت اور شفا ہے لیکن ان لوگوں نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے اور اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو گئے ہیں، اسی لئے اللہ نے ان کی مذمت کی ہے اور ناراضگی کا اظہار کیا ہے اور ہلاکت، تباہی، بے راہروی، پستی اور حق سے دوری کا شکار کر دیا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے "وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ" (قصص / ۵۰) اور جو شخص خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرے اس سے زیادہ گمراہ اور کون ہوگا، بیشک خدا ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔ نیز فرماتا ہے "فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ" (محمد / ۸) ان کیلئے لغزش ہے اور خدا ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا۔ اسی طرح یہ بھی ارشاد فرماتا ہے: "كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ" (مؤمن / ۳۵) وہ خدا اور ایمان والوں کے نزدیک سخت نفرت خیز ہیں یوں خداوند عالم متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے "وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا" _ خدا کا درود و سلام ہو محمدؐ آل محمدؐ پر"۔

یہ تو تھا امام اور امامت کے بارے میں حضرت امام علی بن موسیٰ رضاؑ کا ایک طویل اور بصیرت افروز فرمان جس سے آنکھیں روشن اور دل منور ہو گئے۔ اب ہم حضرت امیر علیہ السلام کے اس کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں جو تسلسل کے ساتھ آل محمدؐ کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہے، چنانچہ حضرت امیرؑ فرماتے ہیں (انہی کے بارے میں پیغمبرؐ کی وصیت اور انہی کیلئے نبیؐ کی وراثت ہے)۔

آل محمدؐ، پیغمبرؐ کے وصی اور وارث ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ نے آل محمدؐ کی خصوصیات میں سے پیغمبرؐ کی "وصایت اور وراثت" بھی قرار دی ہے، اس وصایت اور وراثت سے کیا مراد ہے؟ پہلے تو مفسر و شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی کا نظریہ معلوم کرتے اور پھر دیکھتے ہیں مصنف مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا ہے؟

ابن ابی الحدید کا نظریہ شارح معتزلی فرماتے ہیں: "جہاں تک وصیت کا تعلق ہے تو اس میں شک نہیں کہ ہمارے نزدیک علیؑ،

وصی رسولؐ تھے، اگرچہ اس بارے میں کچھ معاندین نے مخالفت کی ہے لیکن ہم وصیت سے مراد نص اور خلافت پھر بھی مراد نہیں لیتے بلکہ کئی اور امور مراد لیتے ہیں۔ رہ گئی بات وراثت کی، تو امامیہ اسے مال اور خلافت پر محمول کرتے ہیں جبکہ ہم اسے علمی وراثت پر حمل کرتے ہیں"۔

قول مصنف: آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ موصوف کیا فرما رہے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ "متعلق کا حذف کر دینا عموم کا فائدہ دیتا ہے"۔ لہٰذا اسی قاعدہ کلیہ کی بنا پر چونکہ حضرت امیرؑ کے کلام میں "وصیت کا متعلق" بیان نہیں ہوا اور نہ ہی وراثت میں کسی مخصوص چیز کی قید لگائی گئی ہے، لہٰذا ضروری بن جاتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو وصیت کیلئے صلاحیت کی اور وراثت کیلئے قابلیت کی حامل ہے، خواہ وہ مال ہو یا علم و امامت ہو یا خلافت۔ آل محمدؐ ان سب چیزوں میں پیغمبرؐ کے وصی اور وارث ہیں، لہٰذا آنجنابؑ کے کلام کو اگر عقلی اور نقلی، شیعہ اور سنی دلائل سے ہٹ کر دیکھا جائے تو بھی یہ کلام اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اہل بیتؑ کیلئے ہر قسم کی وصیت اور وراثت ثابت ہے۔ جیسا کہ عنقریب اگلے خطبہ کے مقدمہ میں اس بات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "ریاست عامہ اور خلافت الٰہیہ" سے بڑھ کر ہمیں اور کوئی چیز بلند مرتبہ نظر نہیں آتی جو آپؑ کے کلام میں وصیت کی حامل ہو، بلکہ جو بھی چیز اس پر حمل کی جائے وہ مرتبہ نبوت کے بعد مرتبہ خلافت سے کمتر ہی ہوگی۔ اگر شارح موصوف کی توجیہ کو غور سے دیکھا جائے تو ان کی تدلیس صاف نظر آئے گی اور معلوم ہوگا کہ اپنے کلام کو غلط رنگ میں پیش کر رہے ہیں اور توریہ سے کام لے کر اصل مقصد کو چھپانا چاہتے ہیں۔

شعراء کا کلام: ذیل میں ہم صدر اسلام کے کچھ شعراء کا کلام پیش کر رہے ہیں جو حضرت امیرؑ کے وصی رسولؐ ہونے پر دلالت کرتا ہے، ملاحظہ فرمایئے چند شعراء کا لطیف کلام:

۱۔ عبدالرحمٰن بن جعیل (بروایتے حنبل) کہتے ہیں:

لَعَمْرِيْ لَقَدْ بَايَعْتُمْ ذَا حَفِيْظَةٍ   عَلَى الدِّيْنِ مَعْرُوْفَ الْعِفَافِ مُوَفَّقَا
عَلِيًّا وَصِيَّ الْمُصْطَفٰى وَ ابْنَ عَمِّهٖ   وَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰى اَخَاالدِّيْنِ وَ التُّقٰى

میری جان کی قسم! تم نے ایک ایسے شخص کی بیعت کی ہے جو دین کا محافظ ہے، جس کی پاکدامنی معروف ہے اور ہر نیکی میں موفق و کامران ہے۔ یعنی علی بن ابی طالب جو کہ پیغمبرؐ مصطفیٰ کے وصی اور ان کے چچا زاد بھائی ہیں اور پیغمبرؐ کے ساتھ نماز پڑھنے والے پہلے نمازی ہیں اور دین و تقویٰ کے ساتھ ان کا بھائی چارہ ہے۔

۲۔ فضل بن عباس کہتے ہیں:

وَ كَانَ وَلِيُّ الْاَمْرِ بَعْدَ مُحَمَّدٍ   عَلِيٌّ وَ فِيْ كُلِّ الْمَوَاطِنِ صَاحِبُهٗ
وَصِيُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَقًّا وَّ صِهْرُهٗ   وَ اَوَّلُ مَنْ صَلّٰى وَ مَا ذُمَّ جَانِبُهٗ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کے ولی امر علیؑ ہیں، اور تمام جنگوں میں آپؐ کے ساتھی رہے، رسول خداؐ کے

حقیقی وصی اور داماد ہیں اور آپؐ کے ساتھ سب سے پہلے نمازی اور ہر لحاظ سے قابل ستائش ہیں۔

۳۔ عقبہ، حضرت عائشہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

أعايشُ خلّيْ عنْ عليٍّ وَ عتْبه بما ليس فيه انّما انتِ والدةٌ

وَصيُّ رسُوْلِ اللّه منْ دُوْنِ اهْله و انتِ على ما كان منْ ذاك شاهدةٌ

اے اماں عائشہ! آپ علیؑ پر غصے اور ناراض ہونا چھوڑ دیجئے کیونکہ آپ جو کچھ ان کے بارے میں کہتی ہیں وہ ان میں موجود نہیں ہے، آپ تو بہر حال اماں ہیں! علیؑ رسول خداؐ کے وصی ہیں، پیغمبرؐ نے باقی تمام اہل خاندان کو چھوڑ کر صرف انہی کو اپنا وصی بنایا ہے اور علیؑ کی انہی عظمت کی تو گواہ آپ بھی ہیں۔

۴۔ ابوالھیثم بن تیہان کہتے ہیں:

قُلْ لِلزُّبَيْرِ وَ قُلْ لِطَلْحَةَ اَنَّنَا نَحنُ الَّذِيْنَ شِعَارُنَا الاَنْصَارُ

نَحنُ الَّذِيْنَ رَاَتْ قُرَيْشُ فِعْلَنَا يَوْمَ الْقَلِيْبِ اُوْلٰئِكَ الْكُفَّارُ

كُنَّا شِعَارُ نَبِيِّنَا وَ دِثَارُهٗ يُفْدِيْهِ مِنَّا الرُّوْحُ وَ الاَبْصَارُ

اِنَّ الْوَصِيَّ اِمَامُنَا وَ وَلِيُّنَا بَرِحَ الْخَفَاءُ وَ بَاحَتِ الاَسْرَارُ

طلحہ و زبیر سے کہہ دو کہ ہم وہی ہیں جن کا نعرہ ہے کہ "ہم انصار ہیں"۔ ہم وہی تو ہیں جن کے کردار کو قریش نے کنویں (کی جنگ) کے دن دیکھ لیا تھا جبکہ وہ کفر کی حالت میں تھے۔ ہم ہی اپنے پیغمبرؐ کے جلوت و خلوت کے ساتھی ہیں ہم ہی ان پر اپنی جانیں قربان اور آنکھیں نثار کرتے رہے۔ وصی پیغمبرؐ ہمارا امام اور ولی ہے، اب سارے پردے ہٹ چکے ہیں اور راز کھل کر ظاہر ہو چکے ہیں۔

۵۔ عبداللہ بن ابی سفیان بن حرث بن عبدالمطلب کہتے ہیں:

وَ مِنَّا عَلىٰ ذَاكَ صَاحِبُ خَيْبَرِ وَ صَاحِبُ بَدْرٍ يَوْمٌ سَالَتْ كَتَائِبُهٗ

وَ صِيُّ النَّبِيِّ الْمُصْطَفىٰ وَ ابْنُ عَمِّهٖ فَمَنْ ذَا يُدَانِيْهِ وَ مَنْ ذَا يُقَارِبُهٗ

اور ہم ہی میں سے علی بن ابی طالبؑ ہیں جو خیبر اور بدر کے دن بے جگری کے ساتھ لڑے تھے، جو نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی اور چچازاد بھائی ہیں۔ تو کون ہے جو ان کی برابری کرے؟ اور کون ہے جو ان کے مرتبے تک جا پہنچے؟

۶۔ متاخرین میں سے بہترین شاعر قاضی تنوخی کہتے ہیں:

فَقَالَ لَهُمْ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ مِنْكُمْ فَهٰذَا اَخِيْ مَوْلَاهُ بَعْدِيْ وَ صَاحِبِيْ

اَطِيْعُوْهُ طُرًّا فَهُوَ مِنِّيْ بِمَنْزِلٍ كَهَارُوْنَ مِنْ مُوْسَى الْكَلِيْمِ الْمُخَاطَبِ

پیغمبرؐ نے لوگوں سے فرمایا: "تم میں سے جن کا میں مولا ہوں تو میرے بعد میرا بھائی اور میرا ساتھی اس کا مولا ہے، تم سب اسی کی اطاعت کرو کیونکہ وہ مجھ سے وہی نسبت رکھتا ہے جو موسیٰ کلیم اللہ سے ہارون رکھتے تھے۔

اہل بیتؑ ہی حقدار خلافت ہیں

حضرت امیر المؤمنینؑ اس خطبہ کے آخر میں حق وصایت ووراثت کے نتیجے کے طور پر فرماتے ہیں (اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا) یہاں پر حق سے مراد حق ولایت ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے اور اس پر الف لام عہد کا ہے اور یہ جملہ گویا اس بات پر نص ہے کہ آپؑ سے پہلے خلافت نااہل افراد کے پاس تھی اور اس کے صرف آپؑ ہی مستحق تھے لیکن مستحق کے ہوتے ہوئے غیر مستحقین نے اسے اپنائے رکھا۔

شارح معتزلی کیا کہتے ہیں

ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ :"یہ کلام اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حق (خلافت) پہلے نااہل لوگوں کے پاس تھا، لیکن ہم اس کی دوسرے الفاظ میں تاویل کرتے ہیں بالکل امامیہ کے برعکس، اور ہم کہتے ہیں کہ "یہ ٹھیک ہے کہ حضرت علیؑ اس کے زیادہ اہل اور زیادہ حقدار تھے، لیکن نص کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی افضلیت کی وجہ سے، کیونکہ آپؑ بعد از پیغمبرؐ تمام انسانوں سے افضل اور دوسرے مسلمانوں سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے۔ لیکن آپؑ نے اپنے حق سے اس لئے دستبرداری اختیار کر لی تھی کہ مصلحت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور آپؑ نے اپنی فراست سے سمجھ لیا تھا کہ آپؑ کے بارے میں عربوں میں حسد اور کینہ پایا جاتا ہے لہذا اگر سریر خلافت پر بیٹھتے ہیں تو اسلام اور مسلمانوں میں اختلاف وانتشار پیدا ہو جائے گا، لہذا آپؑ اپنے حق سے دستبردار ہو گئے، لیکن جب کوئی متروکہ چیز کسی کے پاس واپس آجائے تو وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ "حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا"۔

مصنف کا جواب :

اس مفروضے کا کئی طرح سے جواب دیا جاتا ہے :

۱۔ یہ تاویل خلاف اصل ہے، اس کیلئے دلیل کی ضرورت ہے جو انہوں نے پیش نہیں کی۔

۲۔ شارح معتزلی کا آپؑ کے منصوص بالخلافت ہونے سے انکار صحیح نہیں ہے اور انکار کی کوئی وجہ نہیں آتی اس لئے کہ اس پر کتاب وسنت سے اس قدر دلائل موجود ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ جب یہ بات تسلیم ہے کہ آپؑ ہی بعد از پیغمبرؐ افضل البشر ہیں اور سب سے بڑھ کر خلافت کے مستحق ہیں تو پھر یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ خلیفہ آپؑ ہی ہوں، کیونکہ فاضل پر مفضول_ غیر فاضل، نااہل_ کو ترجیح دینا اور تکمیل کے ضرورت مند کو کامل پر مقدم کرنا عقلی طور پر قبیح، غلط، ناپسندیدہ اور قابل نفرت تو ہے ہی، نقلی طور پر بھی سخت قابل مذمت اور باعث نفرت اور قبیح ہے جیسا کہ آپ اگلے خطبے کے مقدمہ میں پڑھیں گے۔ انشاءاللہ۔

اس سے بڑھ کر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ شارح معتزلی کا تعلق "عدل مذہب" سے ہے، یعنی عدل کو اصول دین سے سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی کتاب کے خطبے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں :"قَدَّمَ المَفضُولَ علی الفَاضِلِ لِمَصلِحَةٍ اقتَضَاها التَّکلِیفُ "یعنی اللہ نے فاضل (یعنی علیؑ) کے ہوتے ہوئے مفضول یعنی غیر فاضل اور نااہل لوگوں کو مقدم کیا ہے، اور یہ اس کی مصلحت کے تقاضوں کے پیش نظر تھا"۔

۴۔اس بات پر کوئی قابل اعتماد لیل موجود نہیں ہے کہ آپؑ نے اپنے اختیار اور خوشی خوشی حق خلافت سے دستبرداری کی ہو۔ہاں البتہ کچھ جعلی اور موضوعی روایات مل جائیں گی جو عامہ نے گھڑی ہوں، جبکہ خاصہ (شیعوں) کے ذرائع سے بیان ہونے والی احادیث تو تواتر کی حد تک ہیں جبکہ عامہ (اہل سنت) کی طرف سے بیان ہونے والی احادیث بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو آپ کی خلافت پر نص ہیں۔اس کے ثبوت کیلئے تو اگلا خطبہ (شقشقیہ) ہی کافی ہے جس میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ خلافت سے آپؑ کی جدائی، آپؑ کی مرضی اور اختیار سے نہیں تھی۔اس سلسلے میں شارح معتزلی کا مختلف تاویلیں پیش کرنا تکلف کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور بیان کئے جانے والے دلائل تو مکڑی کے جالے سے بھی کمزور تر ہیں۔بالکل ویسے جیسے انہوں نے جبت و طاغوت کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور تو لگایا ہے مگر بات بنائے نہیں بنتی۔

مزید تفصیل آئندہ خطبے میں بیان ہو گی، انشاءاللہ۔اس مقام پر تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں :

اِذَا لَمْ یَکُنْ لِلْمَرْءِ عَیْنٌ صَحِیْحَۃٌ فَلاَ غَرْوَ اَنْ یَرْتَابَ وَ الصُّبْحُ مُسْفِرٌ

جب انسان کی آنکھیں ہی صحیح نہ ہوں تو پھر وہ تابندہ صبح میں بھی شک کرے تو اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔قصور تو آنکھوں کا ہے!!

......

تیسرا خطبہ

خطبہ شقشقیہ

وَ مِنْ خُطْبَةٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَ هِيَ الْمَعْرُوفَةُ بِالشَّقْشَقِيَّةِ

حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ المعروف خطبہ شقشقیہ

وجہ تسمیہ

اسے اس نام سے اس لئے پکارا جاتا ہے کہ اس کے آخر میں حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا "تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ" یہ تو شقشقہ یعنی گوشت کا وہ لوتھڑا جو اونٹ کے منہ سے مستی اور ہیجان کے وقت نکلتا ہے تھا جو ابھر کر دب گیا۔ بعض حضرات اسے "خطبہ مقمصہ" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، کیونکہ اس کے اوائل میں لفظ "تَقَمَّصَ" آیا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے قرآن مجید کی سورتوں کے نام ان کے مشہور الفاظ کے نام پر ہیں مثلاً "بقرہ"، "آل عمران"، "الرحمٰن"، "الواقعہ" وغیرہ ہیں۔

ا۔ خطبہ شقشقیہ امیر المؤمنینؑ کا کلام ہے؟

قبل اس کے کہ ہم خطبہ کی تشریح کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس خطبہ کے بارے میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیں، لہذا اس موقعہ پر چند امور کا ذکر ضروری ہے۔

ا۔ علماء تشیع اور بہت سے علماء تسنن کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ خطبہ کلام امیر المؤمنینؑ ہے یا سید رضیؒ کی اختراع ہے؟ جہاں تک علمائے تشیع کا تعلق ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ ان کا اس بات پر اتفاق اور ان سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ امیر المؤمنینؑ ہی کا کلام ہے۔ آج تک مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اس بات کا انکار کرے، بلکہ بہت سے محققین، فقہاء، متکلمین اور محدثین وغیرہ نے اپنی تالیفات میں اسے نقل کیا ہے اور کہیں بھی اس کے بارے میں اختلاف نہیں کیا۔ علمائے اہل تسنن میں سے بہت سے افراد اس بات کے قائل ہیں کہ یہ حضرت امیرؑ کا کلام نہیں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس خطبے میں درد بھری داستان پیش کی گئی ہے اور امامت کے بارے میں شکوہ و شکایات سے کام لیا گیا ہے۔ اور اپنے ظلم کا ذکر ہے اور خلافت کے غصب ہونے کا شکوہ ہے۔ جبکہ بعض تو افراط کی اس حد تک چلے گئے ہیں کہ کہتے ہیں حضرت امیرؑ تو زندگی بھر نہ تو حرف شکایت زبان پر لائے اور نہ ہی اس قسم کا کوئی کلام ارشاد فرمایا۔ ان میں سے بعض حضرات وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ سارا خطبہ امیر علیہ السلام کا ہے لیکن ان کے زعم باطل کے مطابق اس کا ابتدائی

حصہ اس سے تعلق نہیں رکھتا، کیونکہ یہ طعن و تشنیع پر مشتمل ہے اور ان کے بزرگوں کے بارے میں قدح کا پہلو نکلتا ہے۔ ان میں قاضی عبدالجبار بغدادی اور شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی بھی شامل ہیں، جیسا کہ آگے چل کر تفصیلاً معلوم ہوگا۔

قول مصنف : حقیقت یہ ہے کہ یہ خطبہ حضرت امیرؑ کا ہی ہے اور اس میں انکار کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے کئی دلائل ہیں :

اوّل۔ کلام کی فصاحت، اس کا حسن اسلوب، اس کا لاثانی ہونا، اس کا لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کلام "فَوْقَ كلامِ المخلوقِ و دُونَ كلامِ الخالق"۔ مخلوق کے کلام سے بالاتر اور خالق کے کلام سے کم درجے کا ہے اور بذات خود یہ کلام شاہد صادق ہے کہ مصدر امامت اور معدن ولایت کے دہان اقدس سے نکلا ہے۔

دوم۔ منکر کی اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کہ "چونکہ اس میں کچھ لوگوں کے مظالم پر مشتمل دکھ بھری باتیں اور ان کے خلاف شکوہ و شکایت کا اظہار ہے لہٰذا یہ کلام امیر المومنینؑ نہیں ہے"۔ کیونکہ اس بارے میں آپؑ کا اس قسم کا کلام دوسرے مقامات پر اس قدر زیادہ ہے جس کی کوئی حد نہیں وانتہا نہیں ہے، جیسا کہ "سقیفہ" کے بارے میں آپؑ کی شکایات اور خلافت کے مقابلے میں "بزور خلیفہ" بننے والے افراد کے ساتھ آپؑ کی احتجاجی گفتگو اس قدر کثرت کے ساتھ موجود ہے کہ ضروریات میں اس کا شمار ہوتا ہے جس کا انکار یا تو جاہل کر سکتا ہے یا پھر جان بوجھ کر لاعلم بننے والا۔

سوم۔ یہی خطبہ اہل تشیع اور تسنن کی ان کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے جو سید رضیؒ کے زمانے سے بھی بہت پہلے ہو گزرے ہیں۔

شارح بحرانی کا موقف : شارح بحرانی فرماتے ہیں کہ اس خطبے کو میں نے دو ایسے مقامات پر دیکھا ہے جن کی تاریخ سید رضیؒ کی ولادت بہت پہلے کی ہے :

ا۔ معتزلہ کے بہت بڑے عالم ابوالقاسم کعبی کے شاگرد جعفر بن قبہ کی تالیف "الانصاف" ہے، جو سید رضیؒ کی ولادت سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔

۲۔ میں نے ایک نسخہ ایسا دیکھا ہے جو مقتدر باللہ کے وزیر ابوالحسن علی بن محمد بن فرات کے ہاتھوں کا لکھا ہوا تھا۔ اور یہ بات سید رضیؒ کی ولادت سے ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ پہلے کی ہے۔ بلکہ میرا گمان غالب یہی ہے کہ وہ نسخہ ابن فرات کے پیدا ہونے سے بھی پہلے لکھا گیا تھا"۔

شارح معتزلی کیا کہتے ہیں : شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی فرماتے ہیں کہ : "مجھ سے میرے استاد بزرگوار شیخ ابوالخیر مصدق ابن شبیب واسطی نے ۶۰۳ ہجری میں بیان کیا ہے کہ میں نے یہ خطبہ ابو محمد عبداللہ بن احمد المعروف "ابن خشاب" کے سامنے پڑھا اور ان سے پوچھا کہ "آیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خطبہ از خود تیار کر کے حضرت علیؑ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے ؟" انہوں نے کہا "نہ خدا کی قسم! میں تو اس بارے میں اس قدر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ علیؑ کا کلام ہے جس طرح تمہارے متعلق کہ تم مصدق بن شبیب ہو" پھر میں نے کہا کہ "بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سید رضیؒ کا کلام ہے!" انہوں

نے کہا "رضیؒ ہوں یا کوئی اور، ان میں اس قدر قابلیت کہاں کہ اس طرح کا کلام اور اس انداز کا اسلوب پیش کریں۔ ہم نے سید رضیؒ کے کلام کو ان کے کتب و رسائل میں بھی دیکھا ہے اور ان کے طریقے اور فن کو بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام اور اس خطبے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا کی قسم! میں نے یہ خطبہ تو ایسی کتابوں میں بھی دیکھا ہے جو سید رضیؒ کی پیدائش سے بھی دو سو سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ بلکہ میں نے تو اسے ایسے خطوط میں لکھا ہوا پایا جنہیں میں جانتا ہوں اور ایسے علماء اور ادیبوں کی کتابوں میں لکھا ہوا دیکھا ہے جو سید رضیؒ کے والد ابو محمد نقیب کی ولادت سے بھی بہت پہلے گزر چکے ہیں"۔

ابن ابی الحدید ہی کہتے ہیں کہ :"بذات خود میں نے یہ خطبہ بڑی حد تک اپنے بزرگوار شیخ ابو القاسم بلخی کی تصنیفات میں دیکھا ہے جو بغداد میں معتزلہ کے امام تھے، اور خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے میں تھے اور مقتدر باللہ کے زمانے میں تھے اور مقتدر باللہ کا دور حکومت سید رضیؒ کی ولادت سے بہت کافی عرصہ پہلے تھا۔ اسی طرح میں نے اس خطبہ کو کافی حد تک مذہب امامیہ کے متکلم ابی جعفر ابن قبہ کی کتاب "الانصاف" میں بھی دیکھا ہے۔ یہی ابو جعفر شیخ ابو القاسم بلخی کے شاگرد تھے اور ان کی وفات اس دور میں ہوئی جبکہ سید رضیؒ کی ابھی تک ولادت بھی نہیں ہوئی تھی"

علامہ مجلسیؒ کا موقف

محدث مجلسیؒ اپنی کتاب بحار الانوار میں کہتے ہیں کہ :"اس غلط اور بے ہودہ دعوے کے جھوٹا ہونے کیلئے ایک شاہد یہ بھی ہے کہ قاضی عبد الجبار جو متعصب معتزلی تھے اپنی کتاب "المغنی" میں اس خطبہ کے بعض کلمات کی توجیہ و تاویل کرتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے، پہلے خلفاء پر کوئی زد نہیں پڑتی مگر اس کے کلام امیر المؤمنینؑ ہونے سے انکار نہیں کرتے، اور سید مرتضیٰ نے اسے اپنی کتاب "الشافی" میں ذکر کیا ہے حالانکہ وہ اپنے بھائی سید رضی سے بڑے تھے۔ اور قاضی عبد الجبار تو ان دونوں سے پہلے گزر چکے تھے، اگر انہیں خطبہ کے استناد میں کوئی خامی نظر آتی تو اسے مسترد کر دیتے اور عذر خواہی کے مقام پر رکیک تاویلات کا سہارا نہ لیتے جس طرح انہوں نے بہت سی مشہور روایات میں ایسا کیا ہے۔ صاحب انصاف کیلئے تو یہ بات بھی کافی ہے کہ یہ خطبہ شیخ صدوقؒ کی تصنیفات میں بھی موجود ہے جن کی وفات ۳۲۹ھ میں ہوئی جبکہ سید رضیؒ کی ولادت ۳۵۹ھ میں ہوئی"۔

اسی طرح اس خطبے کیلئے شیخ مفیدؒ کی روایت بھی شاہد ہے کیونکہ شیخ مفیدؒ، سید رضیؒ کے استاد اور بزرگ ہیں ہماری اس مستند اور تفصیلی گفتگو سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ یہ خطبہ حضرت امیر المؤمنینؑ ہی کا ہے اور اس میں شک اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور میرے خیال میں جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ صرف اس بنا پر کہ اس سے خلافت کے دعویداروں پر زد پڑتی ہے۔ انہیں اور تو کوئی نقص نظر نہ آیا اس جلدی سے اس کا انکار کر دیا تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، اور یہ ان لوگوں کی پرانی عادت ہے، جب بھی کوئی ایسی روایت دیکھتے ہیں جو علیؑ کی خلافت پر نص قطعی ہوتی ہے یا ان کے کسی "بزرگ" پر زد پڑتی ہے تو فوراً اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ ان لوگوں نے "حدیث غدیر" تک کا انکار کر دیا ہے حالانکہ یہ ایک متواتر حدیث ہے جسے پیغمبر اکرمؐ نے مہاجرین و انصار اور شہری و دیہاتی کے ستر ہزار کے اجتماع میں بیان فرمایا۔ اے کاش! کہ شارح معتزلی اس حدیث کا بھی سرے سے انکار کر دیتے تاکہ ان کی اس سے بھی جان چھوٹ جاتی اور بیہودہ تکلفات اور جھوٹی تاویلات پیش کرنے کی نوبت ہی نہ

آتی اور ثلاثہ کے دامن پر لگے دھبوں کو صاف کرنے کی کوشش نہ کرنا پڑتی، لیکن انہیں معلوم نہیں کہ "زنگ بارنگ پاک نمی شود"۔

۲۔ چند اور معرکۃ الآراء مسائل

الف: قدیم الایام سے شیعہ اور سنی کے درمیان مسئلہ امامت معرکۃ الآراء چلا آرہا ہے۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ ا۔ سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد آیا امام کا نصب کرنا خدا پر واجب ہے یا بندوں پر؟ ۲۔ آیا امامت کا تعلق عقل سے ہے یا سماعت سے؟

ب: آیا امام کیلئے عصمت ضروری ہے یا نہ؟

ج: آیا واجب اور ضروری ہے کہ امام اپنی رعیت سے افضل ہو؟

د: حضرت رسول خداؐ کے بعد امام کون ہے؟ وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو علماء اسلام کے درمیان معرکۃ الآرا مسائل کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق علم کلام سے ہے لہذا ہمیں ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مقدمہ میں ہمارے بحث کرنے کا مقصد صرف یہ ہے چونکہ شارح (ابن ابی الحدید) معتزلی حضرت امیر المؤمنین کی افضلیت کے بھی قائل ہیں اور انہیں ثلاثہ سے بھی افضل جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود مستحق خلافت اصحاب ثلاثہ کو سمجھتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اسی بنا پر ہم اس مقدمہ میں قدرے تفصیل سے بحث کریں گے۔ شارح معتزلی ادھر تو اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سب سے افضل ہیں اور افضل سے ان کی مراد "ثواب میں زیادہ" ہی نہیں بلکہ فضائل اور خصال حمیدہ میں بھی سب پر فضیلت رکھتے ہیں اور فضائل و کمال میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ اور اس اصل کو مزید مضبوط کرنے کیلئے انہوں نے اپنی شرح کے دیباچے میں آپؑ کی افضلیت کا اقرار کرنے کے بعد جو کہ اصل کی حیثیت رکھتی ہے فرع میں اپنے دوسرے بغدادی علماء کی طرح پینترا تبدیل کر گئے اور اس شجر کے ثمرے کو ضائع کر بیٹھے اور اپنی ذہنی اختراع کے تحت "مرجوح کو راجح پر ترجیح" اور "مفضول کو افضل پر فوقیت" کا مفروضہ تیار کر لیا، حالانکہ یہ مفروضہ نہ عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی نقل اس کی تائید کرتی ہے۔ اور پھر اس قبیح نظریئے کی نسبت تو کبھی خداوند متعال کی طرف دیتے ہیں اور اپنی کتاب کے ابتدائی خطبے میں یوں تحریر کرتے ہیں "...... وَقَدَّمَ الْمَفْضُوْلَ عَلَى الْاَفْضَلِ لِمَصْلِحَةٍ اقْتَضَاهَا التَّكْلِيْفُ" خدا کا شکر کہ اس نے شرعی مصلحت کے تقاضوں کے پیش نظر مفضول کو افضل پر مقدم کیا۔ اور کبھی بذات خود امامؑ کی طرف اس کی نسبت دیتے ہیں کہ "انہوں نے خود بخود ہی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کیا، کیونکہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ گئے تھے کہ عربوں کے سینوں میں ان کی دشمنی اور کینے کی ہانڈیاں جوش کھا رہی ہیں لہذا اگر سریر آرائے خلافت ہوئے تو اسلام کا شیرازہ بکھر جائے گا اور مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا اور مسلم امہ کی وحدت ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گی"۔ شارح موصوف نے اسی بات کو مختلف مقامات پر اور مناسب موقعوں پر بار بار دہرایا ہے اور مبالغے کی حد تک اسی بات پر مصر ہیں۔ جس طرح کہ امیر المؤمنینؑ کی امامت پر نص جلی کا صاف انکار کر دیا اور یہ نظریہ قائم کیا کہ: "حضرت علیؑ کی

خلافت کا استحقاق صرف اس بنیاد پر ہے کہ وہ سب سے افضل ہیں، اس وجہ سے نہیں کہ ان کے بارے میں خدا یا رسولؐ کی طرف سے کوئی بھی نص موجود ہے"۔ اور چونکہ ان کی فاسد رائے اور غلط نظریئے کے مطابق آپؑ کی خلافت پر کوئی نص موجود نہیں یا اگر ہے تو اس کی صراحت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی تاویل کر لیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے زعم باطل کے مطابق ان کی خلافت کے مقابلے میں دوسروں کے حق میں کہتے ہیں کہ قطعی دلیل موجود ہے، لہذا آپؑ نہیں بلکہ دوسرے اس کے مستحق ہیں۔

چنانچہ وہ پہلے کی خلافت کی قطعی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اس پر اجماع منعقد ہوا تھا اور بیعت صحیح اور شرعی تھی،...... وغیرہ جیسے بودے اور نا قابل اعتبار دلائل پیش کرتے ہیں، ان دلائل میں سے کچھ تو انہوں نے سابقہ خطبے کی ضمن میں پیش کئے ہیں جیسا کہ آپ ابھی مطلع ہو چکے ہیں اور بہت سے زیر نظر خطبے کے ضمن میں پیش کئے ہیں اور اسی طرح مناسب موقعوں پر دوسرے خطبوں میں ذکر کئے ہیں۔ اسی لئے ہم نے بھی تہیہ کر رکھا ہے کہ اپنی اس کتاب میں ایسی فضول باتوں سے دنیا والوں کو باخبر کریں، ان کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کریں اور لغزشوں سے دوسروں کو مطلع کریں تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں۔

چونکہ جہاں جہاں پر موصوف کے قدم ڈگمگائے ہیں اور قلم نے لغزش کھائی ہے، اس کی فہرست بہت طولانی ہے اور پھر اس کا جواب اس سے بھی زیادہ طولانی، لہذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں ایک اصل کافی کو ذکر کیا جائے جو تمام حوالہ جات کیلئے ایک جامع اور اصولی قاعدہ کی حیثیت کی حامل ہو اور موصوف نے سابقہ خطبہ میں یا زیر نظر یا آئندہ خطبات میں جو موقف اختیار کیا ہے اسے باطل کیا جائے۔ اس مقدمہ میں ہمارا اولین مقصود حضرت علی بن ابی طالبؑ کی خلافت بلا فصل کو عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کرنا اور یہ بتانا ہے کہ عقلی اور نقلی دلائل اس قدر قوی اور جاندار ہیں جو علیؑ کے علاوہ کسی اور کو خلافت کا مستحق قرار نہیں دیتے۔ اور ان دلائل کو دو مقاصد میں پیش کیا جائے گا۔

مقصد اول

علیؑ کی خلافت بلا فصل پر نقلی دلائل

اور ان دلائل کو دو قسموں میں بیان کیا جائے گا:

پہلی قسم: قرآنی آیات ہیں۔

حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل پر قرآنی آیات اس کثرت کے ساتھ موجود ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس لئے ہم اس مقام پر ایسی آیات کو بیان کریں گے جن کی دلالت زیادہ قوی اور حجت زیادہ پائیدار ہے۔

۱۔ آیت ولایت

۱۔ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ" (مائدہ / ۵۵) (اے ایماندارو!) تمہارے سرپرست و مالک بس یہی ہیں خدا، اس کا

رسولؐ اور وہ مؤمنین ہیں جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکواۃ دیتے ہیں۔

"ولی" کے معنی "ناصر" اور "دوست" کے بھی ہیں جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے "اَلْمُؤْمِنُوْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" (مائدہ / ۵۱) مؤمنین ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ "ولی" کا ایک اور معنی ہے "تصرف کرنے والا" اور "اولی بالتصرف"، جیسے مثال ہے "اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لاَ وَلِيَّ لَهُ" سلطان اس کا ولی ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ یا حضرت رسالت مآبؐ فرماتے ہیں: "اَيُّمَا امْرَأَةٌ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا...... "یعنی جو بھی عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے...... یعنی اولی بالتصرف اور سرپرست۔

مندرجہ بالا تصریحات کے مطابق آیہ ولایت میں بیان ہونے والے لفظ "ولی" کا معنی "ناصر" یا "دوست" نہیں بلکہ "اولی بالتصرف" ہے۔ کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے ولایت، تمام مؤمنین کیلئے عمومی حیثیت رکھتی ہے جس طرح کہ سابقہ آیت اس کی شاہد ہے، لہذا ضروری ہوجاتا ہے کہ "ولی" کا معنی اولیٰ بالتصرف اور سرپرست لیا جائے اور اس معنی کے لحاظ سے آیت میں تیسرے ولی سے مراد "علیؑ" کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

۱۔ علیؑ ہی ولی ہے

اس کی چند دلیلیں ہیں۔

۱۔ اجماع مرکب: یعنی جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت سے مراد ایک خاص شخص ہے کیونکہ "اِنَّمَا" کا کلمہ حصر ہے اور حصر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک خاص شخص مراد لیا جائے تو وہ "علیؑ" کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ اس بات پر بھی اجماع ہے کہ حالت رکوع میں صرف حضرت علیؑ ہی نے زکواۃ دی ہے لہذا آیت سے بھی آپؑ ہی مراد ہوں گے اور آیت آپؑ سے مخصوص اور آپؑ کی امامت پر دلیل ہوگی۔

۳۔ شرح تجرید قوشجی کے مطابق مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب حضرت علیؑ نے حالت رکوع میں انگوٹھی زکواۃ دی۔ ابن شہر آشوب نے بھی کتاب "الفضائل" میں یہی کہا ہے کہ: "امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت امیر المؤمنینؑ کی شان میں نازل ہوئی"۔

۴۔ بڑی حد تک بلکہ تواتر کی حد تک شیعہ سنی روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

محدث جلیل القدر علامہ سید ہاشم بحرانی نے اپنی کتاب "غایۃ المرام" میں چوبیس حدیثیں سنی ذرائع سے اور انیس حدیثیں شیعہ ذرائع سے نقل کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت حضرت امیر المؤمنین علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ مزید تفصیلات کیلئے کتاب مذکور کا مطالعہ کیا جائے۔

اسی سلسلے میں شاعر دربار رسولؐ حسان بن ثابت کہتے ہیں؛

اَبَا حَسَنٍ تُفْدِيْكَ نَفْسِيْ وَ مُهْجَتِيْ وَ كُلُّ بَطِئٍ فِي الْهَوَاءِ مُسَارِعُ
اَيَذْهَبُ مَدْحِيْ وَ الْمَخْبَرُ ضَائِعٌ وَ مَا الْمَدْحُ فِيْ جَنْبِ الْاِلٰهِ بِضَائِعٍ
فَاَنْتَ الَّذِيْ اَعْطَيْتَ اِذَا كُنْتَ رَاكِعًا فَدَتْكَ نُفُوْسُ الْقَوْمِ يَاخَيْرَ رَاكِعٍ
فَاَنْزَلَ فِيْكَ اللّٰهُ خَيْرَ وِلَايَةٍ وَ بَيَّنَهَا فِيْ مُحْكَمَاتِ الشَّرَائِعِ

اے ابوالحسن (علیؑ) میرے دل و جان بھی آپؑ پر قربان اور اس فضا میں رہنے والا ہر سست و چست بھی قربان، کیا میری مدحت اور میری یہ خبر جو میں دے رہا ہوں ضائع ہو جائے گی، جو مدحت خدا کے حضور کی جائے وہ ضائع نہیں جاتی۔ ابوالحسنؑ! آپؑ وہی تو ہیں جس نے رکوع کی حالت میں زکواۃ دی، اے بہترین رکوع کرنے والے ساری قوم کی جانیں آپؑ پر قربان جائیں۔ آپؑ کے اس اقدام سے اللہ نے آپؑ کیلئے بہترین ولایت نازل فرمائی اور اسے محکم شرائع _ قرآن کی آیات محکمات _ میں واضح طور پر بیان فرمادیا۔

امام رازی کے اشکالات

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ آیت ولایت علی بن ابی طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور آپؑ کو زکواۃ کے بدلے میں ولایت عطا ہوئی ہے۔ لیکن برا ہو تعصب کا کہ وہ کیا کیا گل کھلاتا ہے۔ ساری دنیا تو اس بات کو تسلیم کرے لیکن امام رازی نے اہل بیتؑ کے ساتھ اپنے دیرینہ بغض کی وجہ سے اس پر کئی طرح کے اشکالات قائم کئے ہیں، کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد علیؑ نہیں ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ بالفرض اگر علیؑ مراد ہوں بھی تو یہ آیت آپؑ کی ولایت کی دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تو جب ہو کہ جب آیت میں مذکور لفظ "ولی" کے معنی اولی بالتصرف" ہوں۔ جب معنی ہی ناصر اور دوست کے ہیں تو پھر کیونکر ولی قرار پا سکتے ہیں؟

امام رازی دلائل سے کام لیتے ہیں

موصوف اپنے پہلے دعوے، یعنی اس سے مراد علی بن ابی طالب نہیں ہیں، پر چند دلائل پیش کرتے ہیں:

۱۔ زکوۃ کا اطلاق واجب پر ہوتا ہے مستحب پر نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے "وَ آتُوا الزَّكٰوةَ" (زکواۃ ادا کرو) تو اگر انہوں نے واجب زکواۃ کو رکوع کی حالت میں ادا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک واجب کی ادائیگی میں تاخیر سے کام لیا ہے اور اسے اول وقت میں ادا نہیں کیا۔ اور ایسا کرنا اکثر علماء کے نزدیک گناہ ہے اور گناہ کی نسبت علیؑ کی طرف دینا جائز نہیں ہے، لہذا آیت علیؑ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔ اگر زکواۃ سے مراد "مستحب زکواۃ" یعنی صدقہ و خیرات لی جائے تو یہ اصل کے خلاف ہے کیونکہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ "وَ آتُوا الزَّكٰوةَ" کی ظاہری دلالت واجب زکوۃ پر ہوتی ہے۔

۲۔ علیؑ کی عبادت کے شایان شان ہی یہ امر ہے کہ جب وہ نماز کی حالت میں ہوتے تو ان کا دل ذکر الٰہی میں اس قدر ڈوب جاتا کہ ماسوی اللہ سے بے خبر ہو جاتے تو اس دوران میں انہیں سائل کی آواز سننے کی فرصت ہی کہاں تھی کہ اسے سن کر حالت رکوع میں زکواۃ دیتے؟ جیسا کہ علیؑ کے خضوع و خشوع کی ترجمانی یہ آیت کر رہی ہے: "اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" (آل عمران/۱۹۱) جو لوگ کہ اٹھتے بیٹھتے خدا کو یاد کرتے ہیں اور پہلو بدلتے (غرض ہر حال میں) اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں۔ جس کا دل ذکر و فکر میں مشغول ہو وہ کسی کی بات

نہیں سن سکتا۔

۳۔ سائل کو حالت رکوع میں زکواۃ دینا فعل کثیر کہلائے گا جو نماز کے باطل ہونے کا موجب ہے اور علیؑ ایسا کام نہیں کر سکتے۔

۴۔ مشہور یہ ہے کہ علیؑ ایک غریب آدمی تھے، آپؑ کے پاس اتنا مال ہی نہیں تھا کہ جس پر زکواۃ واجب ہوتی۔ اس لئے شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ جب آپؑ نے تین روٹیاں سائل کو دی تھیں تو اس پر سورہ "ھل اتی" نازل ہوئی اور یہ اس وقت ہی ممکن ہے کہ جب آپؑ غریب ہوں، لیکن جب اس قدر مال ہو کہ اس پر زکواۃ واجب ہو جائے تو پھر تین سوکھی روٹیاں فقیر کو دینے پر اس قدر عظیم تعریف کا مستحق نہیں ہوتا کہ اس کیلئے پوری سورت نازل کی جائے۔ اور جب اتنا مال نہیں ہے کہ جس پر زکواۃ واجب ہو جائے تو ایک انگوٹھی دینے پر اس کیلئے "یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ رَاکِعُوْنَ" کیونکر نازل ہو سکتی ہے؟

اور اب ان کا جواب :

امام المشککین فخر الدین رازی کے گمراہ کن دلائل آپ نے سن لئے اور اب ان کا جواب بھی ملاحظہ ہو۔ موصوف کے دلائل کا ترتیب وار جواب دیا جائے گا:

ا۔ یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ "زکواۃ کا اطلاق صرف واجب زکواۃ پر ہی ہوتا ہے" صحیح نہیں ہے بلکہ جس طرح دوسری عبادات واجب اور مستحب پر مشتمل ہوتی ہیں اسی طرح زکواۃ کا اطلاق بھی واجب اور مستحب دونوں پر ہوتا ہے۔ ورنہ یہ بات لازم آئے گی کہ مستحبات کیلئے علیحدہ اور مخصوص نام ہوں جو انہیں واجبات سے الگ کریں۔ اسی بنا پر موصوف کا مذکورہ نظریہ تمام دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ ہوگا کیونکہ تمام امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادات خواہ واجب ہوں یا مستحب دونوں کیلئے ایک ہی نام استعمال ہوتا ہے۔ اور آج تک ہمیں ایسا کوئی شخص نہیں ملا جو نام میں فرق کا قائل ہو اور نہ ہی ہمیں مستحبات کیلئے علیحدہ مستقل نام ملے ہیں جو کسی فقہی یا اصولی کتاب میں ہوں اور نہ ہی کتاب و سنت نے واجب اور مستحب کیلئے الگ الگ نام تجویز کئے ہیں۔ اگر "وَ آتُوا الزَّکٰوۃَ" میں زکواۃ واجب ہی کا ذکر ہے اس لئے کہ اس کا امر کے ساتھ تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ "زکواۃ ہے ہی مطلقاً واجب کا نام"۔ کیونکہ اگر کسی چیز کا نام مقدمہ کے طور پر حکم سے تعلق رکھتا ہو اور ذات اور مرتبے کے لحاظ سے اس کا واجب کے ساتھ تعلق ہو تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ زکواۃ کا لفظ جہاں پر بھی بولا جائے تو وہ واجب ہی کیلئے ہوگا۔ خواہ اس کا تعلق امر سے نہ بھی ہو، جیسے خود اسی آیت "وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ" میں ہے جو ہمارے زیر بحث ہے یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ "اَلزَّکٰوۃُ عِبَادَۃٌ" (زکواۃ عبادت ہے) وغیرہ وغیرہ۔

بالفرض۔ آپ کے نظریئے کے مطابق ہی سہی۔ زکواۃ واجب کا نام ہے تو اس سے یہ بات کہاں سے لازم آتی ہے کہ اگر اسے بروقت ادا نہ کیا جائے تو انسان گنہگار ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ادائیگی میں تاخیر جائز بھی قرار پاتی ہے، جیسے زکواۃ کی ادائیگی تو واجب ہو چکی ہے لیکن اس کے حصول کیلئے مستحق نہیں ملتا یا کوئی اور شرعی عذر پیش آجاتا ہے جس سے اس کے ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے انسان کہاں مجرم ہوتا ہے؟ حتی کہ بعض فقہاء کے مذہب کے مطابق تو تاخیر کو جائز قرار دیا گیا ہے اور امام ابو حنیفہ اور دوسرے اہل سنت فقہاء دو ماہ تک کی تاخیر کے قائل ہیں۔ بہر حال مذکورہ دلیل پیش کر کے امام موصوف نے اپنے باطن

کی حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔

۲۔ یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ "علیؑ کا نماز میں مشغول ہونا اور ان کے دل کا ذکر الٰہی میں ڈوب جانا اس بات کی نفی کرتا ہے کہ آپؑ نماز میں سائل کی آواز سن کر اسے انگوٹھی دیدیں" یہ بھی خلاف حقیقت ہے۔ اس لئے کہ وہ توجہ نماز کے منافی ہوتی ہے جو دنیوی امور کیلئے ہو اور نماز کے خضوع و خشوع سے مانع ہو، لیکن مستحق فقیر کو حالت رکوع میں انگوٹھی دینا حصول رضائے پروردگار کیلئے تھا اور اس کے سوال کی طرف توجہ خشوع و خضوع کے منافی ہی نہیں بلکہ عین ذکر الٰہی تھا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نماز میں غیر اللہ کی طرف مطلق توجہ خشوع و خضوع کے منافی ہے تو یہ بات سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تو تصور نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کے باوجود ہمیں ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت میں آپؐ کی توجہ دوسری طرف بھی مبذول ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ :"نماز کی حالت میں تسبیح _ سبحان اللہ _ وغیرہ کے ذریعے اپنی ضرورت کو دوسروں کیلئے بیان کرنا جائز ہے کیونکہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیا کرتے تھے"۔ اور وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ :"بعض اوقات ایسا ہوتا کہ میں جناب رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے اجازت مانگتا، اگر حضورؐ نماز میں مشغول ہوتے تو بلند آواز سے "سبحان اللہ" کہہ دیتے جس سے میں سمجھ جاتا کہ آپؐ نے اجازت دے دی ہے اور اگر نماز کی حالت میں نہیں ہوتے تو فرماتے تھے کہ "آجاؤ"۔

حضرت امام ابو حنیفہ نماز میں سلام کا جواب دینے کو جائز سمجھتے ہیں اور وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ :"حضرت رسالت مآبؐ بنی عمرو بن عوف کی مسجد میں نماز کیلئے تشریف لے گئے، اس وقت "صہیبؓ" بھی ان کے ہمراہ تھے، اتنے میں انصار کے کچھ افراد اندر آگئے اور انہوں نے آنحضرتؐ کو اس وقت سلام کیا جب آپؐ نماز پڑھ رہے تھے" راوی کہتے ہیں میں نے صہیبؓ سے پوچھا کہ :"آنحضرتؐ نے ان لوگوں کے سلام کا جواب کیونکر دیا؟" تو انہوں نے کہا کہ :"اپنے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ!"۔

اگر نماز کی حالت میں غیر اللہ کی بات سننا مطلقاً خضوع و خشوع کے منافی ہے تو پھر حضرت رسول خداؐ ان کے سلام کو کیسے سن لیتے اور اشاروں سے ان کے سلام کا جواب کیونکر دیتے؟ اسی طرح ایک اور روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ : "حضور رسالت مآبؐ نماز پڑھ رہے تھے اور عمار یاسرؓ نے آکر آپؐ کو سلام کیا آپؐ نے نماز ہی کی حالت میں ان کے سلام کا جواب دیا"۔

علاوہ ازیں اور بھی دلیلیں ابھی آیا چاہتی ہیں، انتظار کیجئے!!

۳۔ انہوں (رازی) نے جو یہ کہا ہے کہ :"رکوع کی حالت میں حضرت علی علیہ السلام کا فقیر کو انگوٹھی دینا "فعل کثیر" شمار ہوتا ہے جس سے آپؑ کی نماز باطل ہو گئی تھی"۔ ہم ان کے اس استدلال کو مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر مسترد کرتے ہیں :

۱۔ الف: عامہ کی روایات میں ملتا ہے کہ "آنحضرتؐ نماز کی حالت میں اپنے جوتے اتارے تھے"۔

اس مقام پر قابل غور بات یہ ہے کہ نماز کی حالت میں سائل کا انگلی سے انگوٹھی اتارنا فعل کثیر ہے یا آنحضرتؐ کا اپنے جوتے اتارنا؟ ۔ دل صاحب انصاف سے انصاف طلب ہے۔

ب: اسی طرح ان روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ "حضور پاکؐ نے نماز کی حالت میں "امامہ بنت

العاص" کو اٹھایا ہوا تھا، جب سجدے میں جاتے تو اسے زمین پر بٹھادیتے تھے اور جب کھڑا ہونے لگتے تو اٹھا لیتے تھے"۔ پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ "فقیر کا انگوٹھی اتارنا فعل کثیر ہے یا حضورؐ کا امامہ کو اٹھانا بٹھانا؟"۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں ایسی روایات سے اختلاف ہے۔

ج: آنحضرتؐ نے نماز پڑھتے ہوئے بچھو کو مار ڈالا۔

د: "آپؐ نماز پڑھ رہے تھے، آپؐ کے ساتھ ابن عباس بھی آکھڑے ہوئے۔ اللہ جانے اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟۔ تو حضورؐ نے اس کے کان سے پکڑ کر بائیں سے دائیں طرف کو پھیر دیا"۔ پھر وہی بات کہ۔ سائل کا انگوٹھی اتارنا فعل کثیر ہے یا حضور کا ابن عباس کے کان پکڑنا؟

ہ۔ حضورؐ پاک نے نماز کی حالت میں سانپ اور بچھو کے مارنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ چلو ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ اور وہ بالفرض محال۔ کہ فعل کثیر سے حضرت امیرؑ کی نماز باطل ہو گئی۔ لیکن یہ اس وقت قابل قبول ہے کہ جب انگوٹھی حضرتؑ خود ہی اپنے ہاتھ سے اتارتے اور خود ہی سائل کو دیتے۔ لیکن یہاں تو بات ہی دوسری ہے اور وہ یہ کہ اشارہ تو آپؑ نے کیا تھا۔ لیکن انگوٹھی سائل نے اتاری تھی۔ تو پھر اسی صورت میں فعل کثیر کہاں سے لازم آگیا؟ اب ملاحظہ فرمائیے ہمارے اس دعوے کی دلیل اور وہ یہ کہ: "حموینی۔ جن کا تعلق علماء عامہ سے ہے۔ اسناد کے ساتھ انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سائل مسجد نبویؐ میں آیا اور آکر کہنے لگا کہ "کون ہے جو خداوند توانگر اور وعدہ وفا کو قرض دے؟" اس وقت حضرت علیؑ رکوع میں تھے سائل ان کے پیچھے کھڑا تھا، انہوں نے ہاتھ کے اشارے کی زبان سے اسے کہا کہ ہاتھ سے انگوٹھی اتار لے۔ یہ کیفیت دیکھ کر آنحضرتؐ فرمایا: "عمر! واجب ہو گئی!" عمر نے کہا: "کیا واجب ہو گئی یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان؟" فرمایا: "جنت! خدا اس نے علیؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی ہی نہیں اتاری بلکہ تمام گناہ اور خطائیں بھی اتار کر ساتھ لے گیا"۔ اس بارے میں کشاف میں جار اللہ زمخشری فرماتے ہیں کہ: "یہ آیت۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ۔ علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب آپؑ رکوع کی حالت میں تھے اور سائل نے سوال کیا تو آپؑ نے اسی حالت میں اس کی طرف انگوٹھی پھینک دی جو کہ آپؑ کی چھنگلیا میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں کشادہ حلقے کے ساتھ تھی۔ آپؑ کو اس کے اتارنے کی بھی ضرورت نہیں ہوئی کہ جس سے فعل کثیر سرزد ہوتا اور اس سے نماز ٹوٹ جاتی"

۴۔ آیت میں مذکور "زکوٰۃ" سے مراد مستحبی زکوٰۃ یعنی صدقہ خیرات ہے۔ اور جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ صدقہ و خیرات پر بھی "زکوٰۃ" کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے جس طرح واجب پر اور اگر آپؑ غریب آدمی بھی تھے کہ آپؑ کے پاس اس قدر مال نہیں تھا، جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی۔ لیکن مستحبی زکوٰۃ یعنی صدقہ خیرات سے تو کوئی چیز مانع نہیں تھی اور یہ تو آپؑ کا معمول کا کام تھا۔ یہ بات اپنے مقام پر، لیکن اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آپؑ کی غربت اور فقر و فاقے مجبوری، بے بسی اور مال تک عدم رسائی کی وجہ سے نہیں تھے۔ بلکہ اس لئے تھے کہ آپؑ جود و سخا کا سمندر تھے کبھی کوئی سائل آپؑ کے دروازے سے خالی نہیں گیا، جو کچھ ملا راہ خدا میں صرف کر دیا، آپؑ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وراثت کے طور پر کوئی مال نہیں چھوڑا جبکہ اس وقت شام جیسے

علاقے کے علاوہ تمام عالم اسلام پر آپؑ کی حکمرانی تھی۔ اس بات پر گواہ وہ انگوٹھی ہے جو آپؑ نے سائل کو عطا فرمائی تھی، امام غزالی نے جس کے متعلق اپنی کتاب "سر العالمین" میں لکھا ہے کہ "وہ انگوٹھی سلیمانؑ بن داؤدؑ نبی کی تھی"۔

عمار بن موسیٰ ساباطی حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امامؑ نے فرمایا: "جو انگوٹھی حضرت علیؑ نے صدقے میں دی تھی اس کا وزن چار مثقال تھا، حلقہ چاندی کا تھا، نگینے کا وزن پانچ مثقال تھا نگینہ سرخ رنگ کا عقیق تھا جس کی قیمت پورے ملک شام کا خراج تھا اور شام کا خراج تین سو اونٹوں کا بار چاندی اور چار اونٹوں کا بار سونا ہوتا تھا اور یہ انگوٹھی "مران بن طوق" کے ہاتھ میں تھی جسے امیر المؤمنینؑ نے قتل کیا تھا اور اس کے ہاتھ سے اتار کر پیغمبرؐ کے پاس غنیمت کے طور پر لے آئے تھے تو پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ وہ خود لے لیں۔ آپؑ وہی انگوٹھی ہاتھ میں پہنے ہوئے آئے تھے اور پیغمبر کے پیچھے نماز پڑھی اور سائل کو حالت رکوع میں وہی انگوٹھی دے دی"۔

بہر حال بات خواہ کچھ بھی ہو، ہمارے اس سارے بیان سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ پر زکواۃ اس لئے واجب نہیں تھی کہ آپؑ کے پاس کبھی بھی زکواۃ کے نصاب کے برابر مال جمع نہیں ہوا تھا، جیسا کہ امام رازی کو مغالطہ ہوا ہے، بلکہ آپؑ ایک نہیں کئی نصابوں کے مالک ہوتے تھے لیکن ان سب کو راہ خدا میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اور آپؑ پر زکواۃ اس لئے کبھی واجب نہیں ہوئی نہیں ہوئی کہ مال کی محبت میں آکر آپؑ نے اسے اپنے پاس سال بھر کیلئے نہیں رکھا کہ اس پر زکواۃ واجب ہوتی۔ انہیں مال جمع کرنے سے ان کے جود و سخا اور زہد کا ملکہ مانع تھا۔ اور یہ امر بھی عادل ائمہ کیلئے لازم تھا کہ وہ غریب ترین لوگوں کی سی زندگی بسر کریں (اور اپنے آپ کو غنی نہ کہلوائیں) تا کہ کسی غریب سے غریب انسان کے دل میں بھی غربت کا خیال پیدا ہو تو ان کی حالت کو دیکھ کر دل کو تسلی دے سکے۔

خلاصہ کلام یہ کہ: حضرت علیؑ اس لئے غریب نہیں تھے کہ ان کے پاس کچھ نہیں تھا، جیسا کہ رازی سمجھے، بلکہ ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ راہ خدا میں غرباء و مساکین کو دے دیا کرتے۔ نیز یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ زکواۃ واجب نہ ہونے کے باوجود بھی آیت ولایت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

۲۔ ولی یعنی چہ ؟

امام رازی اپنے استدلال میں "ولی" کے معنی "دوست اور مددگار" کے لئے ہیں۔ اور "اولی بالتصرف" سے اس کا انکار کیا ہے۔ اپنے اس دعوے پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں:

۱۔ اگر اس کے پہلے اور اس کے بعد والی آیات کو دیکھا جائے تو ان سے بھی یہی معنی ظاہر ہوتا ہے یعنی مولا بمعنی "دوست" ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ" (مائدہ / ۵۱) اے مؤمنو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ ظاہری بات ہے کہ یہاں پر یہود و نصاریٰ کے متعلق یہ حکم نہیں ہے کہ "انہیں اپنے ارواح و اموال میں تصرف کا مالک نہ بناؤ" بلکہ مراد یہ ہے کہ "انہیں اپنا دوست و احباب قرار نہ دو، نہ ان کے ساتھ میل تال رکھو اور نہ ہی آپس میں

ان کی پشت پناہی حاصل کرو"۔ اور جب اس بات سے سختی سے منع کر دیا تو فرمایا: "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ رَاکِعُوْنَ" تو اس آیت میں ان ہستیوں کے ساتھ دوستی اور محبت کرنے کی راہنمائی کی گئی ہے۔ یعنی خدا، رسولؐ اور مذکورہ صفات کے حامل مؤمنین سے۔ اس آیت میں اسی "ولایت" کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ جس ولایت سے سابقہ آیت میں بچنے کا حکم ہے۔ تو جس ولایت سے بچنے کا حکم ہے وہ ولایت بمعنی دوستی اور نصرت ہے۔ لہٰذا اس آیت میں بھی اسی ولایت کو اپنانے کا حکم ہے یعنی دوستی اور نصرت کو۔

اس آیت کے بعد کی آیت ہے کہ: "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَالْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ" (مائدہ / ۵۷) اے مؤمنو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب خدا دی جاچکی ہے ان میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور کفار کو اپنا دوست نہ بناؤ اور اگر تم سچے ایماندار ہو تو خدا ہی سے ڈرتے رہو۔ اس آیت میں بھی اسی بات سے روکا گیا ہے یہود و نصاریٰ اور کفار کو اپنا دوست نہ بنایا جائے۔ یہاں پر بھی جس ولایت سے روکا گیا ہے وہ ولایت بمعنی نصرت و محبت ہے تو اس سے پہلی آیت میں بھی ولایت بمعنی نصرت ہی مراد ہو گی۔ اور جو شخص انصاف سے کام لے اور تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لے کر آیت سے پہلی اور بعد کی آیات میں غور و فکر سے کام لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ" میں بھی "ولی" بمعنی ناصر اور محبوب ہو گا اور "امام" کا معنی ہے ہی ناممکن۔ کیونکہ یہ دو ایک جیسے اور ایک ہی مقصد کیلئے بیان ہونے والے کلاموں کے درمیان ایک اجنبی کلام کا داخل کر دینا کلام کی پستی اور انتہائی گراوٹ کا موجب ہوتی ہے جس سے ذات خداوند عالم کا منزہ اور مبرا ہونا ضروری ہے۔

ب۔ اگر ہم ولایت کو اولی بالتصرف اور امامت پر حمل کرتے ہیں تو نزول آیت کے وقت آیت میں مذکور مؤمنین میں سے کوئی بھی مؤمن ایسا نہیں ملتا جو امامت یا اولی بالتصرف ہونے کی صفات سے متصف ہو۔ کیونکہ علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ بھی پیغمبر خداؐ کی موجودگی میں تصرف کا حق نہیں رکھتے تھے، جبکہ آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مؤمنین حال حاضر میں بھی حق ولایت و امامت رکھتے ہوں۔ اگر ہم ولایت کو محبت اور نصرت کے معنی پر حمل کرتے ہیں تو ولایت حال حاضر میں حاصل ہو جاتی ہے۔ تو اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ولایت کا محبت پر حمل کرنا "اولی بالتصرف" کے معنی پر حمل کرنے سے زیادہ بہتر اور موزوں ہے۔ اور ہمارے اس موقف کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی بنانے سے منع فرمایا ہے اور ساتھ ہی مؤمنوں سے موالات یعنی دوستی کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے مؤمنین کی دوستی حال حاضر میں میسر ہو تا کہ ایک ہی چیز میں نفی اور اثبات کا وجود عملاً ہو۔ لیکن اگر ولایت بمعنی تصرف کے ہو تو یہ چیز حال حاضر میں حاصل نہیں ہو گی۔ تو پھر آیت کو اس پر حمل کرنا بھی صحیح نہیں ہو گا۔

ج۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قابل ستائش افراد کا جمع کے صیغے کے ساتھ سات صورتوں میں ذکر کیا ہے۔ غور کیجئے ۱۔ وَالَّذِیْنَ ۲۔ آمَنُوْا ۳۔ الَّذِیْنَ ۴۔ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ ۵۔ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ ۶۔ وَ ھُمْ ۷۔ رَاکِعُوْنَ جس سے صرف ایک شخص مراد نہیں بلکہ ایک جماعت مراد ہے۔ اس لئے کہ جمع کے الفاظ کا مفرد پر تعظیم کیلئے حمل کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن اس کا معنی مجازی

ہوگا، جبکہ اصل یہ ہے کہ کلام کو حقیقت پر محمول کیا جائے۔

د۔ ہم پہلے ہی واضح دلائل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں کہ آیت "یَاَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا مَنۡ یَّرۡتَدَّ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰهُ بِقَوۡمٍ ......" (مائدہ / ۵۴) اے ایماندارو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر گیا تو خدا ایک ایسی قوم کو لے آئے گا...... ۔ حضرت ابوبکر کی امامت پر طاقتور دلیل ہے۔ اور اگر یہ آیت بعد الرسول حضرت علیؑ کی صحت امامت پر دلیل بنتی ہے تو پھر دونوں آیتوں کے درمیان تناقض لازم آجائے گا جو کہ باطل ہے۔ لہذا یہ بات اچھی طرح تسلیم کرنی پڑے گی کہ زیر بحث آیت بعد از پیغمبرؐ حضرت علیؑ کی امامت پر دلیل نہیں ہے۔

ہ۔ حضرت علیؑ ان رافضیوں سے زیادہ تر قرآن کو سمجھتے تھے۔ اگر یہ آیت ان کی امامت کی دلیل ہوتی تو وہ کسی محفل میں تو اس کا ذکر کرتے اور اپنی امامت پر بطور دلیل اسے پیش کرتے۔ لیکن اس مقام پر رافضی قوم کا وہی بہانہ پیش ہوگا کہ آپؑ نے یہ آیت تقیہ کی وجہ سے اپنی امامت کی دلیل کیلئے پیش نہیں کی۔ جبکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آنجنابؑ نے شوریٰ کے موقع پر اپنی امامت کے اثبات کیلئے غدیر خم اور مباہلہ کے واقعات کے علاوہ اپنے تمام فضائل و مناقب بطور دلیل پیش کئے لیکن اس آیت کو پیش نہیں کیا تو گویا مدعی ست گواہ چست کے مصداق حضرت علیؑ تو خاموش ہوں اور یہ رافضی پیش پیش ہوں، جس سے قطعی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ روافض کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا ان پر لعنت کرے۔

و۔ بالفرض یہ بھی مان لیتے ہیں کہ آیت حضرت علیؑ کی امامت پر دلالت کر رہی ہے، لیکن اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ بوقت نزول ان کی امامت پر دلالت نہیں کر رہی تھی کیونکہ رسول اللہؐ کی زندگی میں تو وہ امت کے امور میں تصرف کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ آخر کار انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ "علیؑ، بعد از پیغمبرؐ امام ہوں گے" جب وہ یہ کہیں گے تو ہم فوراً ہی یہ بات کہیں گے کہ "ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ کے بعد آپؑ امام بنیں گے اور چونکہ آیت میں وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا لہذا وہ ابوبکر، عمر اور عثمان کے بعد امام ہوں گے"۔

ز۔ اس میں شک نہیں کہ "اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ ......" میں امت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ اور افراد امت کو یہ قطعی یقین تھا کہ ان کے امور میں تصرف کا حق خدا اور اس کے رسول کو ہے۔ تو اللہ نے ان مؤمنین کے دلوں کو خوش کرنے اور انہیں یہ باور کرانے کیلئے کہ انہیں کفار کو اپنا دوست اور مددگار بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ جس کا ناصر و مددگار اللہ اور اس کے رسولؐ ہوں اسے یہود و نصاریٰ کو دوست بنانے اور ان سے نصرت طلب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو جب صورت حال ایسی ہو تو آیت میں مذکور ولایت سے مراد بھی نصرت اور محبت ہوگی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ آیت میں لفظ "ولی" صرف ایک بار مذکور ہے، لیکن جب اس سے ایک مرتبہ، ناصر اور دوست مراد لی جاچکی ہو تو پھر اولی بالتصرف مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ "لفظ مشترک کا استعمال ایک وقت اپنے دونوں معانی میں صحیح نہیں ہوتا"۔

ح۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کی ایک آیت میں مؤمنین کی مدح و ثنایوں کی ہے: "...... یُحِبُّهُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ" (مائدہ / ۵۴) ...... جنہیں خدا دوست رکھتا ہو گا اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ مؤمنوں

کے ساتھ منکسر اور کافروں کے ساتھ کڑے ہوں گے۔ لہذا جب ہم آیت ولایت میں نصرت اور محبت کے معنی مراد لیں گے۔ تو دونوں آیتوں کی مطابقت یوں ہوگی کہ :"اِنَّماوَلِيُّكُمُ اللّٰهُ رَسُوْلُهٗ" مفید ہوگا :"يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ" کیلئے۔ اور خداوند عالم کا یہ قول :"يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" فائدہ دے گا :"يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رَاكِعُوْنَ" کو۔ تو گویا یہ آیت اپنی پہلی آیت کے مطابق ہوگی اور اس کے معنی میں تاکید پیدا کرے گی اور یہی بات زیادہ بہتر بھی ہے۔ ان تمام وجوہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس آیت میں مذکور ولایت "نصرت" کے معنی میں ہوگی تصرف کے معنی میں نہیں ہوگی"

فخر رازی پھر کہتے ہیں کہ :"رہ گئی وہ وجہ کہ جس پر شیعوں کی دلیل کا زیادہ دارومدار ہے کہ آیت میں مذکور ولایت "عمومی" نہیں جبکہ "ولایت بمعنی نصرت" کا معنی عمومی ہے۔" اس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے :

اولاً: یہ کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ آیت میں مذکور ولایت کا معنی غیر عمومی یعنی خصوصی ہے اور نہ ہی "اِنَّمَا" کو "حصر" کیلئے مانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی دلیل قرآن مجید میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :"اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ" (المؤمنون / ۱۸) دنیوی زندگی کی مثال ایسے ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کیلئے اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے :"اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ" (محمد / ۳۶) دنیوی زندگی تو بس کھیل اور تماشا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لہو و لعب دوسری چیزوں میں بھی ہوتا ہے۔

دوم: یہ جو شیعہ کہتے ہیں کہ ولایت بمعنی "نصرت" کا معنی عمومی ہے اور تمام مومنین کیلئے، اسے ہم تسلیم نہیں کرتے وہ یوں کہ، اللہ تعالیٰ نے مومنین کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے : ا۔ وہ کہ جن پر اللہ نے ولی مقرر فرمایا ہے۔ اور وہ "اِنَّمَاوَلِيُّكُمُ....." میں مخاطب مومنین ہیں ۲۔ وہ خود اولیاء ہیں یعنی وہی مومنین جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ لہذا جب ہم اس آیت میں ولایت کی تفسیر "نصرت" سے کریں گے تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ ان دو قسموں میں سے ایک کو دوسرے کا ناصر اور مددگار بنایا ہے۔ تو ان میں سے دوسری قسم کی نصرت یعنی مدد کرنے والوں کی نصرت، تمام مومنین کو شامل نہیں ہوگی، اگر ایسا ہو تو پھر یہ بات لازم آئے گی، جو قسم منصور ہے وہ ناصر بھی ہو۔ تو گویا وہی ناصر اور وہی منصور، تو یہ محال ہوگا۔ لہذا ثابت ہوا کہ امت کی ایک قسم کے لوگوں کی نصرت تمام لوگوں کیلئے ہے، لہذا اس سے یہ لازم آئے گا کہ اس آیت میں مذکور ولایت خصوصی طور پر نصرت کے معنی کیلئے نہیں ہے۔ اور یہ جواب اس قدر خوبصورت اور باریک ہے کہ جس میں غور و فکر ضروری ہے"۔

اب جگر تھام کے بیٹھو....

ولی بمعنی اولیٰ بالتصرف

امام المشککین فخر الدین رازی کے گمراہ کن اشکالات کا مصنف علاّم تُرکی بہ تُرکی جواب دیتے ہیں اور وہ یہ کہ :

ا۔ اگر آیہ "اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ......" سے پہلے اور بعد کی آیات میں "ولی" بمعنی "ناصر" کے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ

اس آیت میں بھی وہی معنی مراد ہوں اور انہوں نے جو یہ موقف اختیار کیا ہے کہ "دوہم معانی آیات کے درمیان اسی نوع کی آیت کے دوسرے معنی مراد لئے جائیں تو اس سے لازم آئے گا کہ دو ایک جیسے اور ایک ہی مقصد کیلئے بیان ہونے والے کلاموں کے درمیان ایک اجنبی کلام کو داخل کر دیا گیا ہے جو کلام کی پستی اور گراوٹ کا موجب ہوتا ہے جس سے خدا کی ذات مبرا اور منزہ ہے"۔

ان کا یہ مفروضہ سرے سے ہی غلط ہے اس لئے کہ :

الف: "ولایت" بمعنی "نصرت"، "ولایت مطلقہ" کا ایک حصہ ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے کفار کو "اولیاء" یعنی دوست اور مددگار بنانے سے روکا ہے تو اس طرح سے خدا، رسولؐ اور آیت ولایت میں توصیف شدہ مؤمنین کی ولایت مطلقہ ثابت ہو جاتی ہے، وہ یوں کہ "ولایت مطلقہ" یعنی مؤمنین کے امور میں تصرف کامل، ان کی نصرت میں تصرف کو بھی شامل ہوگی، تو اسی بنا پر آیت مجیدہ میں اس بات کی دلالت پائی جاتی ہے کہ "اللہ، اس کے رسولؐ اور مؤمنین۔ جن کی اسی آیت میں توصیف کی گئی ہے۔ وہ دیگر مؤمنین کے بطور کامل ناصر اور مددگار ہیں" جب یہ معنی مراد ہوں گے تو دو کلاموں کے درمیان اجنبی کلام کے آنے کا خدشہ ختم ہی نہیں ہو جائے گا بلکہ دونوں کلاموں میں ایک حسین سا امتزاج پیدا ہو جائے گا اور کلام میں گراوٹ اور پستی نہیں بلکہ عظمت و سربلندی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر فخر رازی کے مفروضہ کو دیکھا جائے تو اس کی روشنی میں ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں شرط اور جزا کے درمیان اجنبیت نہیں ہے؟ کیونکہ شرط کچھ کہہ رہی ہے اور جزا کچھ اور۔ ملاحظہ فرمائیے: "وَ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ لا تُقسِطُوا فِي الْيَتٰمیٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ" (نساء / ۳) اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ (نکاح کرکے) تم یتیم لڑکیوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے اپنی مرضی کے موافق دو دو، تین تین اور چار چار نکاح کرو۔ اگر بالفرض اور بقول رازی، کلام میں پستی اور گراوٹ پیدا ہو بھی رہی ہے تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ آپ کے بقول آپ کے "جامع القرآن" کے علاوہ اس کا اور کون ذمہ دار ہے کہ جس نے ان تینوں آیات کو یکجا کر دیا ہے؟ جبکہ ہر ایک آیت، تدریجی طور پر اور مختلف مناسبت سے نازل ہوتی رہی، لیکن "جامع القرآن" نے انہیں اس ترتیب سے جمع کیا اور کلمات کو اپنے مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ جڑ دیا اور آیات کو ان کی نزولی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں کیا۔

آیات کی باہمی موافقت اور ان کا ایک خطوط پر استوار ہونا اگرچہ اس بات کا متقاضی ہے کہ یہاں پر "ولی" کے معنی "ناصر" کے لئے جائیں، اور اس کا ظہور بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے لیکن جب کلمہ حصر اور جملہ وصفیہ ہو جن کا ایک اور معنی میں ظہور ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس کے متعلق بحث ہو چکی ہے اور بعد میں بھی ہوگی۔ جس کی وجہ سے اس کا حمل "ناصر" کے معنی کیلئے مانع ہے، تو ضروری ہے کہ اس سے دستبرداری اختیار کر لی جائے۔ دوسرے لفظوں میں آیات کی باہمی موافقت اور ایک ہی خطوط پر استوار ہونا اگرچہ اس بات کا موجب ہو رہا ہے کہ ولی کو ناصر کے معنی میں لیا جائے لیکن حصر کا ظہور اور دوسرے معنی سے موصوف ہونا اس سے مانع بن رہے ہیں اور دوسرا موقف پہلے سے زیادہ زوردار ہے لہٰذا اسے اختیار کرنا واجب ہو جائے گا۔

ب: موصوف نے جو یہ کہا ہے کہ "اگر آیت میں مذکور ولی سے مراد امام یا اولی بالتصرف لیتے ہیں تو نزول آیت کے وقت کوئی بھی مؤمن ایسا نہیں ملتا جو ان صفات سے متصف ہو سکے حتی کہ حضرت علیؑ بھی، کیونکہ پیغمبرؐ کی موجودگی میں کسی کو حق تصرف و

امامت حاصل نہیں تھا" تو یہ اس صورت میں ہے کہ جب کسی مشتق لفظ کو حال میں حقیقت سمجھا جائے اور باقی زمانوں میں مجاز، جیسا کہ مشہور بھی ہے، لیکن جن کے نزدیک اس کا استعمال مطلقاً حقیقت کیلئے ہوتا ہے خواہ ماضی، حال یا استقبال سے اس کا تعلق ہو تو وہ اس بات کو قبول نہیں کرتے اور اس کی مثال قرآن مجید سے دیتے ہیں کہ ارشاد ہوتا ہے: "السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا" (مائدہ / ۳۸) چور خواہ مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔ تو اس آیت سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ "چور کا ہاتھ کاٹنا واجب ہے خواہ وہ آیت کے نزول کے وقت چوری نہیں کر رہا تھا"۔

لیکن یہ قول چونکہ خود ہمارے نزدیک بھی ناپسندیدہ ہے جیسا کہ ہم نے "قوانین الاصول" کے حاشیہ پر اسی بات کی صراحت کر دی ہے اور اس آیت سے استدلال کی کمزوری واضح کر دی ہے لہذا بہتر ہے کہ اس سے ہٹ کر اسی منتخب اور مشہور موقف کے مطابق جواب دیا جائے اور وہ یہ کہ: ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ لفظ مشتق، حال میں استعمال کے وقت حقیقت ہوتا ہے، حال سے مراد مشغولیت کی حالت ہے۔ تو اس طرح سے ضروری ہو جائے گا کہ آیت کے نزول کے وقت ولی، ولایت کے اوصاف سے متصف ہو۔ اس لئے کہ آیت میں موجود تمام جملے خبریہ ہیں جو نطق کے وقت مشغولیت کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ اس بارے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر کسی وقت حقیقت کا استعمال مشکل ہو جائے تو اسے مجاز کیلئے حمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے، جیسا کہ رازی نے کہا ہے "آیت کے نزول کے وقت علیؑ ولی، تصرف کی صفت سے متصف نہیں تھے" تو ایسی صورت میں جب ہم اسے مجاز کیلئے محمول کریں گے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ اگر بوقت نزول آیہ متصف نہیں تھے تو کیا ہوا مستقبل میں تو ہوں گے ہی!

یہ جو فخر رازی نے فرمایا ہے کہ "اگر ہم ولایت کو نصرت کے معنی پر محمول کریں تو ولایت حال حاضر میں حاصل ہو جاتی ہے تو اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ولایت کا محبت کے معنی پر حمل کرنا، تصرف کے معنی پر حمل کرنے سے زیادہ بہتر اور موزوں ہے"۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کے نزول کے وقت نہ صرف موصوف مؤمنین ہی سے نصرت کا حصول نامعلوم ہے بلکہ حضرت رسول خداؐ سے بھی معلوم نہیں۔ یہاں پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہمیں آپ کی بات سے اتفاق ہے لیکن دونوں معانی میں فرق اچھی طرح واضح ہے اور وہ یہ کہ آیت کے نزول کے وقت مؤمنین کے تصرف کی کیفیت معلوم العدم ہے یعنی تصرف کا فقدان ہے جبکہ نصرت کے بارے میں ایسا نہیں ہے اور وہ موجود ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ مشتق کیلئے حقیقی اطلاق کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اس بات کا علم ہو کہ وہ اطلاق کے وقت مبدا کے ساتھ متصف ہے، صحت اطلاق کیلئے عدم علم کافی نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے ہوتا ہے جیسے کسی صفت سے متصف ہونے کا علم نہ ہو اور یہی چیز اطلاق کے مجاز ہونے کا موجب ہوتی ہے۔

بہر حال ہم نے اب تک جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ "ولی" بمعنی "ناصر" کا اطلاق لفظ کے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے کیلئے کافی نہیں ہے اور فخر رازی نے جو اعتراضات اس لفظ کے "اولی بالتصرف" کے معنی میں ہونے کیلئے کیے ہیں وہی بعینہ اس کے "ولی" بمعنی "ناصر" ہونے کیلئے بھی وارد ہوتے ہیں۔ اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی مراد لئے جائیں، یعنی یہ کہا جائے کہ "ولی" کے معنی ہیں جو ولایت کے اوصاف سے متصف ہو، خواہ کسی بھی زمانے میں ہو، ماضی، حال اور استقبال سب میں، جیسا کہ اللہ اور رسولؐ ہیں یا خصوصی طور پر مستقبل میں ہو جیسے اسی آیت

میں توصیف شدہ مؤمنین ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب ہم فریق مخالف کے مفروضوں کا جواب دیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آیت مجیدہ میں مذکور "ولی" کا معنی ہی اولیٰ بالتصرف ہے، جیسا کہ اس کے لغوی معانی میں سے ایک ہے۔ اس لحاظ سے اس پر اعتراض کی گنجائش بھی باقی نہیں رہ جاتی۔

ج: فخر الدین کا یہ کہنا کہ "آیت میں قابل ستائش مؤمنین کا سات صورتوں میں جمع کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد ایک فرد نہیں بلکہ مؤمنین کی ایک جماعت ہے لہٰذا اس سے حضرت علیؑ مراد نہیں ہیں"۔ اس کا دو طرح سے جواب دیا جائے گا ایک "نقضی" اور دوسرا "حلی":

چنانچہ "نقضی" جواب تو یہ ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت "وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ" (نور / ۲۲) اور تم میں سے جو لوگ زیادہ دولت اور مقدور والے ہیں۔ میں "اُولُوا الْفَضْلِ" جو کہ جمع کا صیغہ ہے جو بقول آپ کے اس سے مراد حضرت ابوبکر ہیں جو کہ مفرد ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفرد کیلئے جمع کا لفظ بول کر اس کی عظمت اور بلند مرتبے کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (حجر / ۹) یقیناً ہم ہی نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ یا فرماتا ہے کہ: "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" (کوثر / ۱) یقیناً ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا۔ تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خود خداوند ذوالجلال جس شخص کی جمع کے کئی صیغوں کے ساتھ توصیف بیان کر رہا ہو اس کی شان کس قدر بلند ہوگی؟

اس کا "حلی" جواب یہ ہے کہ استعمال کے لحاظ سے اگرچہ اصل، حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن جب فریقین کی روایات کی رو سے مجازی معنی کیلئے قطعی قرینے قائم ہو جائیں تو پھر لفظ کو مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا۔ اور پھر یہ کہ مفرد کو جمع کے لفظ کے ساتھ حسن تعبیر کا تو لطف ہی کچھ اور ہے کیونکہ اس سے مفرد کی عظمت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا لطیف نکتہ ہے جس کی لطافت کسی پر مخفی نہیں۔ غور کیجئے اس بارے میں مفسر زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں کیا فرماتے ہیں؟

صاحب کشاف کا قول

جار اللہ زمخشری تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس آیت میں مومنین کوئی توصیف جمع کے الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے تو پھر اس کا اطلاق علی علیہ السلام پر کیونکر ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: "یہ اس لئے ہے تاکہ لوگوں کو اس طرف رغبت دلائی جائے کہ وہ بھی علیؑ جیسا کام کریں تاکہ اس ثواب کے مستحق قرار پائیں"۔ اور ساتھ ہی یہ بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ: "مومنین کو ایسی ہی اوصاف کا حامل ہونا چاہئے یعنی انہیں نیکی، بھلائی اور فقراء و مساکین کی خبر گیری کرنی چاہئے اور خود کو اس حد تک اس امر کا پابند بنانا چاہئے کہ فقراء و مساکین کی امداد میں تاخیر ہرگز نہیں کرنی چاہئے خواہ نماز ہی کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔ اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد ان کی امداد کی جائے گی"۔

"مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ" کی تفسیر

د: فخر رازی نے آیت "مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ ....." کا مصداق بیان کر کے روتوں کو ہنسا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس کی ایسی

تفسیر بیان کی ہے جو "اتفاق امت" کے سراسر خلاف ہے۔ اس لئے کہ علماء شیعہ کا تو کلی طور پر اتفاق ہے کہ یہ آیت "مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ......" آل محمدؐ کی رجعت اور ان کی حکومت اور حق کی ایک طاقتور حکومت کی طرف اشارہ ہے۔ جسے قائم آل محمد عجل اللہ فرجہ برقرار فرمائیں گے۔ اور اس پر صرف بکثرت شیعی روایات ہی موجود نہیں بلکہ اہل سنت کی طرف سے بھی بہت بڑی حد تک روایات موجود ہیں جیسا کہ ان کی کتاب "غایۃ المرام" میں اس قسم کی روایات کو ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں مرتدین سے مراد "ناکثین، مارقین اور قاسطین" ہیں اور "يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهُ" سے مراد امیر المؤمنین علیؑ اور ان کے ساتھی ہیں۔ جیسا کہ بعض دوسری روایات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے۔

رہا اس بارے میں مکتب خلفاء کا نظریہ تو یہ بات اظہر من الشمس ہے اور سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کا دارومدار "بیعت" پر تھا، "نص" پر نہیں تھا۔ اور پھر یہ کہ اگر یہ آیت ان کی خلافت کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی تو وہ خود بھی ایسے بروز سقیفہ دلیل کے طور پر بیان فرماتے۔ چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا لہذا ماننا پڑے گا کہ ایسا نہیں ہے۔

اس سے بڑھ کر تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ انہوں نے دیدہ دلیری کی انتہا کر دی وہ یوں کہ کہتے ہیں: "يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهُ" سے مراد ابوبکر اور ان کے ہم نوا ہیں، جبکہ شیعہ کہتے ہیں کہ وہ "مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهِ" کے زمرے میں شامل ہیں۔ اور مرتدین سے آل محمدؐ کے حقوق کے غاصب مراد لیتے ہیں"۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ ان دونوں اقوال کے درمیان کس قدر فرق ہے؟ البتہ اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اسی آیت کے ضمن میں خطبہ ۱۶۱ کی آٹھویں فصل کی شرح میں بیان ہو گی جس میں اس ناصبی کے قول کی دھجیاں بکھیری جائیں گی۔

۹۔ فخر الدین رازی نے جو یہ کہا ہے کہ "اگر آیہ ولایت علیؑ کی امامت کی دلیل ہوتی تو اسے آپؑ کہیں نہ کہیں تو اپنے موقف کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے۔ آپؑ کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آیت ان کی امامت کے بارے میں نازل نہیں ہوئی" حقیقت یہ ہے کہ موصوف کی یہ باتیں حقائق کا منہ چڑا رہی ہیں۔ اور ان کی کذب بیانی کی واضح دلیل ہیں، کیونکہ آپؑ نے اپنی امامت اور خلافت کے ثبوت کے طور پر جہاں واقعہ غدیر اور واقعہ مباہلہ وغیرہ کو پیش کیا ہے وہاں پر اس آیت سے بھی اپنی امامت پر استناد کیا ہے۔ رازی صاحب فرماتے ہیں: "آپؑ نے اس آیت سے تمسک نہیں کیا" اگر اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ ان کے تمسک کے بارے میں ان کے ہاں کوئی روایت موجود نہیں۔ تو وہ یہ کہنے میں شاید کسی حد تک حق بجانب ہوں، کیونکہ حق کے اکثر مسائل کے بارے میں ان کے ہاں کوئی روایت نہیں ملتی لیکن اس کا مقصد یہ تو نہیں ہے کہ علی علیہ السلام نے اس سے تمسک ہی نہیں کیا۔ اور اگر اس سے ان کی مراد شیعی ذرائع اخبار و روایات سے ان تک کوئی ایسی روایت نہیں پہنچی جس سے معلوم ہو کہ غدیر اور مباہلہ وغیرہ جیسے واقعات کی طرح انہوں نے اس سے تمسک کیا ہو تو یہ بات ماننے والی نہیں ہے، کیونکہ انہوں دوسرے واقعات کی طرح اس آیت سے بھی اپنی خلافت و امامت کیلئے استناد کیا اور تمسک سے کام لیا ہے۔ نہ صرف شیعی روایات سے یہ بات ثابت ہے بلکہ مکتب خلفاء کے پیروکاروں نے بھی اسے بیان کیا ہے، مثلاً:

الف: کتاب غایۃ المرام میں مجالس شیخ سے نقل کیا گیا ہے کہ اس میں اسناد کے ساتھ حضرت ابوذر غفاریؓ سے بیان کیا

گیا ہے کہ حضرت امیرؑ شوریٰ کے دن عثمان، زبیر، عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن ابی وقاص کی موجودگی میں جہاں آپؑ نے اپنے متعلق پیغمبرؐ کی بیان کردہ نصوص کو بطور دلیل اور احتجاج پیش کیا اور سب نے آپؑ کی باتوں کی تائید کی تو وہاں پر یہ بھی فرمایا کہ: "آیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی ہو اور اس کے بارے یہ آیت نازل ہوئی ہو؟" اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا...... "۔ وہ میرے علاوہ اور کون ہے؟" تو ان سب نے کہا: "بالکل صحیح ہے!"۔

ب: اسی کتاب میں ہے کہ ابن بابویہ نے اسناد کے ساتھ ابو سعید وراق سے انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے انہوں نے آباؤ اجداد سے حضرت علی علیہ السلام کا وہ احتجاج ذکر کیا ہے جو آپؑ نے ابو بکر سے اس وقت کیا جب وہ منبر خلافت پر "جلوہ افروز" ہو چکے تھے۔ امیر المؤمنینؑ نے ان سے اپنے فضائل کو اور رسول خداؐ کی ان نصوص کو بیان فرمایا جو آنحضرتؐ نے آپؑ کیلئے قائم کی تھیں، چنانچہ آپؑ نے فرمایا: "تمہیں خدا کی قسم! بتاؤ کہ رسولؐ کی ولایت کے ساتھ خدا کی طرف سے عطا کردہ ولایت_ جو انگوٹھی کی زکوٰۃ کی آیت میں مذکور ہے_ میرے لئے ہے یا تمہارے لئے؟ تو انہوں_ ابو بکر_ نے کہا: "صرف آپؑ کیلئے!"۔

ہماری بیان کردہ ان معروضات سے رازی کی شیعی روایات سے لاعلمی ظاہر ہو جاتی ہے، ہاں ایسا ہونا بھی چاہئے! کیونکہ وہ تو ان سے بھی زیادہ باعظمت چیزوں سے جاہل اور بے خبر ہیں اور ظالموں سے ایسا بعید بھی نہیں ہے۔

ز۔ "امام رازی" نے اپنے مفروضے میں کہا ہے کہ "بالفرض یہ بھی مان لیتے ہیں کہ آیت حضرت علیؑ کی امامت پر دلالت کر رہی ہے، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بوقت نزول اس پر دلالت نہیں کر رہی تھی، کیونکہ رسول اللہؐ کی زندگی میں تو آپؑ امت کے امور میں تصرف کے مجاز نہیں تھے"۔ اس سلسلے میں ہم موصوف کے ان دلائل سے اتفاق نہیں کرتے، اس لئے کہ:

۱۔ بوقت نزول آیت آپؑ کیلئے ولایت ثابت ہے، کیونکہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ "ولی" سے مراد اولیٰ بالتصرف ہے اور آیت کے نزول کے وقت آپؑ اسی معنی کے حامل تھے۔

۲۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آیت ان کے مستقبل کیلئے مفید ہے، اس لئے کہ آپؑ پیغمبرؐ کے بعد ہی اولیٰ بالتصرف کے اختیارات کے حامل ہوں گے، تو اسے ہم اس بات پر حمل کریں گے کہ آپؑ ابو بکر، عمر، اور عثمان کے بعد ہی امامت کے مستحق ہوں گے" اس سے ہم اس لئے اتفاق نہیں کرتے کہ آیت جس طرح آنجنابؑ کی امامت کو ثابت کر رہی ہے اسی طرح ان کے غیر کی امامت کی نفی بھی کر رہی ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور آئندہ بھی چل کر بیان کریں گے۔ اسی بنا پر آپؑ کے پیش روؤں کا نہ صرف خلافت کا کوئی حق ہی نہیں بنتا کہ آپؑ ان لوگوں کے بعد خلیفہ قرار پائیں یا ان سے پہلے والے خلیفہ کہلائیں۔

ژ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ "نصرت" کے ذریعے تصرف، ولایت مطلقہ کے اختیارات میں شامل ہے۔ اور اسی صورت میں مؤمنین کو دلی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے، جس طرح انہیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ ان مؤمنین کے ناصر و مددگار ہیں تو وہ خوش اور مطمئن ہو جاتے ہیں اسی طرح جب انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ تمام حالات و

ناصر و مددگار ہیں تو وہ خوش اور مطمئن ہو جاتے ہیں اسی طرح جب انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ تمام حالات و اطوار میں تمہارے نفسوں، روحوں اور جسموں میں حق تصرف رکھتے ہیں اور اولی بالتصرف ہیں خواہ نصرت کے ذریعہ ہوں یا بغیر نصرت کے، تو انہیں اس سے بھی زیادہ خوشی اور بے حد اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بات سمجھدار اور بامعرفت انسان کیلئے مخفی نہیں ہے۔

۴۔ اس موقع پر بیان کی جانے والی دو آیات، "یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ......" اور "اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ......" کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی انہیں باہم مربوط کرنے کے تکلف کی ضرورت ہے، کیونکہ ہر ایک آیت کا اپنا ایک مقصود اور مدعا ہے جو دوسری آیت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ انہیں آپس میں ربط دے کر رازی نے اپنی کم عقلی کا ثبوت دیا ہے۔

یہ تو تھا جناب فخر الدین رازی کے ہشتگانہ دلائل کا مفصل جواب، اب رہا ان دو وجوہات کا جواب جن کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ: "وہ وجہ جن پر شیعوں کی دلیل کا زیادہ دارومدار ہے کہ آیت میں مذکور "ولایت عمومی" نہیں۔ جبکہ ولایت بمعنی نصرت کا معنی عمومی ہے۔ اس کا دو طرح سے جواب دیا جاتا ہے: ایک یہ "اِنَّمَا" حصر کیلئے نہیں مانتے اور دوسرے ولایت بمعنی نصرت کے معنی کو عمومی تسلیم نہیں کرتے"۔

تو اس کا جواب بھی دو ہی طرح سے دیں گے:

کلمہ اِنَّمَا حصر کیلئے ہے

لیکن: فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "آیت میں مذکور "اِنَّمَا" حصر کیلئے ہے" اور اس دعویٰ کے ثبوت کیلئے دو آیات پیش کی ہیں اور اس طرح سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان دو آیات میں حصر کا فائدہ نہیں دے رہا، لہٰذا آیت ولایت میں بھی حصر کیلئے مفید نہیں ہے۔ اگر تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ لفظ "اِنَّمَا" صرف آیت ولایت میں حصر کا فائدہ نہیں دے رہا تو پھر دلیل کے طور پر انہیں مذکورہ دو آیات ۔ ۱۔ "اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ" ۔ ۲۔ "اِنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ" ۔ کو یہاں لانا مناسب نہیں تھا، کیونکہ ۔ ان کے اپنے زعم کے مطابق ۔ اِنَّمَا ان آیات میں حصر کا فائدہ نہیں دے رہا، لہٰذا آیت ولایت میں بھی حصر کا فائدہ نہیں دے رہا یہ غلط ہے۔ (کیونکہ یہ قیاس ہے اور وہ بھی التاسید ھا)۔

لیکن اگر ان کی مراد "اِنَّمَا" کے مطلقاً حصر کیلئے عدم فائدہ کی ہے ۔ جیسا کہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے ۔ تو (مذکورہ مثالیں تو پیش کر سکتے ہیں لیکن) اس سے وہ اپنے قول کی خود نفی کر رہے ہیں، کیونکہ انہوں نے آیہ "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" (کہف / ۱۱۰) اے پیغمبرؐ! کہہ دیجئے کہ میں بھی تمہارے جیسا ہی ایک آدمی ہوں، میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود یکتا معبود ہے۔ کی تفسیر میں انہوں نے اسے "حصر" کے معنی میں لیا ہے اور ساتھ ہی ہم مندرجہ ذیل دلائل کے پیش نظر اسے حصر کے معنی میں لیتے ہیں۔

ا۔ "پہلی دلیل تو یہ ہے کہ اس کلمہ سے جو تبادر ہوتا ہے وہ یہ کہ "حصر" کیلئے ہے، لہذا اس معنی میں حقیقت ہو گا، کیونکہ تبادر حقیقت کی علامت ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ علمائے اصول، لغت اور نحو کے نزدیک بھی یہی معنی مشہور ہے اور اسی موقف کو علمائے عامہ میں سے جوہری "صاحب قاموس" نے اختیار کیا ہے اور بیضاوی نے "المنہاج" میں، سکاکی نے "المصباح" میں اور قزوینی نے "الایضاح" میں اسی کو اپنایا ہے۔ جبکہ ہمارے علماء رضوان اللہ علیہم میں سے شیخ صدوقؒ، محقق طوسیؒ، علامہ مجلسیؒ، مفسر طبرسیؒ، طریحیؒ، عمیدیؒ اور نجم الملۃ علامہ رضیؒ وغیرہ اسی موقف پر کاربند ہیں۔ بلکہ بعض اوقات اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس معنی پر علمائے فریقین کا اتفاق ہے۔ اس بارے میں علامہ "التھذیب" میں فرماتے ہیں: "اِنّما" حصر کیلئے ہے اور اہل لغت سے یہی چیز منقول ہے"۔ کتاب "النہایہ" میں ابو علی فارسی کہتے ہیں "تمام علمائے نحو کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ کلمہ حصر کیلئے ہے"۔ فارسی نے ان کے قول کی تصدیق کی ہے اور ان کا قول اور نقل حجت ہے۔ طریحی مجمع البحرین میں فرماتے ہیں: "اِنّما جو کہ کتاب و سنت اور کلام بلغاء میں تکرار کے ساتھ آیا ہے محققین کی نقل کے مطابق اور اہل لغت کے نزدیک یہ "حصر" کیلئے وضع کیا گیا ہے اور ہمیں ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو اس کی مخالفت کرتا ہو۔ علاوہ ازیں کلام عرب، کلام شعراء اور کلام فصحاء میں اسے اسی معنی میں لیا جاتا ہے"۔ علامہ ازہری اپنی کتاب "الزّھرُ عنْ اھلِ اللُّغۃِ" میں فرماتے ہیں: "یاد رہے کہ "اِنّما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کیلئے ایک شئے کا ایجاب اور دوسری شئے کی نفی ہو"۔ کتاب "التلخیص" میں "المفتاح" کی پیروی کرتے ہوئے، جب اس کیلئے استدلال کیا گیا تو بتایا گیا کہ یہ کلمہ "حصر" کا فائدہ دیتا ہے جس میں دو لفظ پوشیدہ ہوتے ہیں یعنی ایک "مَا" اور ایک "اِلاّ" مثلاً مفسرین، قرآن مجید کی اس آیت "اِنّما حَرّمَ علَیکُمُ المَیتَۃَ ......" (نحل / ۱۱۵) تم پر اس نے حرام کر دیا ہے مردار...... کے بارے میں فرماتے ہیں کہ گویا اس کے معنی یوں ہیں "مَا حرّمَ اللہُ علَیکُمْ اِلاّ المَیتَۃَ......" خدا نے تم پر مردار کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں کی اور یہ اسی وقت ہے جب رافع کی قرائت کے مطابق "حرّمَ" کو فعل ماضی معلوم پڑھا جائے۔ علمائے نحو اس بارے میں فرماتے ہیں: "اِنّما" ان چیزوں کیلئے ہے جو اس کے بعد مذکور ہوتی ہیں اور ان کے ماسوا کی نفی ہوتی ہے"۔

مذکورہ بالا تصریحات کے بعد تو اس بات کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ کہا جائے "اِنّما" حصر کا فائدہ نہیں دیتا" کیونکہ اس قسم کے مواقع کیلئے تو صرف ایک ہی لغوی کی بات معتبر اور قابل قبول ہوتی ہے، چہ جائیکہ جب نوبت "شہرت تامۃ" تک پہنچ چکی ہو۔ نہ صرف یہی بلکہ اس کے ساتھ وہ دلائل بھی ہیں جو اصول، بیان اور نحو وغیرہ جیسے علوم میں ذکر کی جا چکی ہیں۔

رہی بات ان دو آیات کی کہ جن کے ذریعے رازی نے استدلال کیا ہے کہ "اِنّما" حصر کیلئے نہیں ہے تو ان کی یہ بات چند وجوہات کی بناپر ناقابل قبول ہے:

اول: یہ کہ یہ بات ماننے کے لائق نہیں کہ یہاں پر "اِنّما" حصر کیلئے نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ قریبی تاویل کی جائے گی کہ یہاں پر انّما کا کلمہ "ما" اور "الاّ" کے معانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات اس کی یوں وضاحت کرتی ہیں کہ: "وَ مَا الحیوٰۃُ الدُّنیا اِلاّ لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَ لَلدّارُ الآخرۃُ......" (انعام / ۳۲) دنیوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہی ہے اور آخرت کا گھر ہی

.......کیونکہ اس میں اختلاف نہیں ہے کہ اس میں حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

دوم : یہ کہ اگر ہم رازی کی بات کو تسلیم بھی کرلیں تاہم اس سے ان کا ان دونوں آیات سے مدعا پھر بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ صرف انہی دونوں آیات کے ساتھ خاص ہے اس کا آیت ولایت سے کوئی تعلق نہیں۔

سوم : یہ کہ جو کلمہ عمومی طور پر حقیقت اور مجاز دونوں کیلئے استعمال ہو وہ لفظ مشترک سے بہتر ہوتا ہے۔

ہماری ان تمام معروضات سے یہ نتیجہ نکلا کہ "اِنَّما" حصر کے معنی کیلئے حقیقت ہے اور دوسرے معانی کیلئے مجاز ہے۔

دو : رازی نے ولایت بمعنی "نصرت" کے ثبوت کو مزید پختہ کرنے کیلئے مؤمنین کو دو قسموں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک قسم نصرت کرنے والے اور دوسری قسم نصرت پانے والے مؤمنین کی قرار دی ہے، لیکن پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ "اِنَّما" جو کہ حصر کا فائدہ دے رہا ہے اور خدا، رسولؐ اور موصوف مؤمنین کی ولایت کے اثبات کا متقاضی ہے اور ان موصوفین کے ماسوا کی نفی کر رہا ہے۔ تو اس لحاظ سے آیت کلمہ حصر کی وجہ سے اس بات کی متقاضی ہے کہ "ولایت" صرف ان تین ہستیوں کے ساتھ خاص ہے اور یہ مقصد اس وقت پورا ہوگا جب آیت میں ولی سے مراد اولیٰ بالتصرف لیا جائے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف اس سے مراد ناصر و مددگار لیا جائے تو پھر واضح سی بات ہے کہ نصرت صرف انہی سے مخصوص نہیں رہے گی بلکہ اس میں عمومیت پیدا ہو جائے گی جو ناصر اور منصور دونوں کو شامل ہوگی، بلکہ صرف وہی مؤمنین ہی نصرت کرنے والے نہیں ہوں گے جن کی توصیف آیت میں کی گئی ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی تو ناصر ہو سکتے ہیں۔ تو پھر ایسی صورت میں حصر کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اسی لئے تو ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر ولایت کو نصرت کے معنی میں لیا جائے تو پھر یہ معنی اس قدر عام ہو جائے گا کہ اس سے صرف حالت رکوع میں زکواۃ دینے والے مؤمنین ہی مخصوص نہیں ہوں گے جبکہ اس کا معنی عمومی نہیں ہے جو تمام مؤمنین کو شامل ہو، اور اس پر اعتراض کی کوئی صورت پیدا ہو اور مؤمنین کو دو قسموں میں تقسیم کرنا پڑے جیسا کہ اس ناصبی نے کیا ہے۔

اس مقام پر اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کی بات اس وقت صحیح ہو سکتی ہے جب "وَ هُمْ رَاكِعُوْنَ" میں واؤ کو حالیہ قرار دیا جائے۔ لیکن اگر اسے واؤ عاطفہ قرار دیا جائے تو پھر تقسیم بندی ضروری ہو جائے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں واؤ کو عاطفہ قرار دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ "وَ هُمْ رَاكِعُوْنَ" سے پہلے نماز کی بات ہو چکی ہے کہ "وہ نماز قائم کرتے ہیں" اور اگر اس میں "رکوع" کو دوبارہ ذکر کیا جائے تو تکرار لازم آئے گی جو کلام کے نظام بلاغت کے خلاف ہے، لہذا اسے "حالیہ" قرار دینا واجب ہے، جس کے معنی ہوں گے کہ "وہ حالت رکوع میں زکوۃ ادا کرتے ہیں"۔

جب تمام صورت حال واضح ہو چکی تو نتیجہ کے طور پر یہ عرض کرتے جائیں کہ : "اس بات پر اجماع ہے رکوع کی حالت میں صرف علی بن ابی طالبؑ ہی نے زکوۃ ادا کی ہے اور بس! اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ "آیہ شریفہ ولایت" علی بن ابی طالبؑ کی خلافت بلا فصل کے قوی ترین دلائل میں سے ایک دلیل ہے، اور فخر رازی یا اس کے ہم نواؤں کے اعتراضات کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے اور وہ ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے متعلق خداوند ذوالجلال فرماتا ہے : "اَلاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا" (کہف / ۱۰۴،۱۰۳) جو اپنے

اعمال میں بد ترین خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش زندگانی دنیا میں بھٹک گئی ہے اور وہ خود یہ خیال کرتے ہیں کہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں آخر میں دشمنوں کے منہ میں خاک ڈالتے ہوئے مولا کی خدمت میں عرض گزار ہوں کہ :

یَامَنْ بِخَاتَمِهِ تَصَدَّقَ رَاكِعًا اِنِّيْ اِدَّخَرْتُكَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا

اَللّٰهُ عَرَّفَنِيْ وَ بَصَّرَنِيْ بِهٖ فَمَضَيْتُ فِيْ دِيْنِيْ بَصِيْرًا سَامِعًا

اے وہ ذات کہ جس نے رکوع کی حالت میں انگشتری خیرات میں دی ہے، میں آپ کو قیامت کے دن کیلئے اپنا شفیع سمجھتا ہوں خدا نے مجھے اس بات کی معرفت اور بصیرت عطا فرمائی ہے لہذا میں اپنے دین میں سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر چل رہا ہوں۔

۲۔ آیہ اطاعت

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی امامت اور خلافت بلا فصل پر دوسری آیت جو کہ بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہے وہ آیہ اطاعت ہے یعنی : "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (نساء / ۵۹) اے ایماندارو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی۔

اس آیت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ : "خداوند سبحانہ نے اس آیت میں اولی الامر کی اطاعت کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح رسول پاک کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور یہ حکم عمومی اطاعت پر مشتمل ہے یعنی غیر مشروط اطاعت کا حامل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کو کسی خاص شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا، چونکہ حکم غیر مشروط ہے لہذا کلی طور پر اطاعت لازم ہوگی، جب اطاعت کلی اور غیر مشروط ہوگی تو اولی الامر کیلئے معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہوگا۔ کیونکہ اگر معصوم نہ ہوں تو پھر ان سے خطاؤں، غلطیوں اور گناہوں کے ارتکاب کا امکان ہوگا۔ تو پھر ایسی صورت میں لازم آئے گا کہ خدا نے ہمیں خطا کار لوگوں کی اتباع اور اطاعت کا حکم دیا ہے، جس سے ایک اور برائی لازم آئے گی وہ یہ کہ خدا نے ایک قبیح کے ارتکاب کا حکم دیا ہے، اور یہ خدا کی ذات کیلئے محال ہے۔ لہذا ثابت ہوگیا کہ اولی الامر کی اطاعت اور اتباع کیلئے خدا کا حکم اس وجہ ہے کہ وہ معصوم عن الخطا ہیں، جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ آیت، معصوم کی اطاعت پر دلالت کر رہی ہے اور اس کا حکم بھی غیر مشروط ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ "صاحبان امر" سے مراد صرف اور صرف ائمہ اہل بیتؑ ہیں، کیونکہ بعد از پیغمبرؐ دنیا میں ان کے سوا اور کوئی شخص نہیں ہے جو مقام عصمت کا مستحق ہو"۔

اس جچی تلی اور مدلل گفتگو کے بعد مکتب خلفاء کا یہ موقف کمزور ہو جاتا ہے جس سے وہ "اولی الامر" سے مراد حضرات ثلاثہ کو لیتے ہیں۔ البتہ یہ ان میں سے ایک گروہ کا موقف ہے جبکہ ایک دوسرا گروہ اس سے مراد "سرداران لشکر" کو لیتا ہے اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد علماء کرام ہیں۔ اور یہ تمام گروہ اپنے موقف کیلئے یہ بھی کہتے ہیں کہ اولی الامر کیلئے عصمت شرط نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُمراء کی غیر مشروط اطاعت واجب ہے جس طرح کہ علماء کی بھی غیر مشروط اطاعت واجب ہے۔ اس بات پر تو سب کو اتفاق بھی ہے۔ البتہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُمراء کی اطاعت ان امور میں کی جائے گی جن کا تعلق امور مملکت سے ہے، جبکہ علماء کی اطاعت صرف احکام شرعیہ میں کی جائے گی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اُمراء، علماء کی مانند ہیں بعض اوقات ان کی رائے میں اختلاف بھی

ہو جاتا ہے، تو ایسی صورت میں بعض کی اطاعت دوسرے بعض کی نافرمانی کا موجب بن جاتی ہے، کیونکہ مؤمن جب ایک کی اطاعت کرے گا تو لامحالہ دوسرے کی نافرمانی ہی ہو گی۔

امام رازی کیا کہتے ہیں؟

فخر المشککین امام رازی کا موقف یہ ہے کہ "اولی الامر" سے مراد "اہل حل و عقد" ہیں اور آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ "اجماع امت" حجت ہے اور وہ "اولی الامر" کیلئے عصمت کو بھی واجب سمجھتے ہیں اور اس کے ثبوت کیلئے وہی دلیل پیش کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: "اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ آیت میں مذکور اولی الامر کیلئے قطعی طور پر معصوم ہونا ضروری ہے، البتہ ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ معصوم یا تو تمام امت مسلمہ ہے یا اس کے کچھ افراد! کچھ افراد اس لئے مراد نہیں ہو سکتے کہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی رو سے اولی الامر کی غیر مشروط اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی غیر مشروط اطاعت اس بات سے مشروط ہے کہ ہم انہیں پہچانتے ہوں، ان تک پہنچ سکتے ہوں اور ان سے براہ راست استفادہ کر سکتے ہوں۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ ہم دور حاضر میں الف۔ امام معصوم کی معرفت سے عاجز ہیں ب۔ ان تک پہنچنے سے عاجز ہیں ج۔ ان سے دینی اور علمی استفادہ کرنے سے عاجز ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو پھر ہم یہی سمجھیں گے کہ جن معصوم لوگوں کی اطاعت کا اللہ نے حکم دیا ہے وہ اس امت کے کچھ افراد نہیں ہیں اور نہ ہی اس امت کا کوئی خاص ٹولہ ہے۔ تو جب یہ بات ہی غلط ہوئی تو پھر یہ ماننا واجب ہو جائے گا کہ اولی الامر سے معصوم افراد اس امت کے "اہل حل و عقد" لوگ ہی ہوں گے اور یہ چیز قطعی طور پر ثابت ہے کہ "اجماع امت حجت ہے"۔

موصوف نے اس موضوع پر قدرے لے دے کرنے کے بعد اپنے کلام کا رخ شیعوں کی طرف موڑا اور فرمانے لگے:

امام رازی کے دلائل

"رافضی اس آیت کو جن چیزوں پر حمل کرتے ہیں وہ کئی وجوہات کی بنا پر عقل سے بہت دور ہے:

۱۔ ان کی پہلی دلیل تو وہی ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی اولی الامر کی اطاعت ان کی معرفت اور ان تک رسائی سے مشروط ہے، اگر تو اللہ نے ہم پر ان کی معرفت سے پہلے ان کی اطاعت فرض کی ہے تو یہ تکلیف مالا یطاق ہو گی، اور اگر اس شرط کے ساتھ واجب کی ہے کہ جب ہم ان سے واقف ہو جائیں گے، ان تک پہنچنے کے راستوں کو پہچان لیں گے تو ان کی اطاعت کریں، پھر تو یہ واجب مشروط ہوا، حالانکہ ان کی اطاعت غیر مشروط طور پر واجب ہے۔

اسی طرح آیت میں ایک ایسی صورت ہے جس سے یہ احتمال دور ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ نے رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کو ایک ہی لفظ "اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الاَمْرِ مِنكُمْ" کے ذریعہ ملا دیا ہے جو کہ غیر مشروط اطاعت پر مبنی ہے۔ اور ایک لفظ ایک ہی وقت مطلق اور مشروط نہیں ہو سکتا۔ یعنی رسول کی اطاعت کیلئے غیر مشروط اور اولی الامر کی اطاعت کیلئے مشروط ہو یہ نہیں ہو سکتا بلکہ دونوں کیلئے غیر مشروط ہو گا، لہذا اولی الامر کی اطاعت بھی غیر مشروط ہو گی"۔

۲۔ اللہ نے اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے جو جمع ہیں جبکہ شیعوں کے نزدیک ایک زمانے میں صرف ایک ہی امام ہو سکتا ہے۔ لہذا جمع کا مفرد پر اطلاق ظاہر کے خلاف ہے۔

۳۔ خداوند عالم اس سے آگے فرماتا ہے کہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ" (نساء/۵۹)

پس اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پلٹادو۔ تو اگر "اولی الامر" سے مراد امام معصوم ہو تو پھر واجب ہو جائے گا کہ یہ کہا جائے "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى الاِمَامِ" اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اسے امام کی طرف پلٹاؤ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت کی تفسیر کیلئے حق وہی ہے جو ہم بیان کر چکے۔

آپ نے امام رازی کے کمزور اور فاسد دلائل کو ملاحظہ فرمایا۔ اب ان دلائل کا جواب سنئے :

اب ان دلائل کا جواب

۱۔ موصوف نے دلیل میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت "اجماع کی حجیت"۔ یعنی اجماع امت حجت ہے۔ پر دلالت کر رہی ہے۔

اگر تو اس اجماع سے ان کی مراد تمام امت کا اجماع ہے۔ جیسا کہ ان کے اول اور درمیانی کلام سے ظاہر ہے۔ یعنی ان کا کہنا ہے کہ "آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اجماع امت، حجت ہے"۔ اسی طرح فرماتے ہیں "یہ بات قطع و یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اجماع امت حجت ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امت سے ان کی کیا مراد ہے ؟ آیا یہ کہ خاص طور پر اہل حل و عقد یعنی مجتہدین کا اجماع مراد ہے ؟ اور زیادہ ظاہر بات بھی یہی ہے، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ "واجب ہو گا کہ وہ معصوم اہل حل و عقد ہوں"۔ یا پھر امت کے اجماع سے مراد جمیع مسلم امہ کا اجماع ہے ؟ تو پھر ایسی صورت میں اس قسم کا اجماع قیامت تک ناممکن ہے۔ تو پھر آیت کو ایک ناممکن امر پر کیونکر محمول کیا جا سکتا ہے ؟ کیونکہ "امت محمدیہؐ" تو قیامت تک آنے والے تمام مسلم افراد ہیں اور جو لوگ اپنے زمانے میں موجود ہیں وہ "امت" نہیں بلکہ "امت کا ایک حصہ" ہیں۔

اگر ان کی مراد اہل حل و عقد ہیں، تو پھر ان اہل حل و عقد حضرات کی عصمت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور "معصوم" کو ان کی تعبیر کے مطابق ان اہل حل و عقد پر حمل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جمیع امت مسلمہ بھی "معصوم" نہیں کہلا سکتی، اگرچہ مکتب خلفاء کے پیروکاروں نے مختلف ذرائع سے اسے معصوم ثابت کرنے کیلئے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ سرکار رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے کہ : "میری امت غلطیوں پر کبھی اجماع نہیں کر سکتی" یا آنجنابؐ نے فرمایا ہے : "میری امت گمراہی پر اکٹھا نہیں ہو سکتی" یا فرمایا : "میں نے رب سے دعا مانگی کہ میری امت گمراہی پر اجماع نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا منظور فرمائی۔" اس کے علاوہ بھی اس قسم کی بہت سی روایات ہیں جن کے ذریعہ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "اجماع امت حجت ہے" لیکن اس طرح کے دلائل پھر بھی ان کے مدعا کو ثابت نہیں کر سکتے اس لئے کہ یا تو ایسی روایات کی سند ضعیف ہوتی ہے یا دلالت کمزور ہوتی ہے اور اس ضعیف اور کمزوری کی متعدد وجوہات ہیں جنہیں ہمارے علماء نے اصول کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

۲۔ آیت میں "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ......" کے ساتھ جن مؤمنین کو اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس کے مخاطب تین طرح کے لوگ ہوں گے : الف۔ صرف ارباب حل و عقد یا بالفاظ دیگر مجتہدین ب۔ مقلدین اور ج۔ ہر دو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے پہلے دو قسم کے افراد مراد نہیں لئے جا سکتے، کیونکہ مجتہدین بھی خاص قسم کے لوگ ہیں اور مقلدین بھی۔ اور یہ اصل کے اس لئے خلاف ہے کہ خطاب عمومی ہے اور مخاطبین مخصوص لوگ ہیں، ساتھ ہی یہ بات بھی لازم آئے گی کہ خدا اور رسول کی اطاعت مذکورہ

دو طرح کے لوگوں میں سے صرف ایک قسم کے لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ اگر اس سے مراد صرف مقلدین ہوں تو پھر اس سے لازم آئے گا کہ عوام کا اجماع حجت ہے۔ کیونکہ جو لوگ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ" میں مخاطب ہیں وہی تو ہیں جنہیں "یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ" میں مخاطب کیا گیا ہے۔ تو اس کا مقصد یہ ہوا کہ بوقت ضرورت اللہ اور رسول کی طرف پلٹانا واجب نہیں ہے تو اس طرح سے عوام کا اجماع حجت ہوگا، حالانکہ ہمارا مخالف فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔

اب رہی تیسری صورت یعنی اس سے مراد تمام مومنین ہیں خواہ وہ مجتہدین ہوں یا مقلد! تو پھر اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ "اولوالامر، مجتہدین کے علاوہ کوئی اور لوگ ہیں۔ اگر ہم اس طرح تسلیم نہیں کریں گے تو لازم آئے گا کہ وہی مطیع ہیں اور وہی مطاع ہیں۔ یعنی انہی لوگوں کو اطاعت کرنے کا حکم ہے اور انہی لوگوں کی اطاعت واجب ہے۔ جبکہ آیت کے الفاظ اس کے برعکس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ: "اولی الامر سے مراد ائمہ معصومین علیہم السلام ہیں" اور رازی کا یہ وہم باطل ہو جائے گا جو وہ کہتے ہیں کہ: "اولی الامر سے مراد اہل حل و عقد ہیں" اور یہ وہ تحقیق نفیس ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ موصوف آیت میں مذکور اولی الامر سے مراد ائمہ علیہم السلام کو مراد لینا بعید قرار دیتے ہیں لیکن ہم اس کا تین طرح سے جواب دیں گے:

اول:۔ جو کہ نقضی جواب ہے۔ یہ کہ ہمارا اور آپ کا مسئلہ ایک ہے وہ یہ کہ جس طرح آپ کہتے ہیں کہ امام معصوم کی اطاعت، اس کی معرفت، اس تک رسائی اور اس سے استفادہ پر موقوف ہے، تو اہل حل و عقد کے بارے میں بھی تو یہی صورت حال در پیش ہے۔ یعنی معرفت، ان تک رسائی اور ان سے استفادہ۔ اور جس طرح دور حاضر میں ہم کو اپنے امام تک رسائی اور ان سے علمی اور دینی مسائل کے حصول کا مسئلہ درپیش ہے اسی طرح آپ کو بھی تو اپنے تمام اہل حل و عقد تک رسائی اور ان سے علم کا حصول اور ان کی آراء کے علم کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگرچہ ہم ان تک اس لئے پہنچنے سے قاصر ہیں کہ وہ پردہ غیبت میں ہیں، لیکن آپ لوگوں کیلئے مشکل یہ ہے کہ تمام اہل حل و عقد روئے زمین پر مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں ان سب تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

دوم:۔ جو کہ حلی جواب ہے۔ یہ کہ اولی اولی الامر کی اطاعت کا ان کی معرفت اور ان سے استفادہ، احکام پر موقوف ہونا اس بات کا موجب نہیں ہے کہ ان کی اطاعت بھی اسی چیز کے ساتھ مشروط ہے، بلکہ یہ وجود کے مقدمات میں سے ہے۔ اصل چیز اولی الامر کی اطاعت واجب مطلق ہے اور واجب مطلق کے مقدمات کا حصول خود انسان کے ذمہ ہوتا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان کے آراء کو حاصل کرے اور ان کی اطاعت کو بجالائے۔

دور حاضر میں ہمارا امام زمانہ ولی امر مسلمین عجل اللہ فرجہٗ کے حضور نہ پہنچ سکنا اور ان کی رائے کو حاصل نہ کر سکنا ہماری اپنی کوتاہی سے ہے۔ اس لئے ہم مسلمان ہی ان کی غیبت کا سبب بنے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے یا ان کے تصرف سے استفادہ نہیں کر سکتے یا ان کے احکام کو حاصل نہیں کر پاتے، تو ہمارا اپنا قصور ہے اگر ہم آج بھی ان کی غیبت کے اسباب کو دور کر دیں تو ان کے وجود سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے احکام حاصل کر کے اتباع و اطاعت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

تک لوگوں کی رسائی بھی رہی ہے اور ان سے احکام حاصل کئے جاتے رہے ہیں۔ جس سے رازی کا یہ نظریہ غلط ثابت ہوتا ہے کہ اولی الامر تک رسائی ناممکن ہے۔

۳۔ رہی موصوف کی یہ بات کہ "آیت میں "اولی الامر" جمع کا صیغہ ہے جبکہ شیعوں کے نزدیک ہر زمانے میں صرف ایک امام ہوتا ہے تو یہ ظاہر کے خلاف ہے"۔

ہم موصوف کی اس بات سے دو طرح سے اتفاق نہیں کر سکتے: ایک تو اس لئے کہ زمانہ پیغمبرؐ میں بھی ایک سے زائد امام موجود تھے، اور آپؐ کے بعد ائمہ کے دور میں بھی ایسا ہی تھا کیونکہ ہر امام کی اولاد۔ جو امامت کی صلاحیت رکھتی تھی۔ موجود رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ جمع کا صیغہ ان کے متعدد ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ خواہ ان کیلئے زمانے مختلف ہی ہوں، اور آیت میں یہ نہیں ہے کہ سب ائمہ ایک ہی وقت اور ایک جگہ پر ہوں تو ان کی اطاعت واجب ہے اور ان کا تدریجی طور پر آنا آیت کے مفہوم کے خلاف نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ ہم آپ کی اس بات کو مان لیتے ہیں کہ "جمع کے صیغے کا حمل مفرد پر کیا جا رہا ہے" لیکن جب اقتضا موجود ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا، بلکہ ایسا کرنا لازم ہو جاتا ہے اور اس مقام پر یہ اقتضا موجود ہے کہ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ولی امر کا معصوم ہونا ضروری ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ عصمت صرف ائمہ اہل بیتؑ ہی میں منحصر ہے۔ اور اس بات کو رد کیا جا چکا ہے۔ جیسا کہ رازی کہتے ہیں۔ کہ عصمت اجماع امت کیلئے ہے تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اولی الامر سے مراد معصوم امام ہی ہوں۔ اگرچہ جمع کا استعمال بقول رازی مفرد کیلئے ظاہر کے خلاف ہے۔

۴۔ رازی کا یہ کہنا کہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ" کے بموجب اگر اولی الامر سے مراد امام معصوم ہو تو پھر واجب ہو جائے گا کہ اطاعت بھی امام معصوم کی واجب اور متنازعہ امور میں بھی امام معصوم ہی اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کریں، تو یہ صحیح نہیں ہے اور حق وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں"۔

ان کا یہ فرمان بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ "اولی الامر" سے مراد امام معصوم ہو اور پھر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى الْاِمَامِ "اگر متنازعہ امور پیدا ہو جائیں تو اسے امام کی طرف پلٹاؤ۔ کے درمیان کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ اگر اس کی توجیہ یوں کی جائے کہ اس سے موصوف کی مراد یہ ہے کہ "اگر اولی الامر" سے مراد امام معصوم ہوں تو پھر ضروری ہو جائے گا کہ یہ کہا جائے: "اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اسے خدا، رسولؐ اور اولی الامر کی طرف پلٹاؤ" اور چونکہ خدا نے "وَاِلٰى اُوْلِي الْاَمْرِ" نہیں فرمایا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اولی الامر بھی ان مخاطب افراد میں شامل ہیں اور انہیں بھی خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے۔ اور یہ بات قرینہ بن جائے گی کہ "اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" سے مراد ارباب حل و عقد ہوں"۔

ایسی صورت میں ہمارا جواب یہ ہوگا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ: "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ" کے مخاطب بھی وہی افراد ہیں جو "يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ......" کے مخاطب ہیں اور جس طرح اولی الامر قطعی طور پر خطاب اول سے خارج ہیں۔ جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں۔ اسی طرح وہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ......" کے خطاب سے بھی خارج ہیں۔ ہاں البتہ یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ" کے ساتھ "وَاُوْلِي الْاَمْرِ" کا ذکر نہیں ہے، تو اس سے ہمارے موقف پر کوئی

اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جب "رسولؐ کی طرف رجوع کرنے" کا حکم آگیا ہے تو اولی الامر کی طرف رجوع کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ائمہ اطہارؑ پیغمبرؐ ذی وقار کے باوقار و صاحب اقتدار جانشین ہیں اور بعد از وفات پیغمبرؐ ان کی طرف رجوع ایسا ہے جیسے زندگی میں ان کی طرف رجوع کیا جائے، کیونکہ حضورؐ کے یہ مقدس جانشین، آپؐ کی شریعت کے محافظ اور آپؐ کی امت کے ہادی ہیں، اس لئے کہ آپؐ کے جانشین ہیں۔

یہاں پر اگر کوئی یہ کہے کہ رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں بھی تو یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ "رسولؐ کی طرف رجوع، خدا کی طرف رجوع ہے، لہٰذا ان کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں تھی" تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرنے سے مراد اس کی کتاب _ قرآن _ کی طرف رجوع کرنا ہے اور رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے مراد ان کی سنت کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ کتاب خدا کے تمام تنازعات کے حل کرنے کیلئے بذات خود کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن احکام پر کتاب خدا مشتمل ہے وہ بہت ہی کم ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جن تنازعات کو کتاب اللہ کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا ان کیلئے سنت پیغمبرؐ کی طرف رجوع کیا جائے گا، جو اکثر و بیشتر اور کافی حد تک احکام شرعیہ کے حل پر مشتمل ہے۔ اور چند ایک کے سوا ہر قسم کے تنازعات کے حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں، جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آیت میں خدا اور رسولؐ کے علاوہ "اولی الامر" کی طرف رجوع کرنے کا حکم بھی ہے۔ اور یہی چیز ہمارے اس دعوے کی بھی تائید کرتی ہے اور ہمارے نزدیک قوی ترین دلیل ہے، وہ یہ کہ:

علی بن ابراہیم قمی اپنی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "یہ آیت یوں نازل ہوئی ہے "فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَارْجِعُوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلىٰ اُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" پس اگر تم کسی چیز میں تنازع پیدا کرو تو اسے خدا، رسولؐ اور اولی الامر کی طرف لوٹاؤ......" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مصحف اہل بیتؑ میں "واولی الامر" کے الفاظ موجود ہیں، اگرچہ موجودہ قرآن میں _ جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے _ نہیں ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کی کارستانی ہے جنہوں نے قرآن میں تحریف کی ہے اور اس کی دھجیاں بکھیری ہیں اور دین کے بدلے دنیا کو خرید لیا۔

بہرحال یہ بات تو تحقیق سے ثابت ہو گئی کہ یہ آیت ائمہ اطہار علیہم السلام کی امامت اور علی بن ابی طالب کی خلافت بلا فصل پر نص جلی ہے۔ اے کاش! کہ ان جیسے ناصبی خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرتے۔ "اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا" (کہف / ۱۰۵) یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں سے اور قیامت کے دن اس کے سامنے حاضر ہونے سے انکار کیا تو ان کے سب اعمال اکارت گئے، پس ہم قیامت کے دن ان کیلئے میزان حساب بھی قائم نہیں کریں گے۔

۳۔ آیت تبلیغ

ائمہ اطہارؑ کی امامت اور حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل کے بارے میں نازل ہونے والی آیات میں ایک آیت، آیہ تبلیغ ہے

خداوند عالم فرماتا ہے: "یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (مائدہ/۶۷) اے رسولؐ! جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے پہنچادو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے اس کا کوئی پیغام نہیں پہنچایا اور خدا تم کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔

چنانچہ اس آیت کے بارے میں اہل تشیع کا موقف بہت سے اہل تسنن کی مانند یہ ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس بارے میں انہوں نے بہت سی روایات کو درج کیا ہے، مثلاً امام فخر الدین رازی جیسے متعصب شخص نے بھی آیت کے شان نزول کے بارے میں بہت سی لایعنی وجوہات تحریر کرنے کے بعد لکھا ہے:

ا۔ "دسویں بات: یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کی فضیلت میں نازل ہوئی ہے اور جب نازل ہوئی تو حضرت رسول پاکؐ نے علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ" جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے، خداوندا! جو علیؑ سے دوستی رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی رکھے تو بھی اس کے ساتھ دشمنی رکھ۔ تو اس دوران میں حضرت علیؑ کے ساتھ حضرت عمر کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپؑ کو ان الفاظ میں مبارکباد پیش کی "هَنِیْئًا لَكَ یَابْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَ مَوْلَا كُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ" فرزند ابو طالبؑ! آپؑ کو مبارک ہو کہ آپؑ میرے اور ہر مؤمن و مؤمنہ کے مولا بن گئے"۔ یہ ابن عباس، براء بن عازب اور محمد بن علی کا قول ہے۔

۲۔ غایۃ المرام میں تفسیر ابن ثعلبی سے، اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت لکھی ہے: "امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس آیت کے معنی یوں ہیں: "بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ فِیْ فَضْلِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ" اے پیغمبرؐ جو باتیں فضائل علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں آپؐ کی طرف نازل کی گئی ہیں وہ لوگوں تک پہنچادیں۔ ایک اور نسخہ کے مطابق آپؑ نے فرمایا آیت کے یہ معنی ہیں: "یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ فِیْ عَلِیٍّ" اے رسولؐ جو باتیں علیؑ کے بارے میں آپؐ پر اتاری گئی ہیں وہ پہنچا دو۔ اور فرمایا" آیت اسی طرح ہی نازل ہوئی ہے"۔ اسی کو حضرت امام جعفر صادقؑ نے روایت کرتے ہوئے فرمایا کہ: "جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ"۔

۳۔ کتاب "فصول المہمہ" ابن صباغ مالکی میں ہے کہ امام ابو الحسن واحدی نے اپنی کتاب "اسباب النزول" میں مرفوع سند کے ساتھ ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: "یہ آیت یَاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ..... "غدیر خم کے دن حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی"۔

اس کے علاوہ بھی مکتب خلفاء کی طرف سے بیان کی جانے والی روایات بہت ہی زیادہ ہیں۔ آیت میں "بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ" سے مراد "لوگوں تک علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کو پہنچانا ہے"، چنانچہ جب آنحضرتؐ پر یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ نے اس کی کما حقہ اور عملی طور پر تبلیغ کی اور مقام غدیر خم پر اس کا حق یوں ادا کیا کہ حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر لوگوں سے فرمایا: "لوگو! کیا میں تمہارے نفسوں ـ جانوں ـ پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟" تو سب لوگوں نے ـ بیک زبان ـ کہا: "یا رسول اللہ! ضرور رکھتے ہیں!" تو اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ وَ انْصُرْ مَنْ نَصَرَهٗ وَ

اخذل من خذله و ادر الحق معه کیف ما دار''جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے، خداوندا! جو علی سے دوستی رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو علی سے دشمنی رکھے تو بھی اس کے ساتھ دشمنی رکھ، جو اس کی مدد کرے تو اس کی مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے ذلیل و رسوا فرما، پروردگارا! جس طرف علی جائے حق کو بھی اسی طرف پھیر دے۔

حسان بن ثابت کا قصیدہ

يُنَادِيْهِمْ يَوْمَ الْغَدِيْرِ نَبِيُّهُمْ بِخُمٍّ وَ اَكْرِمْ بِالنَّبِيِّ مُنَادِيًا
يَقُوْلُ فَمَنْ مَوْلَاكُمْ وَ وَلِيُّكُمْ فَقَالُوْا وَ لَمْ يَبْدُوْا هُنَاكَ التَّعَادِيَا
اِلٰهُكَ مَوْلَانَا وَ اَنْتَ وَلِيُّنَا وَ لَنْ تَجِدَنَّ مِنَّا لَكَ الدَّهْرَ عَاصِيًا
فَقَالَ لَهُ قُمْ يَا عَلِيُّ فَاِنَّنِيْ رَضِيْتُكَ مِنْ بَعْدِيْ اِمَامًا وَ هَادِيًا
فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِيُّهُ فَكُوْنُوْا لَهُ اَنْصَارَ صِدْقٍ مَوَالِيًا
هُنَاكَ دَعَا اللّٰهُمَّ وَالِ وَلِيَّهُ وَ كُنْ لِلَّذِيْ عَادَ عَلِيًّا مُعَادِيًا

غدیر خم کے موقع پر مسلمانوں کے نبی انہیں پکار کر کہہ رہے تھے کہ رسولؐ کی آواز کو سنو اور اچھی طرح سنو، پیغمبر کہہ رہے تھے کہ تمہارا مولا اور ولی کون ہے؟ تو انہوں نے بغیر کسی قسم کی دشمنی اور مخالفت کا اظہار کئے کہہ دیا کہ: ''تیرا معبود ہی ہمارا مولا ہے اور تو ہی ہمارا ولی و سرپرست ہے، اور تو زندگی بھر ہم سے کسی کو بھی اس بارے میں نافرمان نہیں پائے گا، اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: ''علی! کھڑے ہو جاؤ کہ میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور ہادی پسند کیا ہے، پس جس کا میں مولا ہوں یہ بھی اس کا ولی ہے، لہٰذا اے مسلمانو! تم اس کے سچے دل سے مددگار اور حبدار بن جاؤ! وہاں پر آنحضرتؐ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! جو اسے دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو علی سے دشمنی رکھے تو بھی اس کا دشمن بن جا۔

اسی طرح ''قیس بن سعد'' اپنے اشعار میں علی کی امامت و ولایت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

عَلِيٌّ اِمَامُنَا وَ اِمَامٌ لِسِوَانَا اَتٰى بِهِ التَّنْزِيْلُ
يَوْمَ قَالَ النَّبِيُّ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا مَوْلَاهُ خَطْبٌ جَلِيْلٌ
اِنَّمَا قَالَهُ النَّبِيُّ عَلَى الْاُمَّةِ حَتْمًا مَا فِيْهِ قَالٌ وَ قِيْلُ

علی ہمارے امام اور ہمارے علاوہ دوسروں کے بھی امام ہیں اور یہ بات قرآن نے بتائی ہے جس دن نے نبی اکرمؐ نے فرمایا جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ بھی مولا ہے اور یہ بہت ہی بڑے بات ہے، پیغمبر گرامیؐ نے یہ بات امت کو حتمی طور پر بتا دی ہے جس میں کسی قسم کی قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے۔

مولا یعنی چہ؟

آیہ بلغ کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت رسول اکرمؐ نے حضرت علی کے بارے میں فرمایا: ''من كنت مولاه فهذا عليٌّ

مَوْلَاہُ"جس کا میں مولا ہوں یہ علی اسی کا مولا ہے۔ اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ "مولا" کے کیا معنی ہیں؟ اور یہاں پر کونسا معنی مراد ہے؟

اگر لفظ مولا کو دیکھا جائے تو اس کے لغوی لحاظ سے چھ معانی ہوتے ہیں ا۔ اولیٰ بالتصرف ۲۔ غلام آزاد کرنے والا ۳۔ آزاد کردہ غلام ۴۔ ہمسایہ ۵۔ حلیف ۶۔ مددگار۔ چنانچہ اس مقام پر ۲ سے ۵ تک کے متعلق تو واضح ہے کہ یہاں پر مراد نہیں لئے جاسکتے، چھٹے کے بارے میں بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں لے دے کے وہی پہلا معنی ہی مراد ہوگا۔ چھٹے معنی کے متعلق اس لئے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے "وَالْمُؤْمِنُونَ وَ الْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ"(توبہ / ۷۱) مؤمن مرد اور مؤمنہ عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہاں پر پہلا معنی اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ اس بارے میں بہت سے قرائن موجود ہیں اور بہت سی احادیث اس کی تائید کرتی ہیں، مثلاً علی بن احمد مالکی۔ کہ جن کا شمار اہل سنت کے بزرگ علماء میں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:"

حافظ ابو الفتوح سعد بن ابی الفضائل بن خلف عجلی اپنی کتاب "اَلْمُوَحَّدُ فِيْ فَضْلِ الْخُلَفَاءِ الْاَرْبَعَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ" میں مرفوع سند کے ساتھ حذیفہ بن اسد غفاری اور عامر بن لیلیٰ بن حمزہ۔ دونوں۔ کہتے ہیں کہ :"جب حضرت رسول اکرمؐ حجۃ الوداع۔ جس کے بعد آپؐ نے کوئی حج نہیں فرمایا۔ سے فارغ ہوگئے تو وہ واپس مدینہ آنے لگے، جب مقام "جحفہ"(۱) پر پہنچے۔ جو ببول کے درختوں کے جھنڈ کے قریب تھا۔ جس کی زمین پتھریلی تھی تو آپؐ نے حکم دیا کہ درختوں کے نیچے کوئی پڑاؤ نہ کرے، چنانچہ لوگوں نے درختوں کے سائے سے ہٹ کر اپنی اپنی جگہ متعین کرلی اور وہاں کو جھاڑو وغیرہ کے ذریعے صاف کیا۔ اتنے میں نماز ظہر کی اذان دی گئی، آنحضرتؐ درختوں کے سائے میں تشریف لے گئے، وہاں نماز باجماعت پڑھائی۔ وہ غدیر خم کا دن تھا، جب نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا:"لوگو! مجھے لطیف و خبیر اللہ نے خبر دی ہے کہ ہر پیغمبر اپنے سے پہلے نبی کی آدھی عمر پاتا ہے، جس سے میں یہی سمجھا ہوں کہ میں بہت جلد پیغام اجل کو لبیک کہنے والا ہوں، تو تم سے جوبات کہنی ہے وہ یہ کہ :میں نے بھی اللہ کی بارگاہ میں جواب دینا ہے اور تم سے بھی جواب طلبی کی جائے گی تو کیا میں نے حق تبلیغ ادا کردیا ہے؟ تم لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو سب نے مل کر کہا :"آپؐ نے تبلیغ رسالت کا حق ہی ادا نہیں بلکہ بہت کوشش اور تگ ودو کی، خیر خواہی سے کام لیا، خدا آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے!" آنجنابؐ نے پھر فرمایا:"تو کیا تم لوگ اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ جل شانہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ رسول اللہ، اللہ کا بندہ اور رسول ہے؟ آیا نہیں کہتے ہو کہ اللہ کی جنت برحق ہے، دوزخ برحق ہے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا برحق ہے؟ سب نے کہا"بالکل، بالکل ایسا ہی ہے!" آنحضرتؐ نے یہ سن کر فرمایا:"خدایا گواہ رہنا" پھر فرمایا:"لوگو! آیا سن نہیں رہے ہو، آگاہ رہنا کہ اللہ میرا مولا ہے اور میں تم سے زیادہ تمہاری جانوں پر حق تصرف رکھتا ہوں! خبردار ہو کر سنو کہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی مولا ہے"۔ اور حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر اس قدر بلند فرمایا کہ سب لوگوں نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے بعد فرمایا:"بار الہا! جو اسے دوست رکھے اسے تو بھی دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی برتے تو بھی اسے دشمن رکھ"۔

---

(۱) کتاب "قاموس" میں ہے کہ "جحفہ" مکہ مکرمہ سے ۸۲ میل کے فاصلے پر ایک بڑا سا گاؤں تھا جسے "مہیعہ" بھی کہتے تھے۔ اور "خم غدیر" جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا، ابن شہر آشوب کہتے ہیں کہ "غدیر" وادی اراک میں مدینے سے دس فرسخ اور جحفہ سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پر پانچ بڑے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔

اس روایت میں موجود قرائن جو مقصود کی نشاندہی کرتے ہیں مخفی نہیں ہیں، مثلاً :

ا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ولایت کا اصول عقائد یعنی توحید، نبوت اور معاد کے ساتھ بیان کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ مولا سے مراد امام اولی بالتصرف ہے کیونکہ ولایت اس لائق ہے کہ توحید و رسالت کے بعد اس پر پختہ عقیدہ رکھا جائے۔

۲۔ حضور رسالت مآب کا اپنی گفتگو کے دوران حرف تنبیہ "الا" کا اور پھر اس کے بعد تاکید کے طور پر بیان کرنا "الا و مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ" کہنا۔ ایک عظیم ترین مقصد کیلئے متنبہ کرنا تھا، جبکہ یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ "نصرت" کیلئے اس قدر اہتمام اور اس قدر مبالغے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ پھر یہ بھی کہ آنجناب کا لوگوں کو بات غور سے سننے کیلئے جھنجھوڑ کر کہنا "الا تسمعُوْنَ" (کیا سن نہیں رہے ہو؟) وغیرہ ایسے قرائن ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مولا کے معنی "اولی بالتصرف" ہیں۔

غرض ہماری اس گفتگو سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل کی ایک محکم دلیل ہے جس کی تصدیق و توثیق شیعہ سنی روایات کثرت سے کر رہی ہیں اور انہی روایات کی کثرت نے حدیث غدیر کو تواتر کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ ان معروضات کی روشنی میں ناصبیوں کے ان اعتراضات کا آسانی کے ساتھ جواب دیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اس بارے میں کئے ہیں، مثلاً :

ا۔ قوشجی نے "شرح تجرید" میں محقق طوسیؒ کے اس قول : "حدیث غدیر متواتر ہے" پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ : "اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث (حدیث غدیر) متواتر نہیں بلکہ اجماع کے مقابلے میں خبر واحد ہے، کیونکہ ایک تو اس کی صحت میں بہت سے صاحبان حدیث نے قدح (انگشت نمائی) کی ہے۔ دوسرے بخاری، مسلم اور واقدی جیسے محققین نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر نہیں کیا اور تیسرے جن لوگوں نے اسے ذکر کیا بھی ہے تو اکثر نے اس کے مقدمے _ حضورؐ کا "اَلَسْتُ اَوْلیٰ بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ" فرمانے _ کو ذکر نہیں کیا، جس کی بنا پر دلیل قائم کی جاتی ہے کہ مولا سے مراد اولی بالتصرف نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح صاحب "مواقف" نے ذکر کیا ہے کہ آنحضرتؐ کا "اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ" فرمانا، اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ "مولا کے معنی ناصر اور محب کے ہیں"۔ جبکہ قوشجی تو اس حد تک کہتے ہیں کہ صرف اس حد تک احتمال ہی سارے استدلال کو غیر مؤثر کر دینے کیلئے کافی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ مؤمنوں کو ایک دوسرے کا دوست ہونا تو قرآن کی اس آیت سے اچھی طرح واضح ہے : "وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ" (مؤمن خواہ مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں) اس سے وہ احتمال دور نہیں ہو سکتا جو مولا کو دوست کے معنی میں قرار دیتا ہے، کیونکہ اس سے غرض حضرت علیؑ کی موالات (دوستی) اور نصرت پر نص قائم کرنا تھی۔ تاکہ آپؑ کی دوستی اور مدد دائرہ عموم سے نکل کر مرکز خصوص تک پہنچ جائے۔ اور پیغمبرؐ کی سی موالات اور نصرت کے حقدار بن جائیں۔

۳۔ قوشجی اور صاحب مواقف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ مولا کے معنی "اولی" کے ہیں، تو یہ آپؑ کہاں سے کہتے ہیں کہ اس سے مراد "اولیٰ بالتصرف" ہیں، بلکہ "اولی بالامر من الامور" (کسی ایک خاص امر کیلئے اولویت کے

حامل ہیں) کا معنی بھی تو مراد لیا جاسکتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے :"اِنَّ اَولَی النَّاسِ بِاِبراهِیمَ لَلَّذِینَ اتَّبَعُوهُ "(آل عمران /۶۸) ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصیت ان لوگوں کو تھی جو خاص ان کی پیروی کرتے تھے۔ یہاں پر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ "اولویت" سے مراد اتباع و فرمانبرداری میں اولویت ہے اور ابراہیمؑ کے ساتھ خصوصی قرب کی اولویت کا شرف حاصل ہے۔

۴۔ صاحب مواقف اور شرح تجرید کے ایک شارح کہتے ہیں کہ "اولیٰ" بمعنی "افعل" کے اور "مولا" بمعنی "مفعل" کے ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو ایک دوسرے کا معنی نہیں دے سکتے۔ ورنہ جو صورت حال پہلے کو درپیش آتی ہے تو دوسرے کو وہی آنی چاہئے اور جو دوسرے کو آتی ہے وہ پہلے کو بھی آئے۔ جیسا کہا جاتا ہے "فلاں شخص فلاں کا مولا ہے اور فلاں شخص فلاں سے اولیٰ ہے" چونکہ ایسا نہیں ہوتا لہذا مولا بمعنی اولیٰ بھی صحیح نہیں ہے۔

یہ تھے اعتراضات پر مبنی ان کے دلائل جن کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے اور ان لوگوں نے اپنی عمر یں ایسی باتوں میں صرف کر کے اپنی عمر پر ہی ظلم کیا ہے جو اگرچہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا جواب دیا جائے لیکن جواب دینا مناسب اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ان کی حیثیت صرف خواب پریشان کی سی ہے اور اس میں شیطان کا دخل زیادہ ہے، بہر حال تو اب سنئے ان کا جواب :

ا۔ قوشجی نے حدیث غدیر کے تواتر سے انکار کیا ہے حالانکہ یہ ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں، اس کیلئے تو انہیں شیعہ سنی کتب احادیث کا مطالعہ کرنا چاہئے تھا، جس سے انہیں معلوم ہو جاتا کہ جو موقف انہوں نے اختیار کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ سید ہاشم بحرانی نے اپنی کتاب "غایۃ المرام" میں اہل سنت کے نواسی ذریعوں سے اور اہل تشیع کے تینتالیس ذرائع سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کتاب مذکور میں فرماتے ہیں کہ :"غدیر خم کی روایت فریقین کی طرف سے حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہے حتی کہ صاحب "تاریخ طبری" محمد ابن جریر نے بھی واقعہ غدیر خم کو اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور اس کے پچھتر ذرائع کو نقل کیا ہے، اور اس واقعہ کیلئے ایک کتاب کو مختص کیا ہے جس کا نام انہوں نے "کتاب الولایۃ" رکھا ہے۔ حالانکہ ان کا تعلق مکتب اہل بیتؑ سے نہیں بلکہ مکتب خلفاء سے ہے۔ ابو العباس احمد بن محمد بن سعید بن عقدہ نے غدیر خم کے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور اس کیلئے ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے اور اس کے ایک سو پانچ ذرائع کو نقل کیا ہے جو حد تواتر سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور اس قدر ذرائع سے کوئی اور واقعہ بیان ہی نہیں ہوا۔ اور اس بات کی دلیل کہ "واقعہ غدیر خم کے سلسلے میں بیان ہونے والی روایات اس قدر تواتر کے ساتھ ہیں کہ کسی اور واقعہ کے بارے میں اتنا تواتر نہیں ہے" یہ ہے کہ "علامہ سید علی بن موسیٰ بن طاؤس بیان کرتے ہیں اور علی بن محمد بن شہر آشوب ان سے بیان کرتے ہیں کہ :"میں نے ابو المعالی کو تعجب کے ساتھ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے بغداد میں ایک جلد ساز کے ہاتھوں میں ایک ضخیم کتاب دیکھی جس پر لکھا ہوا تھا "اٹھائیسویں جلد" اور پوری کتاب غدیر خم کی روایات پر مشتمل تھی اور "مَن کُنتُ مَولَاهُ فَعَلِیٌّ مَولَاهُ" کے بارے میں تمام روایات تھیں اور اس کے آخر میں لکھا ہوا تھا کہ اس کے بعد انتیسویں جلد بھی ہے"۔

قاضی نور اللہ شوستری۔ نور اللہ مرقدہ۔ اپنی کتاب "احقاق الحق" میں ملعون ناصبی فضل بن روزبہان کے جواب میں فرماتے

ہیں : "یہ حدیث (غدیر) مکتب خلفاء کی صحاح ستہ مثلاً بخاری میں بھی ہے اور اسے امام اہل سنت احمد بن حنبل نے بھی متعدد طریقوں سے اسی طرح ذکر کیا ہے جو مصنف نے بیان کیا ہے۔ یعنی جب آیت "یَاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ....." نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا" مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ"۔ اسی طرح ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اور ابن مغازلی شافعی نے اپنی کتاب میں مختلف ذرائع سے بیان کیا ہے، ابن عقدہ نے ایک سو پانچ ذریعوں سے اور شیخ ابن کثیر شامی شافعی نے ابن جریر طبری کے حالات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے کہا : "میں نے ایک کتاب دیکھی ہے جس میں غدیر خم سے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا تھا اور وہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی، اور ایک اور کتاب دیکھی ہے جس میں "حدیث طیر" کے اسناد کو ذکر کیا گیا تھا۔ اور ابو المعالی جوینی کی تعجب پر مبنی مذکورہ گفتگو کو بھی احقاق الحق میں ذکر کیا گیا ہے جو کہ غایۃ المرام میں سے ابھی بیان کر چکے ہیں۔

سید نور اللہ فرماتے ہیں کہ : "شیخ ابن جزری شافعی نے اپنے رسالے "اسنی المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب" میں اس حدیث کے تواتر کو کثیر اسناد و ذرائع کے ساتھ ثابت کیا ہے، اور اس (حدیث غدیر) کے منکر کو جاہل اور متعصب کہا ہے"۔

مکتب خلفاء کے راویان حدیث غدیر

ابن شہر آشوب کہتے ہیں کہ : "علماء اس خبر کے قبول کرنے میں متفق القول ہیں۔ اختلاف صرف اس کی تاویل میں ہے، چنانچہ اس حدیث کو مندرجہ ذیل افراد نے بیان کیا ہے :

محمد بن اسحٰق، احمد بلاذری، مسلم بن حجاج، ابو نعیم اصفہانی، ابو الحسن دار قطنی، ابو بکر بن مردویہ، ابن شاہین، ابو المعالی جوینی، ابو اسحٰق ثعلبی، ابو سعید خرکوشی، ابو المظفر سمعانی، ابو بکر بن شیبہ، علی بن جعد، شعبہ، اعمش، ابن عباس، ابن ثلاج، شعبی، زہری، اقلیشی، ابن بیع، ابن ماجہ، ابن عبد ربہ، اسکافی، اور ابو یعلی موصلی نے کئی طرح کے اسناد کے ساتھ۔ احمد بن حنبل نے چالیس ذرائع سے، ابن بطہ نے تینتیس ذرائع سے، ابن جریر طبری نے ساٹھ سے زیادہ اسناد سے اپنی کتاب "الولایہ" میں، ابو العباس بن عقدہ نے ایک سو پانچ ذرائع سے اور ابو بکر جعانی نے ایک سو پچیس طریقوں سے۔ اسی طرح علی بن ہلال مہلبی نے "الغدیر" کے نام سے کتاب تحریر کی ہے، اور احمد بن محمد بن سعد نے کتاب "مَنْ رَوَیٰ غَدِیْرَ خُم" (راویان غدیر خم) کے نام سے لکھی ہے، جبکہ مسعود سحری نے ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اس روایت کو بیان کرنے والے اور اسناد کو قلمبند کیا ہے۔ منصور لالی (یا لالکائی) رازی نے اپنی کتاب میں اس حدیث کے راویوں کے ناموں کو حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور صاحب کافی سے ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں غدیر خم کی داستان ہم سے قاضی ابو بکر جعانی نے روایت کی ہے اور انہوں نے مندرجہ ذیل حضرات سے :

وہ حضرات یہ ہیں : ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، حسن، حسین، عبد اللہ بن جعفر، عباس بن عبد المطلب، عبد اللہ بن عباس، ابو ذر، سلمان، عبد الرحمٰن، ابو قتادہ، زید بن ارقم، جریر بن حمید، عدی بن حاتم، عبد اللہ بن انیس، براء بن عازب، ابو ایوب، ابو بریدہ اسلمی، سہیل بن حنیف، سمرۃ بن جندب، ابو الہیثم، عبد اللہ بن ثابت انصاری، سلمہ بن اکوع خدری، عقبہ بن عامر، ابو رافع، کعب بن عجرہ، حذیفۃ الیمان، ابو مسعود بدری، حذیفۃ بن اسید، زید بن ثابت، سعد بن عبادہ، خزیمہ بن ثابت، حباب بن عتبہ، جندب بن

سفیان، عمر بن ابی سلمہ، قیس بن سعد، عبادہ بن صامت، ابو زینب، ابو لیلیٰ، عبد اللہ بن ربیعہ، اسامہ بن زید، سعد بن جنادہ، حباب بن سمرہ، یعلی بن مرہ، ابن قدامہ انصاری، ناجیہ بن عمیرہ، ابو کاہل، خالد بن ولید، حسان بن ثابت، نعمان بن عجلان، ابو رفاعہ، عمرو بن حمق، عبد اللہ بن یعمر، مالک بن حویرث، ابو الحمراء، حمزۃ بن الطبیب، (یا حمزۃ بن الحدید) وحشی بن حرب، عروہ بن ابی الجعد، عامر بن نمیری، بشر بن عبد المنذر، رفاعہ بن عبد المنذر، ثابت بن ودیعہ، عمرو بن حریث، قیس بن عاصم، عبد الاعلیٰ بن عدی، عثمان بن حنیف، ابی بن کعب اور خواتین میں سے فاطمۃ الزہرا، عائشہ، ام سلمہ اور فاطمہ بنت حمزہ"۔ غرض کہ یہ حدیث شہرت کے لحاظ سے اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ اس حد تک کوئی اور حدیث نہیں پہنچ سکی اور مسلم امہ کے محققین نے اسے اعتبار اور قبول کا اتنا درجہ دیا ہے کہ جسے دشمن مخالف کے سوا کوئی اور رد نہیں کر سکتا یا پھر وہ جو کتب روایات واحادیث سے بے خبر ہے۔

۲۔ رہاان کا دوسرا اعتراض کہ "حدیث کا آخری حصہ چونکہ نصرت اور محبت کی نشاندہی کر رہا ہے لہذا "مولا" بھی ناصر اور حبدار کے معنی میں ہوگا" تو یہ تو اس وقت ہوتا جب یہ کہا جاتا کہ لفظ کا اطلاق اپنے معانی میں سے کسی ایسے معانی پر بولا جا رہا ہے جو اشتقاق کے لحاظ سے اس کے قریبی اور مناسب معنی کیلئے نہیں ہے، حالانکہ یہاں پر ایسا نہیں ہے بلکہ ایسی نوعیت کی گفتگو بعض اوقات محسنات بدیعیہ میں شمار ہوتی ہے۔ لہذا حدیث پیغمبرؐ کے آخری حصے کو اس کے پہلے حصے کے ساتھ ملانا اور دونوں الفاظ کو ایک معنی کیلئے لینا صحیح نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ آخری حصہ ایک دعائیہ جملے کی حیثیت رکھتا ہے اور جملہ مستانفہ ایک نیا جملہ شمار ہوتا ہے، اس کا حدیث کے اگلے حصے کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ لہذا آخری حصے کو مد نظر رکھ کر۔ اس کے پہلے حصے کی طرف اشارہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص بھی اس آیت میں بصیرت کی آنکھ کے ساتھ غور وفکر سے کام لے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ آیت کے آخر میں جو تنبیہ کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز کی تبلیغ کا پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے وہ بہت ہی عظیم اہمیت کی حامل ہے، کہ اگر پیغمبرؐ اسے انجام نہیں دیتے تو گویا تبلیغ رسالت کا کوئی بھی کام انجام نہیں دیتے۔ بالخصوص ایک قرائت کے مطابق لفظ رسالت کی بجائے "رسالات" کا کام انجام نہیں دیا ہے، جیسا کہ کشاف وغیرہ میں ہے۔ اگر اس سے پیغمبرؐ کی تبلیغ رسالت کا مقصد یہ ہوتا کہ لوگوں کو بتائیں "علی ناصر مومنین" ہیں، ایسا کرنے میں آپ کو کونسا خوف لاحق تھا؟ اور اگر نہیں بتاتے تو تمام کار رسالت بیکار جاتا ہے؟ لیکن اس کے اظہار کیلئے اللہ تعالیٰ پیغمبرؐ کو حفاظت کی ضمانت دے رہا ہے کہ خدا تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ حالانکہ یہ تو ایک نہایت ہی آسان بات تھی کہ آنحضرتؐ لوگوں سے کہتے کہ: "دیکھو! علی ناصر ایمان اور حامی اسلام ہیں۔" جبکہ علی کی ایمان کیلئے نصرت، اسلام کیلئے حمایت، مومنین کیلئے مدد اور سید المرسلینؐ کے دین کیلئے محافظت تو ایسی چیزیں تھیں جو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔

لہذا عقل کے بدیہی فیصلے کے مطابق، پیغمبرؐ کا مخصوص زمان ومکان میں اترنا معمول کے مسافر کی طرح نہیں تھا۔ جبکہ کیفیت یہ تھی کہ بعض روایات کے مطابق موسم شدید گرم تھا۔ اس قدر گرم کہ لوگوں کو اپنی سواریوں کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ملتا تھا۔ شدت کی گرمی اور تیز دھوپ کی شدت کی وجہ سے لوگوں نے اپنی عبائیں پاؤں کے نیچے بچھا دیں تھیں۔ زمین پتھریلی اور کانٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس حالت میں سرکار رسالتؐ نے اپنے پالانوں کے منبر پر بیٹھ کر بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ لوگوں

کو خطبہ دیا اور علیؑ کو ایسے انداز میں متعارف کرایا جو بادشاہوں اور خلفاء کی شان ہوتی ہے، تو یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ حتمی وحی کی فوری تکمیل تھی۔ تا کہ ایک عظیم الشان اور جلیل القدر معاملے کو ان لوگوں تک پہنچایا جائے جو علیؑ کی امامت اور خلافت بلا فصل سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اگر آپؐ اس باعظمت امر کی تبلیغ نہیں کرتے اور اسے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچاتے تو رسالت کا سارا کام اکارت جاتا ہے نا کہ صرف ان لوگوں سے علیؑ اور اہل بیت رسولؐ کی محبت اور نصرت کا اقرار لینے کیلئے جو کہ اس سے پہلے طے پا چکا تھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے اب اس بات کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ اس سے اللہ کے رسولؐ کا مقصد صرف علیؑ کی محبت اور نصرت کا اعلان تھا، جس طرح کہ قوشجی اور ان کے ہم نواؤں کا موقف ہے۔ اور پھر احتمال کی بھی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ امیر المومنینؑ کے راہ اسلام میں کثرت سے مجاہدانہ کارنامے، مختلف جنگوں اور ہولناک مواقع پر مولائے کائنات کا مومنین کی نصرت کرنا اور جان کی بازی لگا کر اسلام اور دین کی حمایت اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا، جو کہ ساری دنیا پر عیاں اور اظہر من الشمس تھے، کیلئے یہ سارا اہتمام کیا گیا ہو کہ لوگوں کو بتا دیا جائے کہ علیؑ تمہارے ناصر اور مددگار ہیں۔ جیسا کہ اس بارے میں بہت سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔

۳۔ اب رہی معترض کی بات کہ: "مولا سے مراد ضروری نہیں کہ اولیٰ بالتصرف ہو، بلکہ کسی بھی امر میں اولیٰ مراد لیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ایک آیت میں "اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ" سے مراد اتباع میں اولویت اور قرب ہے اولیٰ بالتصرف نہیں ہے"۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے "اولیٰ" کے ساتھ "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" یا "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" کی قید بھی لگائی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے "اولیٰ بالتصرف" ہی مراد ہے، اس لئے کہ لوگوں کے نفسوں سے اولیٰ ہونے کا اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں کہ ان کے نفسوں پر ہی اولیٰ بالتصرف ہوں۔ البتہ چونکہ "اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ" میں کسی قسم کی قید نہیں ہے لہذا وہاں پر اتباع میں اولویت اور قرب ہی مراد ہو گی، لیکن اگر آیت میں مثلاً یہ ہوتا "اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيْمَ مِنْ نَفْسِهِ" اس وقت مراد، اولیٰ بالتصرف ہی ہوتی"۔

۴۔ اس سلسلے میں آخری اعتراض کا جواب بھی عرض کئے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ "مولیٰ" بمعنی "اولیٰ" اس لئے نہیں کہ کہیں پر بھی استعمال نہیں ہوا اور نہ ہی ان کا استعمال ایک دوسرے کی جگہ پر صحیح ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے قوشجی نے اپنی شرح تجرید میں اسے تسلیم کیا ہے اور وہ یوں کہ انہوں نے اس آیت "وَ مَاوٰيكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰكُمْ" (حدید / ۱۵) اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں "اور تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے یہی تمہارے لئے اولیٰ ہے" ابی عبیدہ سے روایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں آیت میں "مولیٰ" بمعنی "اولیٰ" ہے اس آیت میں استعمال ہونے کے پیغمبرؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ: "اَيُّمَا امْرَاَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ مَوْلَاهَا...... "جو عورت اپنے مولا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے...... تو یہاں پر "مولا" کے معنی دوست اور یار و مددگار کے نہیں بلکہ ایسے شخص کے معنی میں ہے جو اس کیلئے اولیٰ بالتصرف ہے اور اس کے امور کی تدبیر کا مالک ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اس قسم کی مثالیں اشعار میں کافی حد تک موجود ہیں"۔

اب رہی یہ بات کہ "ان میں سے _ یعنی "مولیٰ" اور "اولیٰ" میں سے _ ہر ایک ایسا کلمہ ہے جو ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے

سکتا"۔ تو یہ اعتراض بھی بے جا ہے، کیونکہ مطلقاً ایسا نہیں ہے اس لئے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ لفظ "صلواۃ" جب "دعا" کے معنی میں ہو تو صلواۃ "علیٰ" کے ساتھ اور دوسرا یعنی "دعا"، "لام" کے ساتھ ہی متعدی ہو کر استعمال ہوتے ہیں، جیسے "صَلّٰی عَلَیْهِ" اس کیلئے دعا کی، اور "دَعَالَهٗ" یعنی اس کیلئے دعا کی۔ لیکن اگر "دَعَا عَلَیْهِ" کہا جائے تو دعا کیلئے نہیں بلکہ اس کے برعکس بد دعا کے معنی میں ہوگا۔ اسی طرح لفظ "اِلاّ" ہے جو "غیر" کے معنی میں ہوتا ہے اور اس وقت اس کے محذوف کو حذف کر کے استعمال کرنا صحیح نہیں ہوگا لہذا "جَاءَ نبيٌ الاّ زَیْدٌ" نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کے برعکس "جَاءَ نبيٌ غَیْرَ زَیْدٍ" کہنا صحیح ہوگا۔ اس کا اصل راز یہ ہے کہ کلام عرب کا استعمال "توقیفی" ہوتا ہے لہذا جہاں پر جو کلمہ جس مخصوص کیفیت کے ساتھ استعمال ہوا ہے اسی طرح اس کی متابعت کی جائے گی اور اس کی خلاف ورزی جائز نہیں، کیونکہ لغات میں قیاس باطل ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مذکورہ بالا دلائل کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حدیث غدیر تواتر کے ساتھ ثابت ہے، اس کا اعتراف مکتب خلفاء کے اکابر علماء نے بھی کیا ہے اور اس کی دلالت بڑی واضح بھی ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس میں عیب و نقص کی بات کرتا ہے تو وہ یا تو کج فطرت ہے یا اس میں استعداد کا فقدان ہے یا معصیت پروردگار اور دشمنی اہل بیت کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے یا پھر ان مذکورہ تمام صفات کا حامل ہے ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی سزا وہی ہے جو آیات خداوندی اور اولیاء اللہ کو مذاق سمجھنے والے کی ہے۔

امیر المؤمنین علی بن ابی طالب اور ان کی معصوم اولاد کے بارے میں بہت زیادہ تعداد میں آیات موجود ہیں جن کا مفصل تذکرہ اسی خطبہ میں ہوگا جہاں پر امیر المؤمنینؑ کے شوریٰ کے موقع پر احتجاج کے سلسلے میں ان کو بیان کیا جائے گا۔ اس مقام پر ہم نے مزید آیات کے ذکر سے پہلو تہی دو وجوہات کی بنا پر کی ہے۔

۱۔ طوالت کا خوف کہ کہیں کتاب میں طوالت نہ ہو جائے۔ اس بات کا اندیشہ کہ کتاب کی تکمیل تک زندگی وفا نہ کرے۔ البتہ اگر اس بارے میں کسی کو تفصیلی معلومات کی ضرورت ہے تو اسے چاہئے کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی ہمارے علماء کی کتب کا مطالعہ کرے جن میں سے چند ایک کی نشاندہی ہم کئے دیتے ہیں، مثلاً: علامہ حلیؒ کی کتاب "کشف الحق"، سید ہاشم بحرانی کی کتاب "غایۃ المرام" وغیرہ (اس بارے میں سید نور اللہ شوستری کی کتاب "احقاق الحق" میر سید حامد حسین کی کتاب "عبقات الانوار" علامہ امینی کی کتاب "الغدیر" بھی مفید ثابت ہوں گی۔ از مترجم)

اس قدر آیات پر اکتفا کرتے ہوئے اب ہم ان روایات کو پیش کریں گے جو امیر المؤمنینؑ کی امامت اور خلافت بلا فصل پر دلالت کرتی ہیں، ملاحظہ فرمایئے:

دوسری قسم: احادیث نبوی

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی امامت اور خلافت بلا فصل پر سنت نبویہ اور اخبار و روایات اس قدر زیادہ ہیں جن کا شمار مشکل ہے البتہ ہمارے علماء نے انہیں جمع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی انہیں مکمل جمع نہیں کر سکے، اس مقام پر ہم تو صرف چند ایک

احادیث نبوی ہی کو بیان کریں گے اس لئے کہ زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔

۱۔ وہ متواتر حدیث غدیر ہے جسے ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ حضرت رسول خدا، علی علیہ السلام سے فرماتے ہیں: "اَنْتَ اَخِيْ وَوَصِيِّيْ وَخَلِيْفَتِيْ مِنْ بَعْدِيْ وَقَاضِيْ دِيْنِيْ" تم میرے بھائی، میرے وصی، میرے بعد میرے خلیفہ اور میرے قرض ادا کرنے والے ہو۔

حدیث مذکور پر اعتراضات

کتاب "تجرید" میں اس حدیث کو حضرت علیؑ کی خلافت بلافصل کی دلیل قرار دیا گیا ہے لیکن اس کتاب کے بعض شارحین _یعنی شارح قوشجی_ نے اس پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ: "اجماع کے مقابلے میں یہ خبر واحد ہے اگر صحیح ہوتی تو صحابہ کرام، تابعین، ماہرین فن اور محدثین خصوصاً حضرت علیؑ اور ان کی اولاد طاہرین پر پوشیدہ نہ ہوتی، اگر بالفرض اسے تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس سے صرف حضرت علیؑ کی خلافت ثابت ہوگی دوسروں کی خلافت کی نفی نہیں ہوگی"۔ اسی طرح ایک اور شارح _راغب_ نے کہا ہے کہ: "اس سے پیغمبرؐ کی مراد ان کی وصیت اور مدینے میں آنحضرتؐ کی جانشینی ہے قرضے کی ادائیگی اور وعدے پورے کرنے کے بارے میں بھی یہی احتمال ہے، جسے خلافت کے وجوب کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا"۔

جواب: ۱۔ معترض کا یہ کہنا کہ "یہ روایت اجماع کے مقابلے میں خبر واحد کی حیثیت رکھتی ہے" قابل قبول نہیں ہے کیونکہ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ اس کے مقابلے میں اجماع صحیح نہیں ہے۔ انشاء اللہ، البتہ یہ کہنا کہ "اگر یہ خبر صحیح ہوتی تو صحابہ کرام سے پوشیدہ نہ ہوتی، خاص کر حضرت علیؑ اور ان کی اولاد طاہرین پر" تو اس بارے میں عرض ہے کہ یہ ایک ایسی روایت ہے جو علیؑ اور ان کی اولاد پر جو روساء صحابہ تھے، ہرگز مخفی نہیں تھی اور انہوں نے اسے اور اس جیسی دوسری روایات سے ایک سے زیادہ مواقع پر تمسک کیا ہے اور اپنے حق میں پیش بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی روایات واخبار میں اس کی تصریح بھی کی ہے۔

۲۔ رہا سوال دوسرے لوگوں کا، تو جن لوگوں نے نور الٰہی کے خاموش کرنے اور خلافت الہیہ کے ہتھیانے پر ایکا کر لیا ہو تو وہ اس کا کیونکر اظہار کر سکتے تھے، البتہ یہ ان سے بھی مخفی نہیں تھی، مگر انہوں نے اسے عمداً چھپائے رکھا۔ اس لئے کہ اس کے اظہار سے ان کے مفادات پر زد پڑتی تھی اور مقصد ضائع ہوتا تھا۔

۳۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ "اگر اس روایت کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس سے صرف حضرت علیؑ ہی کی خلافت ثابت ہوتی ہے دوسروں کی خلافت کی نفی نہیں ہوتی تو اس طرح سے اگر وہ یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس سے صرف حضرت علیؑ کی خلافت ثابت ہوتی ہے دوسروں کی خلافت کی نفی نہیں ہوتی، پھر بھی ہمارے لئے کافی ہے، کہ چلو علیؑ کی خلافت کو تسلیم تو کر لیا، باقی رہی دوسروں کی خلافت کی نفی کی بات تو اس کے بارے میں بھی آگے چل کر بتایا جائے گا کہ دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ اس بات پر قائم ہیں کہ علیؑ کے ہوتے ہوئے وہ اس کے مستحق نہیں تھے۔ (یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حدیث شریف میں موجود لفظ "بَعْدِيْ" غیروں کی خلافت کی نفی کر رہا ہے، کیونکہ لفظ "بعدی" ما ظہور علیؑ کی خلافت کے بارے میں ہے اس لئے کہ یہ لفظ "وضع"

کے لحاظ سے اگرچہ "بالفصل" اور "بلا فصل" دونوں طرح کے "بعد" کا حامل ہے لیکن عرفی نقطہ نظر سے "بلا فصل بعد" کا حامل ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ "میرے بعد یہ مال فقراء کیلئے ہے" تو ذہن کا فوری تبادر اسی بات کی طاف جاتا ہے کہ کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ "میرے مرنے کے فوراً بعد ایسا کیا جائے" یعنی یہ مال کسی اور کو نہ دیا جائے بلکہ صرف اور صرف فقراء کا حق ہے، اسے حقیقت عرفیہ کہتے ہیں۔ یا مثلاً مؤرخین لکھتے ہیں کہ "فلاں شخص، فلاں کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا" تو اس سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کا جانشین ہوا نا کہ دو تین اشخاص کے بعد: از مترجم عفی عنہ)

۴۔ معترضین کا یہ کہنا کہ "وصیت اور خلافت" کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ یہ مدینہ ہی میں وصیت اور خلافت کے متعلق ہے" صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی ظاہر کے خلاف ہے، اس لئے کہ لفظ کا ظاہر غیر مقید اور غیر مشروط ہے جس سے دلیل کے بغیر روگردانی نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ اس بارے میں دلیل موجود نہیں ہے لہذا ماننا پڑے گا کہ "وصیت اور خلافت مطلقہ" مراد ہے، اس لئے کہ متعلق کا حذف کر دینا اس کے عام ہونے کی دلیل ہوتا ہے بلکہ حضورؐ کا "مِنْ بَعْدِيْ" فرمانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس سے صرف مدینہ کی خلافت مراد نہیں ہے۔

جس طرح معترض کا یہ اعتراض غلط اور احتمال باطل ہے اسی طرح یہ مفروضہ بھی بے مقصد اور باطل ہے کہ "آنحضرتؐ کی وصیت آپؐ کے قرض کی ادائیگی اور وعدوں کے پورا کرنے کے بارے میں تھی"۔ کیونکہ جس طرح پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ آنحضرتؐ کی وصیت اور خلافت بلا قید و شرط یعنی غیر مشروط اور عمومی، حتیٰ کہ قرضے کی ادائیگی یا وعدوں کے پورا کرنے سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور آنحضرتؐ کا "قَاضِيْ دَيْنِيْ" فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک علیحدہ اور مستقل حکم ہے۔ ورنہ حضورؐ بہتر انداز میں فرماتے "وَ وَصِيِّيْ فِيْ قَضَاءِ دَيْنِيْ" "اور میرے قرضے ادا کرنے میں میرے وصی ہو"۔ یہ بھی ہم نے معترض کے جواب کیلئے فرض کیا ہے ورنہ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ بوقت وفات حضور سرور کائناتؐ کے ذمہ کوئی قرضہ نہیں تھا کہ جس کے متعلق آپؐ اس کی ادائیگی کی وصیت فرماتے۔ جیسا کہ روایات میں ہے کہ آپؐ نے مرض الموت کے ایام میں لوگوں کو بلا کر سب سے اپنے اپنے حقوق کے طلب کرنے کو کہا، اس پر کسی نے بھی کوئی دعویٰ پیش نہیں کیا سوائے اس ساربان کے جس نے حضورؐ کی پشت اقدس کی زیارت کی غرض سے کوڑے مارنے کا دعویٰ کیا تھا اور حضرتؐ کے پشت سے کپڑا ہٹانے کے بعد اس نے پشت مبارک پر بوسہ دیا اور اپنے دعوے کا مقصد بھی صرف یہی بیان کیا تھا۔

ہمارے اس نظریئے کے بعد اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر "قَاضِيْ دَيْنِيْ" کا کیا مطلب ہے؟ جواباً عرض ہے یہ ہے کہ ظاہراً یہ کلمہ "دِيْنِيْ" دال کے زبر کے ساتھ نہیں بلکہ دال کے زیر کے ساتھ ہے، جس کے معنی ہیں "میرے دین کے قاضی" جس طرح کہ محقق طوسیؒ نے اپنی کتاب "تجرید" میں اسی بات کی تصریح کی ہے اور ایسی صورت میں یہ ہمارے مدعا کیلئے ایک اور دلیل ہوگی۔ کیونکہ امور دینی کے حاکم کیلئے ضروری ہے کہ وہ "معصوم خلیفہ" ہو۔

۵۔ شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۱ ـ جسے خطبہ قاصعہ کہتے ہیں ـ کی شرح میں حضرت امام جعفر صادقؑ کا ایک ارشاد درج کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "اعلان رسالت سے پہلے حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ ایک روشنی دیکھتے اور

آواز سنتے تھے، اسی بنا پر سرکار رسالتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: "اگر میں خاتم الانبیاء۔ آخری نبی۔ نہ ہوتا تو تم میرے شریک رسالت ہوتے، اب تم اگرچہ نبی نہیں ہو لیکن نبی کے وصی اور وارث ضرور ہو، یہی نہیں بلکہ "سید الاوصیاء" اور "امام الاتقیاء" ہو"۔

۶۔ شارح معتزلی ہی نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں طبریؒ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس حضرت علیؑ کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: "جب آیہ "وَ اَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الاَقْرَبِينَ" (شعراء / ۲۱۴) اے پیغمبرؐ! اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ نازل ہوئی تو........... "سلسلہ گفتگو یہاں تک پہنچا کہ علیؑ فرماتے ہیں کہ: "آنحضرتؐ نے آنے والے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اے فرزندان عبدالمطلب! خدا کی قسم! میں نہیں جانتا کہ عرب کا کوئی جوان اپنی قوم کے پاس اس سے بہتر لایا ہو جو میں لایا ہوں، میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں، اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو اسی کی طرف بلاؤں، تو تم میں سے کون ایسا شخص ہے جو اس بارے میں میرا بوجھ اٹھائے اور میرا ہاتھ بٹائے؟ تو وہ شخص میرا بھائی، میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہو؟" یہ سن کر سب پیچھے ہٹ گئے اور میں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "میں ہوں! اگرچہ میں بالکل ہی نوجوان ہوں، میری آنکھیں بھی دکھتی ہیں، شکم بھی بھاری ہے اور پنڈلیاں بھی باریک ہیں تو اے اللہ کے رسولؐ! میں ہی اس معاملے میں آپ کا وزیر بن کر آپ کا بوجھ اٹھاؤں گا اور ہاتھ بٹاؤں گا" اس پر آنحضرتؐ نے اپنی بات کو پھر دہرایا، لیکن وہ سب خاموش رہے، مگر میں نے اپنی بات کو پھر دہرایا۔ یہ سن کر آنجنابؐ نے میری گردن پر ہاتھ رکھ کر ان لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: "یہی میرا بھائی ہے، میرا وصی ہے اور تم لوگوں میں میرا خلیفہ ہے، لہٰذا تم لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی بات کو بھی سنو اور اس کا کہنا بھی مانو!" یہ سن کر سب لوگ ہنستے ہوئے کھڑے ہو گئے اور۔ میرے والد۔ ابوطالبؑ سے کہنے لگے، محمدؐ نے تمہیں بھی حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی باتوں کو بھی سنو اور اس کا کہنا بھی مانو!"۔ اس روایت میں علی بن ابی طالبؑ کی خلافت بلافصل کیلئے کئی مخفی گوشوں سے پردے اٹھتے ہیں لیکن اس شخص کیلئے جس کا دل نور ولایت سے روشن ہو اور یا جو حضور قلب کے ساتھ بات سنتا ہو، اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔ اس مرحلے پر سب سے زیادہ تعجب تو شارح معتزلی پر ہوتا ہے کہ ان سے دلالت کے یہ گوشے کیسے مخفی رہے، جس سے وہ ہدایت پانے سے محروم رہے!!

۷۔ ابن ابی الحدید ہی نے اسی مقام پر ایک اور روایت کو ذکر کیا ہے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ کی وہ حدیث ہے جس کی روایت پر تمام اسلامی فرقوں کا اجماع ہے۔ اور حدیث یہ ہے کہ آنحضرتؐ علیؑ سے فرماتے ہیں: "اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسىٰ اِلَّاۤ اَنَّهٗ لَانَبِيَّ بَعْدِيْ" علیؑ! تمہیں مجھ سے وہی نسبت اور منزلت حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی لیکن بات یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی ہے۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے اس حدیث میں حضرت علیؑ کیلئے وہ تمام مراتب و منازل بیان فرمادیئے جو ہارون کو موسیٰ کی نسبت سے حاصل تھے۔ اسی لئے حضرت علیؑ رسول خداؐ کے وزیر تھے اور آپ کا ہاتھ بٹا کر اور بوجھ اٹھا کر آپؐ کی کمر مضبوط کی۔ اگر آنحضرتؐ کے بعد باب نبوت بند نہ ہو گیا ہوتا تو وہ آپؐ کے اس معاملے میں شریک کار بھی ہوتے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ سرکار رسالتؐ نے حضرت علی علیہ السلام کیلئے تمام وہ مراتب ثابت کر دیئے جو سوائے نبوت کے باقی تمام مراتب موسیٰ کی نسبت ہارون کو حاصل تھے، چونکہ نبوت آنحضرتؐ پر ختم ہو چکی تھی لہٰذا حضرت امیرؑ اس سے مستثنیٰ قرار پائے

اور دوسرے تمام اعزازات اور مناصب و مراتب کے مستحق ٹھہرے، چنانچہ ان مراتب میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ اس پر قرآن کی نص موجود ہے کہ حضرت موسیٰ نے ہارون سے فرمایا "اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ" میری قوم میں میرے خلیفہ بنے رہو۔ اس لحاظ سے حضرت ہارون کے ان کی زندگی ہی میں خلیفہ تھے، اگر زندہ رہتے تو ان کی وفات کے بعد بھی خلیفہ ہوتے۔ لیکن ہارون زندہ نہ رہے اور علیؑ بعد از وفات پیغمبرؐ زندہ رہے، لہٰذا آپؑ کی رحلت کے بعد ان کے خلیفہ قرار پائیں گے، اس لحاظ سے آپؑ کی خلافت مسلم ہے۔

اس حدیث پر قوشجی کا اعتراض

شرح تجرید میں قوشجی کہتے ہیں کہ: "اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث متواتر نہیں بلکہ اجماع کے مقابلے میں خبر واحد ہے۔ اور تمام مراتب و مناصب کو شامل نہیں ہے، بلکہ جب اس مفرد کو عَلَم (نام) کی طرف مضاف کر دیا جائے تو اس سے مراد اطلاق اور عموم ہوتا ہے، جسے دوسرے لفظوں میں "معہود معین" کہا جاتا ہے۔ جیسے کہا جائے "غلامُ زید" زید کا غلام۔ اور یہاں پر استثناء مذکور کے ذریعے کچھ مراتب کو چھوڑ کر کچھ کو نکال دیا جائے گا جیسے نبوت کے سوا باقی تمام مناصب و مراتب کو شامل ہے، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہاں پر استثناء منقطع ہے جو "لکِن" کے معنی میں ہے، لہٰذا اس کی عمومی دلالت نہیں ہوگی، مثلاً حضرت ہارونؑ جناب موسیٰؑ کے حقیقی بھائی تھے، جبکہ حضرت علیؑ جناب رسول خداؐ کے حقیقی بھائی نہیں تھے۔

ہاں البتہ یہاں پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہاں پر استثناء، نفی کے ظہور پر دلالت کر رہا ہے کہ اگر اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اس کی دلالت عمومی اور مطلق ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہارون کے مراتب میں سے "خلافت" اور نیابت کی حیثیت سے امور میں تصرف کا حق حاصل نہیں تھا جو امامت کا متقاضی ہے، کیونکہ ہارون حضرت موسیٰ کی نبوت میں شریک ہیں اور حضرت موسیٰ کا ان سے "اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ" کہنے کا مقصد، "خلافت" تھوڑی تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ قومی امور میں لوگوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں اور اسی بات کیلئے ان کی تاکید اور مبالغہ تھا۔ اور اگر خلافت ہی کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی ان کی وفات کے بعد وہ باقی نہیں رہی تھی اور اس کی بقا پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اور خلیفہ بننے والے کی موت سے اس میں نہ کسی قسم کا نقص پیدا ہو جاتا ہے اور نہ ہی اسے عہدے سے معزول سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے اس سے بھی کامل ترین حالت کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے اور وہ ہے مستقل نبوت اور خدا کی طرف سے تبلیغ کا فریضہ۔ اسی لئے اگر حضرت ہارون، موسیٰ کے بعد زندہ رہ جاتے تو وہ ان کی نبوت کی وجہ سے ہوتا، جب کہ علیؑ اس منصب کے حامل نہیں تھے۔ اگر حامل ہوتے تو عہدہ خلافت کے بھی حقدار تھے، چونکہ ایسا نہیں تھا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس سے اصحاب ثلاثہ کی امامت اور خلافت کی نفی نہیں ہوتی۔

اور اب ان کا جواب

معترض کے اس قسم کے اشکالات اور اعتراضات کا کئی طرح سے جواب دیا جا سکتا ہے:

۱۔ معترض موصوف نے اس خبر یعنی روایت کے تواتر کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ انکار اس قابل ہے کہ اس کی طرف توجہ ہی نہ

دی جائے کیونکہ آپ ابھی معلوم کر چکے ہیں کہ شارح معتزلی نے اس بارے میں کہا ہے کہ اس حدیث پر تمام اسلامی فرقوں کا اجماع ہے اور سید بحرانی نے اپنی کتاب "غایۃ المرام" میں مکتب خلفاء کے ایک سو اور مکتب اہل بیت کے ستر ذرائع سے اسے روایت کیا ہے۔

۲۔ یہ بات مسلم ہے کہ جب وضعی طور پر مفرد کسی علَم کی طرف مضاف ہو تو عموم کا فائدہ نہیں دیتا، لیکن اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ جب استثناء کا قرینہ موجود ہو اور حکمت کی دلیل بھی پائی جاتی ہو تو پھر خصوص کا فائدہ تو دے گا۔ اس کو قدرے تفصیل سے یوں بیان کرتے ہیں کہ: اگر ہم منزلت کو بعض امور پر حمل کرتے ہیں اور بعض پر حمل نہیں کرتے تو وہ بعض معین امور ہوں گے یا مبہم ہوں گے۔ معین امور تو نہیں ہو سکتے اس لئے مبہم ہی ہوں گے۔ اس لئے کہ لفظ کسی تعیین پر دلالت نہیں کر رہا۔ اور مبہم بھی نہیں ہو سکتے کیوں کہ اس میں اجمال پایا جاتا ہے اور فائدہ حاصل نہیں ہو رہا۔ جیسا کہ علمائے اصول کہتے ہیں کہ مفرد پر جب الف لام ہو تو وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے، جیسے قرآن میں ہے "أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ"۔

۳۔ استثناء میں اصل "اتصال" ہوتا ہے، یعنی مستثنیٰ متصل ہوتا ہے اور "اِلّا" کو "لٰکِنْ" کے معنی میں لینا ظاہر کے خلاف ہے

۴۔ حضرت موسیٰ کا ہارون کو فرمانا: "اُخْلُفْنِي فِي قَوْمِي" کے معنی ہیں کہ "تم لوگوں میں میرے خلیفہ بنو" جیسا کہ تفسیر کشاف میں اسی چیز کی صراحت کی گئی ہے۔ اسی بنا پر حضرت ہارون کا لوگوں میں تصرف موسیٰ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہوگا۔ بعینہ اسی طرح جیسے خود حضرت موسیٰ بذات خود پیغمبر ہونے کی حیثیت سے ان میں تصرف کرتے تھے۔ لہذا اگر چہ علیؑ خود پیغمبر نہیں تھے لیکن ان کے تصرفات پیغمبرؐ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہوں گے۔

۵۔ اس اعتراض کے جواب کیلئے ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کے بعد اگر حضرت ہارونؑ زندہ رہتے تو وہ نیابت اور خلافت کی حیثیت سے تصرف نہ کرتے بلکہ ممکن ہے کہ مستقل نبوت ان کو مل جاتی جو کہ موسیٰ کی نیابت اور خلافت سے اعلیٰ اور اکمل درجے کا مرتبہ ہوتا، یہ حضرت ہارونؑ کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے لیکن حضرت علیؑ کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ان کیلئے نبوت تو ممکن ہی نہیں تھی، لہذا ان کا تصرف بحیثیت پیغمبرؐ کے نائب اور جانشین کے ہوگا جس طرح کہ ان کی زندگی میں وہ اسی عہدہ جلیلہ کے حامل تھے، لہذا منزلت کے عمومی حکم کے مطابق آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی وہی سلسلہ جاری رہے گا۔

اگر ایسا تسلیم نہ کیا جائے تو پھر لازم آئے گا کہ آپؑ کو معزول کر دیا گیا اور آپؑ میں نقص پیدا ہو گیا جس سے دنیا کے لوگ تنفر ہونے لگیں گے، اس لئے کہ صاحب تصرف ہونا ایک نہایت ہی جلیل القدر عہدہ ہے اور جس کیلئے یہ ثابت ہو جائے اسے اس سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اور خود معترض کے قول کے مطابق کہ اگر ہارونؑ کے پاس عہدہ نبوت نہ ہوتا تو نیابت اور خلافت سے ہٹایا جانا ان کیلئے نقص تھا، مگر عہدہ نبوت اس نقص کی تلافی کر دیتا لیکن چونکہ حضرت علیؑ کے پاس عہدہ نبوت نہیں تھا نہ ہی یہ بات ممکن تھی لہذا ماننا پڑے گا کہ خلافت ان کے پاس رہے تا کہ اس کمی کی تلافی ہو جائے۔

۶۔ معترض نے کوشش کی ہے کہ کسی طرح علیؑ کی خلافت کی نفی کر کے ثلاثہ کی خلافت کو برحق ثابت کیا جائے، لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، کیونکہ جس طرح ابھی بیان کیا جا چکا ہے کہ روایت مذکورہ حضرت علیؑ کی منزلت کے عمومی ہونے پر دلالت کر رہی ہے اور حضرت ہارونؑ کی مجملہ منزلتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ موسیٰؑ کے زندہ رہنے کی صورت میں صاحب تدبیر و تصرف اور

نافذالحکم ہوتے اور امت پر موسیٰؑ کے نائب اور ان کے جانشین کی حیثیت سے ان ہی کے اختیارات استعمال کرتے، بعینہ یہی صورت حال علی بن ابی طالبؑ کی پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد تھی کہ مسلم امہ وفات پیغمبرؐ کے بعد علی بن ابی طالبؑ کے تصرف میں آگئی جس طرح اگر موسیٰؑ کی وفات کے بعد ہارونؑ زندہ ہوتے۔ بقول معترض۔ توامت موسیٰؑ، ہارونؑ کے تصرف میں آجاتی جب پیغمبر اکرمؐ کی رحلت جانگداز کے بعد ہی فوراً مسلم امہ جانشین پیغمبرؐ، علیؑ کی تصرف میں آگئی تو پھر ثلاثہ کو امامت اور نیابت رسولؐ کا حق کہاں سے مل گیا؟ اس کی مزید تفصیلات بڑی وضاحت کے ساتھ انشاء اللہ خطبہ نمبر ۱۹۱ کی آٹھویں فصل میں بیان ہوں گی۔ یہاں پر ہم زید شہید فرزند امام زین العابدینؑ کا بارگاہ امیر المؤمنین میں منظوم نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں جو انہوں نے حدیث منزلت کو پیش نظر رکھ کر پیش کیا ہے، فرماتے ہیں؛

مَنْ شَرُفَ الاَقْوَامَ يَوْمًا بِرَايِهِ ‏ فَاِنَّ عَلِيًّا شَرَّفَتْهُ الْمَنَاقِبُ

وَ قَوْلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ الْحَقُّ قَوْلُهٗ ‏ وَ اِنْ رُغِمَتْ مِنْهُ اُنُوْفُ الْكَوَاذِبِ

بِاَنَّكَ مِنِّيْ يَا عَلِيُّ مُعَالِنًا ‏ كَهَارُوْنَ مِنْ مُّوْسىٰ اَخٌ لِيْ وَ صَاحِبٌ

کچھ لوگ تو وہ ہیں جو اپنے خیالوں کے مطابق قوموں پر شرف اور برتری حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، لیکن علیؑ وہ ہیں جنہیں ان کے فضائل و مناقبت نے برتری اور شرف دیا ہے۔ اور پیغمبرؐ کے فرمان نے بھی جو برحق ہے خواہ اس سے جھوٹے لوگوں کی ناک ہی کیوں نہ رگڑی جائیں اور ان کو ذلت و رسوائی ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ پیغمبرؐ نے ان کے بارے میں فرمایا اور وہ بھی ببانگ دہل کہ اے علیؑ تم میرے ویسے ہی بھائی اور ہمدم ہو جیسے موسیٰؑ کیلئے ہارونؑ تھے

ایک مرتبہ پھر فضائل علیؑ

غایۃ المرام میں ابن مغازلی شافعی سے اسناد کے ساتھ جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: "خداوند سبحانہ نے نور کا ایک ٹکڑا اتارا اور اسے آدمؑ کی صلب میں ٹھہرایا، یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، یہاں تک کہ اللہ نے اس کے دو حصے کئے ایک حصے کو عبداللہ کی صلب میں اور دوسرے کو ابو طالبؑ کی صلب میں قرار دیا، وہاں سے اس نے مجھے نبی بنا کر اور علیؑ کو وصی بنا کر دنیا میں بھیجا"۔

۲۔ غایۃ المرام ہی میں ہے کہ: مکتب خلفاء کے بہت بڑے عالم ابن شیرویہ دیلمی نے اپنی کتاب "فردوس الاخبار" باب "خاء" میں اسناد کے ساتھ سلمان فارسیؓ سے روایت کی ہے، سلمانؓ کہتے ہیں کہ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدمؑ سے چار ہزار سال قبل مجھے اور علیؑ کو ایک ہی نور سے پیدا کیا، جب آدمؑ کو خلق فرمایا تو اس نور کو آدمؑ کی صلب میں قرار دیا، ہم باہم منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ عبدالمطلبؑ کی صلب سے آکر جدا ہوئے، مجھ میں نبوت ہے اور علیؑ میں خلافت ہے"۔

۳۔ کتاب "کشف الحق" میں اہل سنت کے چاروں مذاہب کے نزدیک حجت عالم دین "امام ابوبکر احمد بن مردویہ" کی کتاب "المناقب" سے منقول ہے کہ اسناد کے ساتھ حضرت ابوذر غفاریؓ روایت فرماتے ہیں کہ: "ہم حضرت رسول خداؐ کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور عرض کیا" تمام صحابہ" میں سے آپؐ کے نزدیک محبوب ترین شخصیت کون سی ہے ؟ کہ اگر وہ امر کرے تو ہم اس کے ساتھ ہوں اور اگر آپ کا نائب ہو تو ہم اس کے پیچھے چلیں!" اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: "وہ علیؑ ہے، جو تم میں سب سے میری تابعداری اور اسلام کے لحاظ سے مقدم ہے!"۔

یہ حدیث واضح طور پر علی بن ابی طالبؑ کی فضیلت پر دلالت کر رہی ہے، نیز اس امر کی نشاندہی کر رہی ہے کہ حضرت رسالت مآب آپؑ سے زبردست محبت فرماتے تھے یہی چیز آپؑ کے امامت اور خلافت بلافصل پر دلیل ہے۔

ایک ناصبی کا اعتراض

اس حدیث پر ایک ناصبی _ فضل بن روزبہان _ نے یہ اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ: "بے شک یہ حدیث آپؑ کی فضیلت اور آپؑ سے رسول خداؐ کی شدید محبت پر تو دلالت کرتی ہے لیکن آپؑ کی امارت _ امامت و خلافت _ پر دلیل نہیں ہے۔ اگر حضرت رسول خداؐ آپؑ کی خلافت پر نص قائم فرماتے تو صاف اور سیدھے لفظوں میں کہہ دیتے، کیونکہ یہ اس کے اظہار کا موقع تھا جو کہ ظاہر ہے، لیکن چونکہ انہوں نے نہیں فرمایا کہ "وہ میرے بعد امیر ہیں" تو معلوم ہوا کہ آپؑ کی خلافت و امارت پر نص نہیں ہے، تو پھر اس سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب

اس کا جواب _ قاضی سید نور اللہ شوستری کی طرف سے _ یوں دیا گیا ہے کہ: "کسی مرادی معنی پر نص جس طرح فقط لفظ کے مدلول کی دلالت کے ساتھ ہوتی ہے اسی طرح ان واضح قرینوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے جو مرادی معنی کی مخالفت کے احتمالات کی نفی کر دیتے ہیں۔ اور جس سلسلے میں ہماری گفتگو ہو رہی ہے وہ اسی قسم ہی سے ہے، کیونکہ سائل کا یہ کہنا کہ "اگر وہ امر کرے تو ہم اس کے ساتھ ہوں، اور اگر آپ کا نائب ہو تو ہم اس کے پیچھے چلیں!" اس پر آنحضرتؐ کا فرمانا: "وہ علیؑ ہے جو تم سب سے میری تابعداری اور اسلام کے لحاظ سے مقدم ہے" اس بات پر نص ہے کہ اس سے آنجنابؐ کی مراد "خلافت" ہے۔ کیونکہ آپ کا یہ فرمانا کہ: "وہ تم سب سے مقدم ہے" گویا حضرت علیؑ کا تمام امت سے مقدم ہونا ہی ان کی خلافت کی اہلیت کی دلیل ہے۔ معترض کا یہ کہنا کہ: "اگر رسول اللہؐ حضرت علیؑ کی خلافت پر نص قائم فرماتے تو صاف اور سیدھے لفظوں میں کہہ دیتے" کہ وہ میرے بعد تمہارے امیر ہیں!" لیکن اگر آنحضرتؐ یونہی فرماتے پھر بھی معترض بے راہ روی کا شکار ہو کر کہتا: "امارت بھی حضرت علیؑ کی خلافت کی صریح نص نہیں ہے، کیونکہ یہ لفظیا تو فوج کی کمانداری پر دلالت کرتا ہے یا پھر کچھ لوگوں کو چھوڑ کر بعض دوسرے افراد کی امارت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے انصار نے کہا تھا کہ: "مِنَّا الاَمِیرُ وَمِنکُمُ الاَمِیرُ" "ایک امیر ہم سے ہو اور ایک امیر تم _ مہاجرین _ سے ہو (گویا ادھر تم ادھر ہم کا نعرہ لگایا تھا)۔

بہر صورت معترض کی قلابازیاں اور مختلف پینترے اس کے کسی کام نہیں آ سکتے خواہ اس پر توریت و انجیل کی تلاوت ہی کیوں نہ کی جائے۔

۴۔ اسی کتاب میں ابن مغازلی شافعی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے کہ اسناد کے ساتھ رسول پاکؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "ہر نبی کا ایک وصی اور وارث ہوتا ہے، میرا وصی اور وارث علی بن ابی طالبؑ ہے"۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ وصایت، خلافت کے علاوہ ہے تو قابل تسلیم بات نہیں ہے، کیونکہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "ہر نبی کا ایک وصی اور وارث ہوتا ہے" تو اس سے مراد نبوت کی وصایت ہے، ورنہ حضرت یہ فرماتے "ہر ایک کیلئے ایک وصی اور وراث ہوتا ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ امر نبوت میں وصی ہونے کا دوسرا نام خلافت ہی تو ہے، اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ آگے چل کر بیان ہو گی۔

۵۔ مسند امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ سلمان فارسیؓ نے حضرت رسول اللہؐ سے پوچھا: "یارسول اللہؐ! آپؐ کا وصی کون ہے؟" فرمایا: "سلمانؓ! میرے بھائی موسیٰ علیہ اسلام کا وصی کون تھا؟" کہا: "یوشع بن نون" فرمایا: "میرا وصی میرا وارث، میرے دین کا قاضی اور میرے وعدے پورے کرنے والا، علی بن ابی طالبؑ ہے!"۔

فضل بن روزبہان کا اشکال

اس حدیث پر فضل بن روزبہان ناصبی نے ان الفاظ کے ساتھ اشکال کیا ہے کہ "وصی کا لفظ بسا اوقات ایسے شخص کیلئے بولا جاتا ہے جسے علم، ہدایت، قوانین شرعیہ کی حفاظت اور علم و معرفت کی تبلیغ کی ہدایت کی جائے۔ اگر آنحضرتؐ کے وصی سے بھی یہی معنی مراد ہیں تو ہم تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ حضرت علیؑ وصی رسولؐ تھے اور یہ ہے بھی مسلم بات! لیکن اگر اس سے مراد خلافت ہے تو، جیسا کہ ہم عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ اس بارے میں خلافت علیؑ کیلئے کوئی نص موجود نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی نص جلی ہوتی تو صحابہ کرام ہرگز اس کی مخالفت نہ کرتے۔ اگر کرتے بھی تو فوج ان کی اطاعت نہ کرتی اور عام عرب ان کا کہنا نہ مانتے خاص کر انصاری"۔

اس کا جواب

مذکورہ بالا اشکال کا کئی طرح سے جواب حاضر ہے:

الف: وصی سے اگر پہلا معنی ہی مراد لیا جائے جیسا کہ معترض نے خود بھی اسے تسلیم کیا ہے، تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے اور اس کیلئے مزید دلیل دینے کی ضرورت بھی نہیں رہتی، اس لئے کہ خلیفہ بھی تو وہی ہوتا ہے جو محافظ قوانین دین اور حامی شریعت سید المرسلینؐ ہو اور معرفت و یقین کی طرف مسلم امہ کو ہدایت کرے، اور اس معنی کے لحاظ سے معترض کے ممدوح کس حد تک متصف تھے؟ یہ تو اسی بات سے اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ "اب" اور "کلالہ" کے لفظی معانی سے بھی بے خبر تھے۔ چہ جائیکہ کتاب و سنت کے معانی سے باخبر ہوں یا ان کے احکام سے واقفیت ہو کہ جس کی وجہ سے امت کی ہدایت کا فریضہ سرانجام دیا جا سکتا ہے۔

ب: پیغمبر خداؐ کا علیؑ کو یوشع بن نونؑ کے ساتھ تشبیہ دینا، اس بات کی دلیل ہے کہ علیؑ، آپؐ کے خلیفہ تھے۔ اس لئے کہ حضرت موسیٰ کے بعد حضرت یوشعؑ ہی ان کے خلیفہ تھے۔ جیسا کہ بہت سے علماء مثلاً شہرستانی وغیرہ نے اس بات کی صراحت کی ہے، جب انہوں نے یہودیوں کے حالات کا تذکرہ کیا ہے تو اس دوران کہا کہ "امر نبوت حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت

ہارونؑ کے درمیان مشترک تھا کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی تھی کہ "وَ اَشْرِكْهُ فِي اَمْرِي" خدایا! اسے تو میرے کار رسالت میں شریک کردے۔ چنانچہ وہ آپؑ کے وصی قرار پائے، جب حضرت موسیٰ کی زندگی میں ہی ان کی وفات ہوگئی تو وصایت کا منصب حضرت یوشعؑ کی طرف منتقل ہوگیا اور یہ منصب ان کے پاس امانت تھا تاکہ اسے حضرت ہارونؑ کے دو فرزندوں یعنی "شبر" اور "شبیر" کی طرف منتقل کردیں۔

ج: اگر یہ حدیث، علی بن ابی طالبؑ کی خلافت پر نص نہیں تو پھر آپ ہی کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کردیں جو ان کی خلافت کی نفی کر رہی ہو۔ رہا معترض کا یہ کہنا کہ: "اگر کوئی نص جلی ہوتی تو صحابہ کرام اس کی ہرگز مخالفت نہ کرتے"۔ جواباً عرض ہے کہ نص جلی تو تھی، اسی لئے تو جن صحابہ کے دل نور ایمان و عرفان سے مزین تھے انہوں نے مخالفت ہی نہیں کی بلکہ علیؑ کو امام و مقتدا اور پیشوا و راہنما مانا، مرتے دم تک ان کی اتباع بھی کرتے رہے اور اسی حالت میں اپنے رب کی بارگاہ میں جا حاضر ہوئے۔

رہے دوسرے لوگ کہ جن کا مطمح نظر ہی روز اول سے نور الٰہی کو بجھانا اور آیات خداوندی کو چھپانا تھا تو انہوں نے ان کے بجھانے اور چھپانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ "اسلام کے سرخرو اور سرافراز لشکر" کی علیؑ مظلوم کے ساتھ اس لئے دشمنی تھی اور ان کے دلوں میں کینے اور غیظ و غضب کے سمندر اس لئے ٹھاٹھیں مار رہے تھے کہ علیؑ نے راہ خدا اور پیغمبرؐ کے ہمراہ ان کے اعزاء و اقارب، بھائی بندوں بیٹوں، عزیزوں اور دوستوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوا تھا۔ قریش کا کوئی خاندان ایسا نہیں تھا جس کا خون علی ولی کی گردن پر نہ ہو کہ جسے علیؑ نے راہ خدا میں نہ بہایا ہو اس کا اعتراف تو بہت سے مؤرخین اور محدثین کو بھی ہے، جن میں سے خود معترض مذکور اور اس کے جیسے دوسرے لوگ مثلاً شارح معتزلی وغیرہ بھی ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ انسان کی فطرت میں ہے اس شخص کے متعلق دشمنی جس نے اس کے کسی عزیز یا قوم کے کسی فرد کو قتل کیا ہو۔ اور فطری طور پر اس کی اس کے قاتل سے دشمنی ہونی بھی چاہئے اور مقدور بھر اس کے مقاصد کے آڑے بھی انہیں آنا چاہئے، چنانچہ علیؑ کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

۶۔ "حدیث ثقلین" ایک مشہور ترین حدیث اور خبر متواتر ہے، اور فریقین کے درمیان اسی صفت سے موصوف ہے جسے کتاب "غایۃ المرام" نے مکتب خلفاء کے ۳۹ اور مکتب اہل بیتؑ کے ۸۲ ذرائع سے نقل کیا گیا ہے، چنانچہ ان ذرائع میں سے ایک امام احمد بن حنبل بھی ہیں جنہوں نے ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان وہ کچھ چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہوگے اور وہ ہیں "ثقلین" یعنی دو ایسی بھاری چیزیں جن میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے جو ایک رسی کی صورت میں آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے اور دوسرے میری عترت یعنی میرے اہل بیت ہیں"۔

یہ اور اس قسم کی دوسری بہت سی احادیث و اخبار جو حد و حساب سے باہر ہیں پیغمبر خداؐ کے بعد علیؑ کی امامت اور ان کی خلافت بلا فصل کیلئے نص کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہاں پر صرف اس قدر احادیث کے لکھنے کی گنجائش تھی، دیگر اخبار و روایات انشاء اللہ العزیز کتاب ہذا کے مناسب مقامات پر درج کی جائیں گی۔ خدا ہی توفیق عطا کرنے والا اور معاون و مددگار ہے۔

دوسرا مقصد

علیؑ کی امامت پر عقلی دلائل

امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی امامت و خلافت بلا فصل پر بہت سے عقلی دلائل ہیں جن میں سے چند ایک کو ذیل میں ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں :

۱۔ امام کیلئے معصوم ہونا ضروری ہے اور علیؑ کے سوا کوئی بھی شخص معصوم نہیں تھا، لہذا ماننا پڑے گا کہ علی بن ابی طالبؑ ہی امام ہیں۔ وہ یوں کہ مکتب اہل بیتؑ اور مکتب خلفاء کے ماننے والوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ امام کو معصوم ہونا چاہئے، اور عصمتِ امام قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت "اَطِیْعُوْا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" کی رو سے واجب ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اولی الامر کی اطاعت مطلقاً یعنی غیر مشروط اور بلا قید و شرط واجب ہے، اگر اولی الامر معصوم نہ ہوں تو ہر وقت ان سے غلطی اور گناہ کے ارتکاب کا احتمال و امکان رہتا ہے، اب ایسی صورت میں کہ گناہ کا امکان ہو تو اس کی اطاعت واجب ہو گی یا نافرمانی! اگر اطاعت واجب ہو گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا ہمیں قبیح فعل کے ارتکاب کا حکم دے رہا ہے یعنی گناہگار ولی امر کی اتباع کریں، حالانکہ ایسا محال ہے کیونکہ خدا کبھی فعل قبیح کے ارتکاب کا حکم نہیں دیتا۔

اب رہی دوسری صورت کہ ہم ولی امر کے حکم کو نہ مانیں، تو یہ اس آیت کے حکم کی خلاف ورزی ہو گی، کیونکہ آیت تو ولی امر کی اطاعت کا حکم دیتی ہے اور اطاعت ولی امر کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ اس کے حکم کے مطابق احکام و حدود الہیہ کا اجرا ہوتا ہے۔ لوگوں کو واجب کی ادائیگی اور حرام سے بچنے کا حکم دیا جاتا ہے، ظالم سے مظلوم کیلئے حق رسی کی جاتی ہے، ظالم کو ظلم سے روکا جاتا ہے۔ لیکن اگر خود امام انہی امراض کا شکار ہو تو پھر اسے سیدھا کرنے کیلئے ایک اور امام کی ضرورت ہو گی، اگر وہ بھی اسی طرح کا "چور امام" ہو تو پھر کسی اور امام کی تلاش کی جائے گی غرض ایک ایسا سلسلہ وجود میں آجائے گا جو قیامت تک ختم نہیں ہو پائے گا۔ اصطلاح میں اسے "تسلسل" کہتے ہیں جو باطل اور محال ہے، لہذا ماننا پڑے گا کہ امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ البتہ خطبہ ۱۹۱ کی شرح میں "عصمت امام" کے اور بھی دلائل تفصیل کے ساتھ ذکر کیے جائیں گے۔

۲۔ امام کا منصوص ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ بالاجماع علیؑ کے سوا کوئی اور شخص منصوص نہیں تھا، لہذا ماننا پڑے گا کہ آپؑ ہی امام اور خلیفہ بلا فصل ہیں۔ ہم نے امام کیلئے منصوص ہونے کی شرط اس لئے لگائی ہے کیونکہ عصمت کا تعلق مخفی امور سے ہوتا ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور پیغمبرؐ کی سیرت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ امام معصوم ہو۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ اپنی امت کیلئے اس ماں سے بھی زیادہ مہربان ہوتا ہے جو اپنے بچے کیلئے ہوتی ہے۔ اس لئے تو پیغمبرؐ نے اپنی امت کو ہر چیز سے آگاہ کر دیا ہے جسے اس کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً مسجد میں کیسے داخل ہوں؟ وہاں سے کس طرح باہر نکلیں؟ حتی کہ دیات تک بتا دیا ہے کہ خراش کی کیا دیت ہوتی ہے۔ جب آنحضرتؐ نے اس قدر چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں سب کچھ تو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہو لیکن جس پر دین کا دارومدار ہو،

جو دین کا ستون ہو، جس کے بغیر دین پائیدار اور استوار نہ رہ سکتا ہو جو تمام واجبات سے اہم ہو اور جو تمام اہم امور سے واجب تر ہو اس کے متعلق ذکر تک نہ کریں اور یہ تک نہ بتائیں کہ میرے بعد اس امر کو کون سنبھالے گا؟!

اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاء اللہ خطبہ ۱۶۱ کی شرح میں "نص کے وجوب و لزوم" کے عنوان سے نقیب ابو جعفر بصری کا مدلل کلام ذکر کیا جائے گا جسے شارح معتزلی نے بھی نقل کیا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو وہاں رجوع کیا جائے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے دین کی تکمیل اور نعمتوں کے مکمل ہو جانے کی خبر دی ہے۔ اور واضح سی بات ہے کہ امامت ہی کی وجہ سے دین کی تکمیل ہوئی ہے اور نعمتیں مکمل ہوئی ہیں جو یہ عقیدہ نہیں رکھتا تو وہ کتاب خدا کی تردید کرتا ہے اور خدا کی کتاب کی تردید کرنے والا کون ہوتا ہے؟ اس دلیل کی مزید وضاحت کافی کی وہ روایت ہے جو سابقہ خطبہ کی آخری فصل میں حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ آلاف التحیۃ والثناء کی زبان حق ترجمان سے بیان ہو چکی ہے جو بے بہا دُروں اور یاقوتوں کی پروئی ہوئی لڑی اور عظمت کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔

۳۔ امام کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی رعیت سے افضل ہو اور اس دور میں علیؑ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو رعیت سے افضل ہو۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ علیؑ ہی امام و بلا فصل خلیفہ ہیں۔

امام افضل کیوں ہو؟

اس لئے کہ اگر افضل نہیں ہو گا، پھر یا تو ان سب کے برابر ہو گا یا دوسرے افضل ہوں گے اور وہ خود ان سے کم تر یا بالفاظ دیگر "مفضول" ہو گا، اگر برابر ہو اور اسے امام بنا دیا جائے تو بھی غلط ہو گا کیونکہ کسی خصوصیت کے بغیر اسے ساری کائنات کا امام بنا دیا جائے، آیا اس سے حق و انصاف کا خون نہیں ہو گا؟ لہٰذا ایسا کرنا ناممکن! اور اگر مفضول ہو لیکن اسے "فاضل" اس سے برتر پر ترجیح دے کر فاضل کا امام بنا دیا جائے، تو پڑ جائیں گے نا مسلمانوں کی عقل پر پٹے، کہلائیں گے نا دیوانے؟ کہ افضل کی موجودگی میں ایرے غیرے کو امام بنا دیا اس لئے کہ اس طرح سے کئی خرابیاں لازم آئیں گی مثلاً:

الف: عقل کہتی ہے کہ فاضل کو آگے بڑھاؤ، بے عقل کہتے ہیں نہ! بڈھوں کو امام بناؤ!

ب: فاضل کی تعظیم لازم ہوتی ہے۔ مفضول کسی کھاتے میں شمار نہیں ہوتا۔

ج: بے عقلوں کے کہنے سے مفضول کو آگے بڑھانے سے فاضل کی توہین ہوتی ہے جسے نہ تو خدا پسند کرتا ہے اور نہ اس کا رسولؐ اور نہ ہی صاحبان عقل و خرد۔

د: اس طرح سے مفضول کا مرتبہ بلند اور فاضل کے مرتبے کو پست کر دیا جاتا ہے جو خدا اور رسولؐ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے یہ ایک ایسی صورت حال ہے جسے ایک عام آدمی بھی پسند نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اسے خواص قبول کریں، آپ اپنی عقل کو منصف قرار دے کر بتائیں کہ فقہ کے ایک عام آدمی اور ابتدائی طالب علم کو حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباس پر ترجیح دی جا سکتی ہے؟ اسی چیز کا انکار تو قرآن کے نص کی صورت میں کر دیا ہے کہ خدا فرماتا ہے: "اَفَمَنْ يَّهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ

لَّا يَهِدِّيٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ "(یونس / ۳۵) جو حق کی راہنمائی کرتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کی اتباع کی جائے یا وہ شخص جو دوسرے کی ہدایت تو در کنار خود جب تک دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے دیکھ نہیں پاتا؟ تو تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟

اسی طرح فرماتا ہے: "هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ" (زمر / ۹) کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟ اس کی سوچ سمجھ تو بس صاحبان عقل ہی رکھتے ہیں۔ علی بن ابی طالبؑ کے سوا اور کوئی افضل تھا بھی نہیں، جسے ہمارا مخالف بھی تسلیم کرتا ہے، یعنی شارح معتزلی کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؑ سے بڑھ کر کوئی افضل نہیں تھا۔ اور ہماری اس تمہید کا عمدہ مقصود بھی شارح موصوف کی منطق کو باطل کرنا ہے، جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ شارح نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ علیؑ، ثلاثہ سے افضل تھے اور بقول ان کے: "رہی ہماری یہ بات کہ ان چاروں میں سے کون افضل ہے تو ہمارا موقف بھی وہی ہے جو ہمارے بغدادی علماء نے اختیار کیا ہے، یعنی علیؑ ان سب سے افضل ہیں، اور ہم نے اپنی علم کلام کی کتابوں میں "افضل کے معنی بھی بیان کر دیئے ہیں کہ آیا افضل سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثواب زیادہ ہے یا تمام فضائل حمیدہ کا مالک ہے؟ تو ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ دونوں معانی کے لحاظ سے آپؑ افضل ہیں، اس پر مزید گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ کتاب علم کلام کے مباحث کی متحمل نہیں ہے، جو کچھ ہم نے یہاں پر بیان کر دیا ہے اسے ہی کافی سمجھا جائے"۔

<u>قول مصنف</u>: شارح موصوف یعنی معتزلی اس گفتگو کو آگے بڑھانے کی زحمت گوارا نہیں فرما رہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ گفتگو کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے تاکہ ہمارے مقصود کی مزید وضاحت ہو اور امیر المؤمنینؑ کے تھوڑے سے فضائل و مناقب کا تذکرہ ہو جائے تاکہ ناصبیوں اور خارجیوں کی ناک کو رگڑا جا سکے۔ اس لئے کہ علی بن ابی طالبؑ کے مکمل فضائل و مناقب کا احصاء و شمار مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے، جیسا کہ مکتب خلفاء کے سربر آوردہ عالم اخطب خوارزمی اپنی کتاب میں اسناد کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے

۱۔ فرمایا: "لَوْ اَنَّ الرِّيَاضَ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرَ مِدَادٌ وَالْجِنَّ حُسَّابٌ وَالْاِنْسَ كُتَّابٌ مَا اَحْصَوْا فَضَائِلَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ" اگر تمام باغات قلم بن جائیں، تمام سمندر روشنائی بن جائیں، تمام جن حساب کرنے والے اور تمام انسان لکھنے والے بن جائیں پھر بھی علی بن ابی طالبؑ کے فضائل کو شمار نہ کر سکیں۔

۲۔ اسی طرح کی ایک اور روایت مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں سے بیان ہوئی ہے کہ شیخ صدوق امالی میں اسناد کے ساتھ سعید بن جبیر سے روایت کرتے ہیں، سعید کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس کے پاس آکر کہا: "اے رسول پاکؐ کے چچیرے بھائی! میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں تاکہ علیؑ کے بارے میں پوچھوں اور یہ سبب دریافت کروں کہ لوگ ان کے بارے میں اختلاف کیوں کرتے ہیں؟" تو ابن عباسؓ نے فرمایا: "تم میرے پاس ایسے شخص کے بارے میں پوچھنے کیلئے آئے ہو جو محمدؐ کے بعد امت محمدؐ سے سب سے افضل ہے، تم مجھ سے رسول خداؐ کے وصی، وزیر، خلیفہ، حوض کے مالک، علمبردار اور شافع امت کے بارے میں

پوچھتے ہو؟ _ تو اے سعید یاد رکھو _ فرزند عباس کی جان جس کے قبضہ قدرت میں ہے اس کی قسم اگر دنیا بھر کے تمام دریا روشنائی بن جائیں، دنیا بھر کے درخت قلم ہو جائیں، تمام روئے زمین والے لکھنے لگ جائیں اور جب سے اللہ نے دنیا کو خلق کیا ہے اس سے لے کر جب اللہ دنیا کو ختم کر دے گا، اس تمام عرصے کیلئے لکھنے لگیں تو بھی وہ علیؑ کو خدا کے عطا کردہ فضائل کا دسواں حصہ بھی نہیں پائیں گے" تو جس شخص کے بارے میں رسول خداؐ اور عبداللہ بن عباسؓ اس قسم کے خیالات کا اظہار کریں تو آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اس کے تمام فضائل و مناقب کا ادراک کیونکر ہو سکتا ہے؟ ہاں البتہ "مَالَمْ يُدْرَكْ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ" اگر سب کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا تو سب کچھ کو چھوڑ بھی نہیں دینا چاہئے، اور "اَلْمَيْسُوْرُ لَا يُسْقَطُ بِالْمَعْسُوْرِ" "مشکل کی وجہ سے آسان ساقط نہیں ہو جاتا کے مصداق، جتنا اپنے بس میں ہے بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ ثابت کیا جائے کہ ہم آپؑ کو کسی وجہ کے بغیر امام اور خلیفہ بلافصل نہیں مانتے بلکہ آپؑ میں وہ فضائل پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے آپؑ افضل الناس، امام الحق، وصی رسولؐ اور آپؐ کے بلافصل خلیفہ ہیں، ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے کہ مفضول کو فاضل پر اور مرجوح کو راجح پر فضیلت عبث ہے، فضول ہے، قبیح ہے اور بیکار ہے جو ذات پروردگار کے قطعاً شایان شان نہیں ہے بلکہ مکتب خلفاء کا شاخسانہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ تمام امت محمدیہؐ سے ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق سے تین وجوہات کی بنا پر افضل ہیں:

۱۔ ثواب کی کثرت کی وجہ سے، ۲۔ خصال حمیدہ کے جامع ہونے کی وجہ سے اور ۳۔ ذاتی کمالات اور نفسانی فضائل کی بنا پر۔

ثواب کی کثرت کی وجہ سے اس لئے کہ ظاہر سی بات ہے کہ ثواب کا تعلق عبادت سے ہوتا ہے اور عبادت کی قلت و کثرت کی بنا پر ہی ثواب کی مقدار قلیل اور کثیر ہوتی رہتی ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ آپؑ تمام لوگوں سے زیادہ عبادت گزار تھے اس لئے لوگ آپؑ کو "اَعْبَدُ النَّاسِ" کہتے تھے، اس مناسبت سے ثواب اکثر حد تک ہوگا۔ ان سب باتوں کے قطع نظر بالفرض اگر آپؑ کی اور کوئی بھی عبادت پیش نظر نہ رکھی جائے سوائے خندق کے دن عمرو بن عبدود کی ضربت کے، تو بھی ہمارے، مدعا اور مقصود کے کیلئے کافی ہے آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ: "ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ" _ علیؑ کی خندق کے دن کی وار "ثقلین" کی عبادت سے افضل ہے _ اس سے آپؑ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ صرف ایک وار ثقلین کی عبادت سے افضل قرار پا رہی ہے تو زندگی بھر کی باقی عبادات کی عظمت کیا ہوگی؟ جسے نہ تو لکھنے والے لکھ سکتے ہیں نہ جمع کرنے والے جمع کر سکتے ہیں اور نہ ہی قدر کتابیں ہیں کہ ان میں ان سب کو قلمبند کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں آپؑ کے خصال حمیدہ اور فضائل مجیدہ کی توصیف کی تو نہ حد ہے اور نہ حساب، یا اسے علم ہے جس نے یہ عطا کی ہیں یا وہ جانتا ہے جسے دینے والے نے مطلع کیا ہے۔ اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

۴۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام "سابق الاسلام" ہیں۔ جس کا آپؑ نے تفصیل کے ساتھ خطبہ ۳۷ میں تذکرہ کیا ہے، جس کے اول میں ہے کہ "اَتَرَانِيْ اَكْذِبُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ لَاَنَا اَوَّلُ مَنْ صَدَّقَهٗ......" اسی طرح خطبہ ۵۶ میں فرماتے ہیں: "فَاِنِّيْ وُلِدْتُ عَلَى الْفِطْرَةِ وَ سَبَقْتُ اِلَى الْاِيْمَانِ وَ الْفِطْرَةِ ......" ان تمام باتوں کی تفصیل و تحقیق انشاء اللہ العزیز اپنے مقامات پر بیان ہوگی۔ امیر المؤمنینؑ کی یہ وہ فضیلت ہے جس کا اعتراف خود حضرت ابوبکر نے بھی کیا ہے جیسا کہ "ابوذرعہ دمشقی" اور "ابو اسحٰق ثعلبی" اپنی اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ "حضرت ابوبکر بڑے افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ

افسوس ہے اس گھڑی پر جس میں علیؑ مجھ سے اسلام میں سبقت لے گئے۔ اگر اس وقت میں اسلام لے آتا تو میں ہی "سابق الاسلام" کہلاتا"۔ مناقب ابن شہر آشوب میں "انساب الصحابہ" اور وہ تاریخ طبری اور معارف ابن قتیبہ سے نقل کرتے ہیں کہ: "سب سے پہلے حضرت خدیجہ اسلام لائیں ان کے بعد حضرت علیؑ پھر زید اور ان سب کے بعد حضرت ابو بکر"۔ یعقوب نسوی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ حضرت حسن زید کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر چوتھی جگہ پر اسلام لائے اور تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت عمر پینتالیس مردوں اور اکیس عورتوں کے بعد اسلام لائے۔ چنانچہ امیر المؤمنین علیؑ کی سبقت فی الاسلام کے سلسلے میں بہت سے شعراء مثلاً سید حمیری اور دوسرے بہت سے حضرات نے حضرت امیرؑ کی خدمت میں منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہاں پر جس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

۵۔ آپؑ کی پانچویں فضیلت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے ساتھ سب سے پہلے آپؑ نے نماز پڑھی۔ اس کی تفصیلی داستان توانشاء اللہ خطبہ کی تشریح میں مذکور ہوگی البتہ یہاں پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مکتب خلفاء کے مؤرخین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے، مثلاً کتاب "المناقب" میں مرزبانی سے روایت ہے وہ کلبی سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو صالح سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ آیت "وَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ" (بقرہ / ۸۲) یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال بجالائے، یہی لوگ بہشتی ہیں اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ خصوصاً حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ علیؑ ہی پہلے مؤمن ہیں اور پیغمبرؐ کے بعد سب سے پہلے پیغمبرؐ کے ساتھ مل کر نماز پڑھی ہے۔ اسی کتاب ہی میں ہے کہ "سدی" ابی مالک سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت: "وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ" (واقعہ / ۱۰) جو سبقت لے جانے والے ہیں وہ سبقت لے جانے والے ہی تھے، یہی لوگ مقرب بارگاہ ہیں۔ حضرت علیؑ کی شان میں اتری ہے کیونکہ اس امت کے سابق وہی ہیں۔ اسی طرح المناقب ہی میں ہے جسے ابو بکر شیرازی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے وہ مالک بن انس سے روایت کرتے ہیں وہ سدی سے وہ ابو صالح سے اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے، اس لئے کہ علیؑ:

ا۔ سب لوگوں میں سے ایمان میں سبقت لے چکے ہیں۔

ب۔ رسولؐ کے ساتھ دونوں قبلوں _ بیت المقدس اور خانہ کعبہ _ کی طرف نماز پڑھ چکے ہیں۔

ج۔ رسولؐ کے ہاتھ پر دو مرتبہ بیعت _ بدر و رضوان _ کر چکے ہیں۔

د۔ دو دفعہ ہجرت _ ایک دفعہ حضرت جعفر کے ساتھ مکہ سے حبشہ اور دوسری دفعہ حبشہ سے مدینہ _ کر چکے ہیں۔ (اسی سلسلے میں سید حمیری امیرؑ کی ذات کو منظوم نذرانہ عقیدت بھی پیش کیا ہے، خدا انہیں جزائے خیر دے۔ از مترجم)

۶۔ سب سے پہلے آپؑ نے رسول پاک کی بیعت کی۔ چنانچہ کتاب "المناقب" میں ابن جبیر سے روایت ہے جب یہ آیت: "وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" (شعراء / ۲۱۴) اے پیغمبرؐ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ نازل ہوئی تو حضرت رسول اکرمؐ نے بنی ہاشم کے چالیس لوگوں کو دعوت دے کر بلایا اور حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ بکری کی ایک ران کا گوشت اور تین سیر آٹا کی روٹیاں تیار

کی جائیں اور ایک پیالہ دودھ سے مہمانوں کی تواضع کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور دس دس آدمیوں کی ٹولی کی صورت میں مہمانوں نے کھانا کھایا اور سب سیر ہو گئے۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک آدمی چار پانچ سالہ اونٹ یا بکری ایک وقت کے کھانے میں اور ایک ایک مشکیزہ پانی کا پی جاتا تھا۔

ایک روایت میں مقاتل سے مروی ہے کہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ : آنحضرتؐ نے فرمایا "تم لوگوں نے یہ آیت سن لی ہے اور اس کے بارے میں جانتے بھی ہو"۔ ایک اور روایت کے مطابق براء بن عازب اور ابن عباس کہتے ہیں کہ : "یہ سن کر ابو لہب سامعین کو گمراہ کرنے کیلئے سب سے پہلے کہنے لگا" اس شخص نے تم پر جادو کیا ہے" یہ سن کر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا" میں سیاہ، سفید اور سرخ غرض ہر قسم کے لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اپنے قبیلے کے قریبی ترین افراد کو ڈراؤ، میں اللہ کی طرف سے تمہارے لئے کوئی اختیار نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ تم صرف یہی کہو" لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اس پر ابو لہب نے کہا: "کیا تو نے ہمیں اس لئے دعوت دی ہے ؟" اس کے بعد سب لوگ منتشر ہو گئے۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی : "تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ" (لہب /۱) پھر آنحضرتؐ نے دوسری مرتبہ دعوت کا اہتمام کیا اور انہیں خوب کھلایا پلایا، اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: "اے اولاد عبد المطلب! تم میری اطاعت کرو کہ تم ہی نے زمین کا بادشاہ اور حکمران بننا ہے۔ اور اللہ نے جس نبی کو بھی بھیجا ہے، اس کیلئے بھائی، وصی اور وزیر مقرر فرمایا ہے، تو تم میں سے کون شخص میرا بھائی، وزیر، وصی، وارث اور میرے دین کا قاضی یا میرے قرضے ادا کرنے والا بننا چاہتا ہے ؟" طبری کی روایت کے مطابق ابن جبیر کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "تم میں سے کون ہے جو میرا اس بارے میں بوجھ اٹھائے کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہو ؟" اس پر ساری قوم نے انکار کر دیا۔ ابو بکر شیرازی کی روایت کے مطابق مقاتل بن ضحاک، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں اور "مسند عشرہ و فضائل الصحابہ" میں احمد سے، اسناد کے ساتھ ربیعہ بن ناجذ سے اور وہ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "تم میں سے کون شخص اس بات پر میری بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی اور میرا ساتھی (صحابی) بنے ؟" آنحضرتؐ کا یہ فرمان سن کر کوئی بھی حامی بھرنے کیلئے کھڑا نہ ہوا۔ اور اس وقت حضرت علیؑ بہت کم سن تھے۔ کھڑے ہو کر کہا" ...... میں حاضر ہوں!" جب انہوں نے تیسری مرتبہ ایسا کیا تو حضرت رسول خداؐ نے فرمایا: "بالکل ٹھیک" اور حضرت علیؑ کے ہاتھ پر ہاتھ بھی مارا"۔ تفسیر خرکوشی میں براء بن عازب سے روایت ہے کہ حضرت علیؑ اس وقت کمسن تھے اور کہا" ...... یارسول اللہ! میں حاضر ہوں!" یہ سن کر پیغمبر خداؐ نے فرمایا: "پس تم ہی ہو!" اسی وجہ سے حضرت علیؑ حضرت رسول خداؐ کے وصی ہیں، یہ سن کر سارے لوگ ابو طالب سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ : "اپنے بیٹے" کی اطاعت کرو کیونکہ محمدؐ نے اسے تم پر بھی امیر مقرر کیا ہے!"

علیؑ علم کے لحاظ سے بھی سب سے افضل تھے

رہی بات علم کی تو حضرت علیؑ تمام علوم کا سرچشمہ، مصدر، مورد، اور علم کی پناہ گاہ تھے۔ آپؑ ہی سے تمام دنیا نے علم حاصل کیا تمام علوم کو آپؑ کی ہی وجہ سے نشر و اشاعت ملی، اور آپؑ ہی اس میدان کے شہسوار تھے، تمام علوم و فنون میں ساری دنیا آپؑ کی شاگرد

اور طفل مکتب ہے۔ آپؑ علوم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور بحر زخار ہیں۔ خداوند عالم نے قرآن مجید اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "عسق"۔

چنانچہ صفوانی اپنی کتاب "اَلاَحسَنُ وَالمُحسِن" میں کلبی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو صالح اور وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس فرماتے ہیں: "حٓمٓ" خداوند تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اور "عٓسٓقٓ" کا مطلب ہے "عِلمُ عَلِيٍ سَبَقَ کُلَّ جَمَاعَةٍ" (علیؑ کا علم ہر جماعت سے سبقت لے گیا ہے)"۔ "وَ تَعَالیٰ عَلیٰ کُلِّ فِرقَةٍ" (اور ہر گروہ کے علم سے بالاتر ہے)۔ یہ اسی بات سے کنایہ ہے"۔ نیز خداوند عالم فرماتا ہے: "قُلْ کَفیٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْکِتٰبِ" (رعد / ۴۳) اے رسولؐ! آپؐ (ان سے) کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت) کی گواہی کے واسطے خدا اور وہ شخص جس کے پاس کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن شہر آشوب یوں فرماتے ہیں "محمد بن مسلم، ابو حمزہ ثمالی اور جابر بن یزید، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے اور علی بن فضال اور فضیل بن یسار حضرت امام جعفر صادقؑ سے، اور احمد بن محمد حلبی اور محمد بن فضیل حضرت امام رضا علیہ السلام سے، نیز حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے اور زید بن علی سے، محمد حنفیہ سے، سلمان فارسیؓ سے، ابو سعید خدریؓ سے اور سلمان سدیؓ سے روایت ہے جو کہتے ہیں کہ: "قُلْ کَفیٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَ بَيْنَکُمْ وَ مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْکِتَابِ" سے مراد "علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ "جب مذکورہ آیت کے ساتھ یہ آیت ملائی جائے: "وَلَارَطْبٍ وَّلَايَابِسٍ اِلَّا فِيْ کِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" (انعام / ۵۹) اور کوئی خشک وتر ایسا نہیں ہے جو (اس) روشن کتاب (قرآن مجید) میں نہ ہو۔ تو یہ بات پایہ تکمیل تک پہنچ چکی ہے کہ: علیؑ تمام علوم وفنون کے جامع ہیں۔ چنانچہ عونی اس بارے میں کہتے ہیں: "وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْکِتَابِ وَعِلْمُ مَا کَانَ وَمَايَکُوْنُ وَمَاقَدْ کَانَ عِلْمًا مُکْتَمًا" یعنی جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے اور علم "ماکان ومایکون" ہے اور جو علم مکتوم (مخفی) ہے۔ حضرت علیؑ کے علم کے بارے میں خود سرکار رسالتؐ نے بھی گواہی دی ہے اور فرمایا ہے "عَلِيٌّ عَيْبَةُ عِلْمِي"۔ علیؑ میرے علم کا ظرف ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ: "عَلِيٌّ اَعْلَمُکُمْ عِلْمًا وَاَقْدَمُکُمْ سِلْمًا"۔ علیؑ تم سب سے زیادہ عالم اور اسلام کے لحاظ سے تم سب سے سابق ہیں۔ نیز فرماتے ہیں "اَعْلَمُ اُمَّتِيْ مِنْ بَعْدِيْ عَلِيُّ بْنُ اَبِيْطَالِبٍؑ"۔ میرے بعد میری امت کا سب سے بڑا عالم علی بن ابی طالبؑ ہے۔ اسے کتاب "المناقب" میں علی بن ہاشم اور ابن شیرویہ دیلمی کی اسناد کے ساتھ روایت کیا گیا ہے، اور وہ دونوں حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کرتے ہیں۔

اسی طرح سرکار رسالتمآبؐ نے دوستوں اور دشمنوں کے بھرے مجمع میں ارشاد فرمایا: "اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَافَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَالْيَاتِ الْبَابَ"۔ میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں، لہذا جسے علم حاصل کرنا ہے تو اسے دروازے سے آنا چاہیے۔ اس حدیث کو "مناقب" میں احمد نے آٹھ ذرائع سے، ابراہیم ثقفی نے سات ذرائع سے، ابن بطہ نے چھ طریقوں سے، قاضی جعابی نے پانچ طریقوں سے ابن شاہین نے چار طریقوں سے، خطیب تاریخی نے تین ذرائع سے، یحییٰ بن معین نے دو ذرائع سے اور سمعانی، قاضی ماوردی، ابو منصور سکری، ابو صلت ہروی، عبدالرزاق اور شریک بھی ابن عباس، مجاہد اور جابر سے روایت کرتے ہیں۔

چنانچہ اس حدیث کے بارے میں شاعر نے کیا خوب ترجمانی کی ہے:

هٰذَا الاِمَامُ لَكُمْ بَعْدِيْ يُسَدِّدُكُمْ وَ يُوْسِعُكُمْ عِلْمًا وَّ آدَابَا
اِنِّيْ مَدِيْنَةُ عِلْمِ اللّٰهِ وَ هُوَ لَهَا بَابٌ فَمَنْ رَامَهَا فَلْيَقْصِدِ الْبَابَا

میرے بعد یہی علیؑ ہی تمہارا امام ہے جو تمہیں راہ راست پر چلائے گا اور تمہارے علم و ادب میں وسعت پیدا کرے گا۔ میں علم الٰہی کا شہر ہوں اور وہ اس کا دروازہ ہے، لہٰذا جسے علم کا حصول مقصود ہو اسے دروازے سے ہی آنا ہوگا۔

ابن شہر آشوب یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''یہ حدیث اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ کیونکہ سرکار رسالت مآبؐ نے اپنی ذات کو کنایہ کے طور پر علم کا شہر قرار دیا ہے اور یہ بھی واضح طور پر بتادیا ہے کہ علم تک اس وقت رسائی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک خصوصی طور پر علیؑ کی طرف رجوع نہ کیا جائے کیونکہ آنجنابؐ نے انہیں شہر کے ایسے دروازے سے تشبیہ دی ہے کہ صرف اسی کے ذریعے ہی شہر میں آمد و رفت رکھی جاتی ہے اور پھر حضورؐ نے ''فَلْیَاتِ الْبَابَ'' دروازے سے ہی آنا چاہئے کہہ کر واجب قرار دیا ہے کہ علیؑ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اس سے حضرت علیؑ کی عصمت بھی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ غیر معصوم سے فعل قبیح سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے اور پھر ایسی صورت میں غیر معصوم کی اقتداء بھی فعل قبیح کی اقتداء کے زمرے میں آئے گی، جس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ حضور سرور کائناتؐ نے خود ہی فعل قبیح کی اقتدا کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ یہ چیز ذات رسالت مآبؐ سے بالکل بعید ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ علیؑ معصوم امام ہیں اور ساتھ ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علیؑ ''اعلم امت'' سب امت سے زیادہ عالم ہیں''۔ اسی حدیث سے ملتی جلتی قرآن مجید کہ یہ آیت ہے کہ: ''وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا'' (بقرہ / ۸۹) لیکن نیکی اس کی ہے جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور تم لوگ گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ چنانچہ خطبہ اول کی چوتھی فصل میں اس آیت کی تشریح گزر چکی ہے اسی طرف رجوع کیا جائے۔ دوستوں اور دشمنوں نے یہ حدیث بھی آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کیلئے علم کے ایک ہزار دروازے کھولے اور علیؑ نے ہر دروازے سے پھر ہزار ہزار مزید دروازے کھولے۔ سید حمیری اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں؛

عَلِيٌّ اَمِيْرُ الْمُوْمِنِيْنَ اَخُوْ الْهُدٰى وَ اَفْضَلُ ذِيْ نَعْلٍ وَّ مَنْ كَانَ حَافِيَا
اَسَرَّ اِلَيْهِ اَحْمَدُ الْعِلْمَ جُمْلَةً وَ كَانَ لَهٗ دُوْنَ الْبَرِيَّةِ دَاعِيَا
وَ دُوْنَهٗ فِيْ مَجْلِسٍ مِنْهُ وَاحِدٍ بِاَلْفِ حَدِيْثٍ كُلُّهَا كَانَ هَادِيَا
وَ كُلَّ حَدِيْثٍ مِنْ اُوْلٰئِكَ فَاتِحٌ لَهٗ اَلْفَ بَابٍ فَاحْتَوَاهَا كَمَا هِيَا

یعنی علیؑ مؤمنوں کے امیر اور ہدایت کے ہم گام ہیں اور روئے زمین پر تمام چلنے والوں سے افضل ہیں خواہ کوئی جوتے پہن کر چلتا ہے یا برہنہ پا ہو کر۔ احمد مصطفیٰؐ نے آپؑ کو تمام علوم عطا فرمائے اور آپؑ کے حق میں خصوصی دعا بھی فرمائی۔ ایک ہی مجلس میں آپؑ کو ایک ہزار علوم عطا فرمائے جو سب کے سب ہدایت کرنے والے ہیں اور پھر انہوں نے ہر علم سے ہزار ہزار علوم کے دروازے کھولے اور جس طرح کوئی علم تھا اسی طرح علیؑ کے پاس موجود رہا

کتاب المناقب میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''علیؑ کے پاس وہی علم ہے جو آپؑ کو رسول خداؐ نے عطا فرمایا

تھا۔ اور رسول خداؐ کو اللہ نے علم عطا فرمایا تھا، لہذا پیغمبرؐ کا علم اللہ کا علم ہے اور علیؑ کا علم پیغمبرؐ کے علم سے ہے۔ میرا اور تمام اصحاب محمدؐ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے ایک قطرہ سات سمندروں کے مقابلے میں ہوتا ہے" ضحاک، ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "علم کے دس حصے ہیں جن میں سے نو حصے علیؑ کو عطا ہوئے ہیں اور وہ دسویں میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہیں اور اس میں ان سب سے اعلم ہیں"۔

حضرت عمر کو علیؑ کے علم کا اعتراف ہے

حضرت عمر کے اقوال اور ان کا علیؑ کے علم کے بارے میں اعتراف ایک نہیں کئی مقامات پر موجود ہے۔ چنانچہ خطیب اپنی کتاب "اربعین" میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا: "علم کے چھ حصے ہیں جن میں سے پانچ حصے تو علیؑ کے پاس ہیں اور صرف ایک حصہ دوسرے لوگوں کے پاس ہے۔ اس میں بھی وہ ہم سب کے شریک ہیں اور صرف شریک ہی نہیں ہم سب سے اعلم بھی ہیں"۔ ابانہ بن بطہ کہتے ہیں کہ: "جب حضرت عمر کو کوئی علمی مشکل پیش آجاتی تھی تو وہ علیؑ سے پوچھ لیتے تھے اور حضرت علیؑ ان کی مشکل کشائی فرماتے تھے تو اس وقت حضرت عمر کہتے تھے: "لَا اَبْقَانِيَ اللّٰهُ بَعْدَكَ" ۔ اللہ مجھے آپؑ کے بعد زندہ نہ رکھے۔"۔

تاریخ بلاذری میں ہے کہ حضرت عمر کہا کرتے تھے: "لَا اَبْقَانِيَ اللّٰهُ لِمُعْضِلَةٍ لَيْسَ لَهَا اَبُوالْحَسَنِ" ۔ اللہ مجھے کسی ایسے مشکل موقعہ کیلئے زندہ نہ رکھے جس کے دور کرنے کیلئے ابو الحسن (علیؑ) نہ ہوں۔"۔ مناقب میں ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علیؑ کی طرف تئیس مرتبہ رجوع کیا اور ہر مسئلہ پوچھنے کے بعد فرمایا: "لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" ۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔" اس بات کو بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے جن میں ابوبکر بن عیاش (یا ابن عیاش) اور ابو المظفر سمعانی بھی اس میں شامل ہیں۔ خطیب خوارزم اس بارے میں کہتے ہیں؛

اِذَا عُمَرٌ تَخَطَّأَ فِيْ جَوَابٍ وَ نَبَّهَهُ عَلِيٌّ بِالصَّوَابِ
يَقُوْلُ بَعْدُ لَهُ لَوْلَا عَلِيٌّ هَلَكْتُ هَلَكْتُ فِيْ ذَاكَ الْجَوَابِ

جب حضرت عمر کسی مسئلے کے جواب دینے میں غلطی کر جاتے تھے تو حضرت علیؑ انہیں صحیح مسئلہ سمجھا دیتے تھے اور وہ بھی انصاف سے کام لے کر کہہ دیا کرتے تھے کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو میں ہلاک ہی ہو گیا ہوتا"۔

یہ تو تھا حضرت علیؑ کے بارے میں حضرت عمر کا اظہار و اعتراف۔ اس کی مزید تفصیل کیلئے دوسرے خطبے کی چوتھی فصل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

اپنے علم کے بارے میں خود امیر المؤمنینؑ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے اس سے بھی ہمارے مذکورہ قول کی تائید ہوتی ہے کہ علمی میدان میں بھی آپؑ کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا، چنانچہ کتاب "التوحید" میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے امام جعفر صادق علیہ السلام ایک طولانی حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "میرے جد امجد حضرت علی علیہ السلام کے پاس اس قدر علم تھا کہ انہیں اس کیلئے حاملین کا ملنا دشوار ہو گیا تھا حتی کہ بعض اوقات تو ٹھنڈی سانس لے کر بر سر منبر کہتے تھے: "جو چاہو مجھ سے پوچھو!

کیونکہ میرے ان پہلوؤں کے اطراف میں بہت وسیع علم ہے، جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے، آہ! آہ! مجھے کوئی ایسا شخص نہیں مل رہا جو اس کا حامل قرار پائے"۔ اس سے بھی بڑھ کر آپ کا اسی تیسرے خطبے میں ایک جملہ ہے کہ "یَنحَدِرُ عَنِّي السَّیْلُ وَ لا یَرْقیٰ اِلَيَّ الطَّیْرُ" جو آپ کی وسعت علمی کی دلیل ہے۔

امیر المؤمنینؑ کے مکمل علمی احاطے کی دلیل آپؑ کا وہ دعویٰ ہے جو بار بار فرماتے رہے ہیں: "سَلُوْنِيْ سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِي" مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ۔ زمینی علوم پر آپؑ کو کس قدر قابو حاصل تھا؟ اس بارے میں آپؑ کے خطبہ ۹۲ سے اس کا پتہ چلتا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں: "فَاسْئَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ..... "جو چاہو مجھ سے پوچھ لو، کیونکہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم آج سے قیامت تک کے حالات کے بارے میں اور کسی گروہ کے کسی آیت کے ذریعہ گمراہ ہونے یا کسی آیت کے ذریعہ ہدایت پانے کے بارے میں جو کچھ بھی پوچھو گے تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ اس کا بلانے والا کون ہے؟ اس کا قائد اور سائیس کون ہے؟ اس کے اترنے کا مقام کہاں ہے؟ اس کا پڑاؤ کہاں ہے؟ ان میں سے کس کو طبعی موت آئے گی اور کون قتل ہوگا؟ سماوی علوم کے آپؑ کس قدر ماہر تھے اور کس حد تک آپؑ کو ان پر عبور حاصل تھا؟ تو اس بارے میں آپؑ زمینی علوم سے آسمانی علوم پر زیادہ دسترس رکھتے تھے، جیسا کہ خطبہ ۱۸۸ میں فرماتے ہیں: "اَیُّهَا النَّاسُ سَلُوْنِيْ قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِيْ فَلَاَنَا بِطُرُقِ السَّمَآءِ اَعْلَمُ مِنِّيْ بِطُرُقِ الْاَرْضِ" (لوگو! قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ مجھ سے جو چاہو پوچھ لو، کیونکہ میں زمین کے راستوں کی نسبت آسمانی راستوں سے زیادہ واقف ہوں) غیب کی خبروں کا آپؑ کو کس قدر علم تھا؟ اس بارے میں آپؑ کا وہ خطبہ شاید ناطق ہے جو مستقبل کی فتنہ سامانیوں کی نشاندہی کرتا ہے، اس بارے میں آپؑ کا بہت کچھ کلام موجود ہے مثلاً خطبہ ۵۶۔ انشاء اللہ اس کی تفصیل اسی خطبہ کی شرح میں بیان کی جائے گی۔ اسی طرح خطبہ ۹۲، خطبہ ۱۰۰ نیز خطبہ ۱۲۸ بھی غیب کی خبروں پر مشتمل ہیں بلکہ اس بارے میں خطبات کی تعداد تو بہت زیادہ ہے ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف انہی خطبات پر اکتفاء کرتے ہیں

علیؑ آسمانی کتابوں کے عالم تھے

حضرت علی بن ابی طالبؑ آسمانی کتابوں کے عالم تھے، چنانچہ کتاب "المناقب" میں ابن بختری سے چھ ذرائع سے، ابن مفضل سے دس ذرائع سے اور ابراہیم ثقفی سے چودہ ذرائع سے روایت کی گئی ہے کہ: "حضرت امیر المؤمنین علیؑ نے مہاجرین و انصار کے بھرے مجمع میں اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا: "یہ میرا سینہ علوم سے بھرا ہوا ہے، کاش کہ مجھے ان کا طلب کرنے والا مل جاتا، مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو قبل اس کے کہ مجھے نہ پاؤ! یہ پاکیزہ علم ہے، یہ رسول خداؐ کی لعاب ہے، یہ وہ علم ہے جو مجھے رسولؐ نے ایسے عطا کیا ہے جیسے پرندہ اپنے بچے کو دانہ بھراتا ہے، تم مجھ سے پوچھو کیونکہ میرے پاس اولین و آخرین کا علم ہے۔ خدا یاد رکھو! کہ اگر میرے لئے مسند بچھادی جائے اور میں اس پر بیٹھ کر فیصلے کروں تو اہل تورات کے درمیان ان کی کتاب توریت سے، اہل انجیل کے درمیان ان کی کتاب انجیل سے، اہل زبور کے درمیان ان کی کتاب زبور سے اور اہل قرآن کے درمیان ان کی کتاب قرآن سے فیصلے کروں اور ایسے فیصلے کروں کہ خود یہ کتابیں بآواز بلند کہہ اٹھیں کہ "علیؑ نے ہمارے متعلق خدائی فیصلے کئے ہیں"۔ ایک اور

روایت کے مطابق یہ ہے کہ "...... حتی کہ خدا توریت و انجیل ...... کو بلوائے ......"۔ دوسری روایت کے مطابق یہ ہے کہ "...... حتی کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک کتاب خوش ہو کر کہے "پروردگارا! علیؑ نے تیرے جیسا فیصلہ کیا ہے......" پھر فرمایا "مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو، قبل اس کے مجھے اپنے درمیان نہ پاؤ، مجھے اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ اور جانوں کو پیدا کیا ہے اگر تم مجھ سے ایک ایک آیت کے بارے میں سوال کرو گے تو میں بتاؤں گا کہ رات کو نازل ہوئی ہے یا دن کو، مکے میں اتری ہے یا مدینے میں، سفر میں اتری ہے یا حضر میں، ناسخ ہے یا منسوخ، محکم ہے یا متشابہ! اس کی تاویل کیا ہے اور تنزیل کیا ہے؟ میں سب کچھ بتاؤں گا......"۔

یہ ہے امیر المؤمنینؑ کی علمی جہات میں سے صرف ایک جہت جو اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اگر تفصیل سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں اور ہدایت کے طالب اور راہِ راست کے خواہاں ہیں تو سنئے:

قدرے تفصیل کے ساتھ

علم الہیات

علی بن ابی طالب علیہ السلام علم الہیات سے بخوبی واقف اور اس کے عالم تھے، جیسا کہ آپؑ کے ان مقدس خطبوں اس اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے جو حق تعالیٰ کی توحید، تحمید اور معرفت پر مشتمل ہے اور اس کے جلال کی صفات اور جمال کی تعریف پر مشتمل ہیں خصوصاً خطبہ ۹۰ جو کہ "خطبہ اشباح" کے نام سے مشہور ہے اور خطبہ ۱۸۵ پورے کا پورا خطبہ، خطبہ الہیات پر مشتمل ہے اور ایک جہایت ہی جامع خطبہ ہے۔ اس میں علم الہیات کے اصول پر گفتگو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ توحید کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

علم تفسیر و قرائت

جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ تفسیر کے علم کا علی سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں تھا۔ اور ساتھ ہی خطبہ اول کی ےاویں بحث میں اس بات پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ ہی شارح معتزلی کے تاثرات بھی اپنی جگہ پر اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "جب آپ تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا دعویٰ سچا ہے کہ علیؑ سے بڑھ کر کوئی شخص تفسیر قرآن کا عالم نہیں تھا۔ کیونکہ یہ علم اکثر آپ ہی سے یا عبد اللہ بن عباسؓ سے بیاں ہوا ہے۔ اور دنیا ابن عباسؓ کی حالت اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ ہمیشہ علیؑ کی خدمت میں رہتے اور ان کا زیادہ تر تعلق علی بن ابی طالبؑ ہی کے ساتھ رہا۔ آپؑ کے طفل مکتب اور مکتب علوی کے فارغ التحصیل ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے علم کو علیؑ کے علم سے کیا نسبت ہے؟ تو انہوں نے کہا: "وہی جو قطرے کو بحر او قیانوس سے ہوتی ہے"۔ حضرت ابن عباسؓ خود روایت فرماتے ہیں کہ: "امیر المؤمنین علیہ السلام نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی "باء" کی تفسیر رات کے آغاز کے ساتھ ہی بیان فرمانی شروع کی رات ختم ہو گئی لیکن تفسیر ختم نہیں ہوئی، اس پر علیؑ نے فرمایا "اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کر دوں"۔ کتاب فضائل عکبری میں ہے شعبی کہتے ہیں کہ: "پیغمبر اکرمؐ کے قرآن مجید کا علیؑ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں"۔ کتاب "المناقب" میں ہے کہ "قراء سبعہ" ـ سات قاری ـ علیؑ کی قرائت کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حمزہ اور کسائی کہتے ہیں کہ: "علیؑ کی قرائت کے مطابق ہماری قرائت ہے" ان دونوں کا مصحف ابن مسعود کے مصحف کی مانند نہیں ہے، بلکہ وہ قرائت کے معاملے میں حضرت علیؑ کی

طرف رجوع کرتے ہیں۔ صرف اعراب کے لحاظ سے وہ ابن مسعود کے ساتھ موافقت کرتے ہیں، جبکہ ابن مسعود کا اپنا قول یہ ہے کہ :"نافع ابن کثیر اور ابو عمرو کی اکثر وبیشتر قرائت کا دارومدار ابن عباسؓ کی قرائت پر ہے"۔ جبکہ ابن عباسؓ نے ابی بن کعب اور علی علیہ السلام سے قرائت سیکھی، اور مذکورہ تمام قاریوں کی قرائت ابی بن کعب کی قرائت سے مختلف ہے۔ لہٰذا قرائت کا سارا دارومدار علی علیہ السلام پر ہے اور وہ علیؑ کی قرائت سے ماخوذ ہے قاری عاصم نے ابی عبدالرحمٰن سلمی سے علم قرائت سیکھا، جبکہ ابو عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ :"میں نے سارا قرآن علی بن ابی طالبؑ سے پڑھا ہے"۔

قاریوں کا کہنا ہے کہ :"فصیح ترین قرائت عاصم کی ہے۔ کیونکہ وہ اس کی اصل کے مطابق قرائت کرتے ہیں اور وہ یوں کہ جن کلمات کو دوسرے قاری ادغام کرتے ہیں ان میں وہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں پر دوسرے قاری "لین" کا اظہار کرتے ہیں وہاں پر عاصم ہمزہ کو ثابت کرتے ہیں۔ جہاں پر دوسرے قاری "امالہ" کرتے ہیں وہاں پر عاصم ہمزہ کو فتحہ (زبر) کے ساتھ قرائت کرتے ہیں۔"

فقہ اور فروع دین کا علم

فقہ اور فروع دین کے علم میں بھی امیر المؤمنینؑ تمام فقہاء کا مرجع ہیں اور تمام فقہاء نے آپ ہی سے یہ علم حاصل کیا ہے، فقہاء امامیہ کا حال تو اظہر من الشمس ہے، مکتب خلفاء کے فقہاء کے متعلق ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں :"ہر مسلم فقیہ آپؑ_ علی بن ابی طالبؑ_ کا طفل مکتب ہے اور آپؑ کی فقہ سے کسب فیض کیا ہے۔ مثلاً امام محمد اور ابو یوسف، حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں، امام شافعی نے علی بن الحسن سے یہ علم حاصل کیا ہے اور وہ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے شاگرد ہیں، امام احمد بن حنبل نے امام شافعی سے یہ علم سیکھا ہے اور امام شافعی کی فقہ کا مرجع امام ابو حنیفہ ہیں۔ جبکہ امام ابو حنیفہ نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے کسب فیض کیا ہے۔ اور واضح سی بات ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے آباؤاجداد کے ذریعہ یہ علم حضرت علی بن ابی طالبؑ سے حاصل کیا ہے، کیونکہ اولاد علیؑ، علی بن ابی طالبؑ کی ہی شاگرد ہے۔ امام مالک بن انس نے ربیعہ سے علم فقہ حاصل کیا، ربیعہ نے عکرمہ سے عکرمہ نے عبداللہ بن عباس سے اور عبداللہ بن عباس نے علی بن ابی طالبؑ سے کسب فیض کیا ہے

<u>قول مصنف</u> : مکتب خلفاء کے فقہاء نے فقہی فروعات میں جن حق چیزوں کو بیان کیا ہے وہ امیر المؤمنینؑ یا ان کی معصوم اولاد حضرات ائمہ علیہم السلام سے حاصل شدہ ہیں، اور جو باطل چیزیں پیش کی ہیں وہ ان کے اپنے عقلی استحسان، باطل قیاس اور فاسد آراء کی پیداوار ہیں۔

کتاب "المناقب" میں ہے کہ :"تمام شہروں کے فقہاء آپؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آپؑ ہی کے تبحر علمی سے استفادہ کرتے ہیں، مثلاً اہل کوفہ اور ان کے فقہاء سفیان ثوری، حسن بن صالح بن حی، شریک بن عبداللہ اور ابن ابی لیلیٰ غرض اس قسم کے تمام فقہاء اگر فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو کہتے ہیں یہ علی بن ابی طالبؑ کے قول کے قرین قیاس ہے اور اپنے علمی ابواب کی ترجمانی اسی طرح کرتے ہیں۔ اہل بصرہ اور ان کے فقہاء حسن اور ابن سیرین ہیں، اور ان دونوں حضرات کا ماخذ علمی وہ لوگ ہیں جنہوں نے علی بن ابی طالبؑ سے اخذ علوم کیا ہے۔ جبکہ ابن سیرین بغیر کسی لگی لپٹی کے کہتے ہیں کہ میں نے علم، کوفیوں سے اور عبیدہ سمعانی سے حاصل کیا، اور عبیدہ سمعانی حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے مخصوص ترین افراد میں سے تھے۔ اہل مکہ کا ماخذ علمی یا تو عبداللہ بن

عباسؓ ہیں یا علی بن ابی طالبؑ جبکہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت علی بن ابی طالبؑ کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ اور آپؑ ہی کی ذات سے بڑی حد تک استفادہ علمی کیا تھا۔ اور اہل مدینہ کا علمی استفادہ تو امیر المؤمنین علیہ السلام سے ہوا ہے۔

شافعی نے ایک کتاب تحریر کی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اہل مدینہ حضرت علیؑ اور ابن عباس کی اتباع کرتے ہیں۔ محمد بن حسن فقیہ کہتے ہیں کہ: "اگر حضرت علیؑ نہ ہوتے ہمیں اہل بغاوت کے بارے میں معلوم ہی نہ ہوتا کہ ان کا کیا حکم ہے؟"

علم مناظرہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بد عتیوں کے ساتھ مناظرہ کرنے کی بنیاد سب سے پہلے علی بن ابی طالبؑ نے ہی رکھی ہے کہ انہیں راہ راست پر لانے کیلئے ان سے مجادلہ کیا اور قرآن مجید کے "تناقضات" کے بارے میں ملحدین اور زندیقوں کے ساتھ مناظرہ کیا اور ان کے سوالوں کے بڑی متانت کے ساتھ جواب عطا فرمائے۔ اور جاثلیق (لاٹ پادری) کے مشکل ترین سوالات کے جوابات عطا فرمائے جس سے وہ مسلمان ہو گیا اور راس الجالوت۔ یہودیوں کے عالم۔ نے جب آپؑ پر اعتراض کیا کہ: "تمہارے پیغمبر کو ابھی تیس برس ہی گزرے تھے کہ تم نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نکال لیں" اس پر آپؑ نے فرمایا: "تمہاری کیفیت تو یہ ہے کہ ابھی دریا کے پانی سے تمہارے پاؤں خشک نہیں ہو پائے تھے کہ تم نے اپنے پیغمبر۔ موسیٰ۔ سے کہا" ہمارے لئے بھی ایسے خدا بنادے جس طرح ان لوگوں کے خدا ہیں"۔

ابو بکر ابن مردویہ کہتے ہیں: "علی بن ابی طالبؑ نے جس سے بھی علمی بحث اور مناظرہ کیا ہے اس پر غالب آئے ہیں"۔ اس بارے میں مزید معلومات کیلئے احتجاج طبرسی اور بحار الانوار کے احتجاجی بحثوں پر مشتمل جلدوں کا مطالعہ کیا جائے جو "احتجاجات ائمہ" اور "الفتن والمحن" کے نام سے موسوم ہیں۔

علم قضا اور فصل قضا اور فیصلوں کے علم کے بارے میں آپؑ کے متعلق پیغمبر گرامیؐ کا یہ فرمان ہی کافی ہے کہ "اَقْضَاكُمْ عَلِيٌّ"۔ تمہارا سب سے بڑا قاضی علی بن ابی طالبؑ ہے۔ اور اس بارے میں خود حضرت امیر المؤمنین علیؑ کا اعلان جو ابھی بیان ہو چکا ہے کہ "اگر میرے لئے مسند بچھادی جائے اور میں اس پر بیٹھ جاؤں تو اہل توریت کے درمیان ان کی توریت سے فیصلے کروں..... " شاہد ناطق ہے، اسی طرح خطبہ ۱۱۹ میں جہاں آپؑ نے فرمایا ہے کہ "عِنْدَنَا اَهْلَ الْبَيْتِ اَبْوَابُ الْحِكَمِ وَ ضِيَاءُ الْاَمْرِ" بھی اس بات پر گواہ ہے۔ نیز اس علم کے بارے میں ور پیش آنے والے وہ واقعات ہیں جن کے بارے میں آپؑ نے فیصلے صادر فرمائے ہیں جن سے عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں آپؑ کے کچھ فیصلہ جات کا تذکرہ اسی خطبے میں بھی اور بعض دوسرے خطبات میں بھی کیا جائے گا انشاء اللہ۔ ان معاملات میں صحابہ کرامؓ کا آپؑ کی طرف رجوع کتابوں میں ملتا ہے اور حضرت عمر کا کئی مقامات پر "لَوْ لَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ" کہنا مشہور و معروف ہے۔

فصاحت وبلاغت جہاں تک علم فصاحت وبلاغت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ آپؑ ہی اس علم کے موجد اور اس میدان کے سب سے پہلے شہسوار ہیں اور اس میں آپؑ اس قدر گوئے سبقت لے گئے ہیں کہ دنیا کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ آپؑ کا کلام مخلوق کے کلام سے بالاتر اور خالق کے کلام کے بعد ہے۔ اور سید رضیؒ نے نہج البلاغہ کے دیباچے میں آپؑ کے علم فصاحت وبلاغت کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ: "امیر المؤمنینؑ فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخرج و منبع

تھے، فصاحت وبلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپؑ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپؑ ہی سے اس کے اصول و قواعد سیکھے گئے"۔ اس بات کی گواہی آپؑ کا "خطبہ بارعہ" دے رہا ہے جو اسی کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ نیز انشاء اللہ ہم اسی کتاب کے مختلف مقامات پر آپؑ کی فصاحت وبلاغت کے فن پاروں کی طرف اشارہ کریں گے، جیسا کہ اسی شرح کے دیباچہ میں بھی ہم عرض کر چکے ہیں۔ اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں کہ: "میں نے حضرت علیؑ کے کلام سے ایک ہزار خطبے یاد کئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام کا فیض بڑھتا ہی چلا گیا"۔

علم نجوم علم نجوم میں بھی آپؑ کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ اس کی تفصیل کلام ۷۸ میں آئے گی انشاء اللہ۔ اور بتایا جائے گا کہ آپؑ نے نجوم کے بارے میں ایسی عجیب وغریب باتیں بیان فرمائی ہیں جن تک کسی منجم کو ابھی تک رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔

علم نحو وادب علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپؑ ہی اس علم کے وضع کرنے والے اور موجد ہیں۔ ابو القاسم زجاجی کہتے ہیں کہ: "ہمیں ابو جعفر محمد بن رستم طبری نے بتایا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو حاتم سجستانی نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے یعقوب بن اسحٰق نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سعید بن مسلم باہلی نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے اور انہیں ان کے والد نے ابو الاسود دئلی سے روایت کی ہے کہ ابو الاسود دئلی کہتے ہیں کہ: "میں حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں کچھ متفکر پایا۔ میں نے عرض کیا "امیر المؤمنینؑ! آپؑ کیا سوچ رہے ہیں؟" فرمایا کہ "میں نے تمہارے شہر میں غلط الفاظ بولتے ہوئے لوگوں کو سنا ہے، لہٰذا میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ "اصول عربیہ" کے بارے میں ایک کتاب مرتب کروں" میں نے عرض کیا "اگر آپؑ ایسا کرتے ہیں تو آپؑ ہمیں زندہ کر دیں گے اور ہم میں ہماری زبان زندہ رہ جائے گی"۔ پھر میں تین دن کے بعد آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے میری طرف ایک تحریری مسودہ بڑھایا جس میں لکھا ہوا تھا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کلام، اسم، فعل اور حرف ہوتی ہے۔ پس اسم وہ ہوتا ہے جو اپنے مسمّٰی سے باخبر کرے، فعل وہ ہوتا ہے جو مسمّٰی کی حرکت کی خبر دے اور حرف وہ ہوتا ہے جو ایسا معنی بتائے جو نہ تو اسم ہوتا ہے اور نہ ہی فعل ہوتا ہے"۔ پھر آپؑ نے مجھ سے فرمایا: "اس میں خوب غور وفکر کرو اور جہاں پر ضرورت محسوس کرو اس جگہ پر اس میں اضافہ کر دو۔ اور ابو الاسود! یہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہئے کہ: اشیاء تین طرح کی ہوتی ہیں ا۔ ظاہر ۲۔ مضمر ۳۔ ایسی چیز جو نہ ظاہر ہوتی ہے اور نہ ہی مضمر۔ اور علماء اس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو نہ مضمر ہے نہ ظاہر"۔ ابو الاسود کہتے ہیں کہ: "میں نے کچھ اشیاء جمع کیں اور پھر آپؑ کی خدمت میں لے آیا۔ اور میں نے حروف ناصبہ کو بھی ان اشیاء میں جمع کیا اور لکھا کہ "اِنَّ، اَنَّ، لَیتَ، لَعَلَّ اور کَاَنَّ" یہ وہ حروف ہیں جو اسم کو نصب دیتے ہیں، لیکن ان میں ایک حرف کو ذکر نہیں کیا اور وہ "لٰکِنَّ" تھا۔ حضرتؑ نے فرمایا: "لٰکِنَّ" کو ذکر کیوں نہیں کیا؟ میں نے کہا "میں اسے حرف ناصبہ نہیں سمجھتا" فرمایا: "کیوں نہیں؟ یہ بھی حرف ناصب ہے، لہٰذا اس کو بھی ان میں شامل کرو"۔

علم حساب علم حساب کے بارے میں بھی یکتا اور بے نظیر تھے۔ آپؑ کے وفور علمی کی دلیل "مناقب" کی وہ روایت ہے جو ابو لیلٰی نے ذکر کی ہے کہ: "دو آدمی سفر پر روانہ ہوئے، ان میں سے ایک کے پاس پانچ روٹیاں تھیں اور

دوسرے کے پاس تین روٹیاں۔ جب وہ کھانے کیلئے بیٹھے تو اتفاق سے ان کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی شریک ہو گیا، چنانچہ آٹھوں روٹیوں کو مل کر تین افراد نے کھایا۔ جب سب کھا چکے تو تیسرے شخص نے اپنے کھانے کے بدلے آٹھ درہم دیئے، لیکن اس رقم کی تقسیم پر دونوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا۔ تین روٹیوں والے نے کہا مجھے آدھی رقم ملنی چاہئے اور پانچ روٹیوں والے نے کہا مجھے پانچ درہم ملنے چاہئیں۔ جب کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو فیصلہ کیا کہ اس کا تصفیہ علی بن ابی طالبؑ سے کرا لیتے ہیں۔ امام نے فرمایا کھانے کے بارے میں لڑنا پست ذہنیت کی دلیل ہے، لڑائی اچھی بات نہیں ہے، لہذا آپس میں صلح و صفائی سے کام لے کر تقسیم کر لو۔ لیکن انہوں نے نہ مانا اور تین روٹی والا اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ حضرت نے فرمایا: "اگر ایسا ہی ہے تو پھر فیصلہ تمہارے خلاف ہی ہو گا اور تمہیں صرف ایک درہم ملے گا اور سات درہم تمہارے ساتھی کا حق ہے، وہ یوں کہ تمہاری تین روٹیاں تھیں اور تمہارے ساتھی کی پانچ روٹیاں تھیں۔ اور آٹھ روٹیوں کو چوبیس حصوں میں تقسیم کریں گے جن میں سے تیسرا حصہ تم نے کھایا اور دوسرے دو حصے انہوں نے اور چوبیس کا تیسرا حصہ آٹھ بنتا ہے جبکہ تمہاری روٹیوں کے نو حصے بنتے تھے، جن میں سے آٹھ تم نے کھا لئے ایک تم سے بچ گیا جس کی قیمت ایک درہم ہے۔ لہذا تمہارا حصہ صرف ایک درہم ہی ہو گا اور تمہارے ساتھی کے سات درہم"۔

اس کی ایک اور طرح سے تقسیم بھی ہے جو اپنے مناسب مقام پر بیان ہو گی، انشاء اللہ۔

علم کیمیا

علم کیمیا میں بھی آپؑ کو مکمل دسترس حاصل تھی اور آپؑ اس سے سب سے زیادہ واقف تھے۔ کتاب "المناقب" میں ہے کہ آپؑ سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ: "کیمیا سازی نبوت کی بہن، اس کے ہم پلہ ہے اور مروت یعنی جوانمردی کی محافظ ہے۔ لوگ تو اس کے ظاہر کے متعلق بات کرتے ہیں لیکن میں اس کے ظاہر و باطن دونوں سے واقف ہوں، واللہ! کیمیا نام ہے جمے ہوئے پانی، رکی ہوئی ہوا، چکراتی ہوئی آگ اور بہتی زمین کا"۔ راوی کا بیان ہے کہ کسی نے آپؑ کے خطبہ کے دوران کیمیا کے بارے میں سوال کیا کہ: "آیا یہ ممکن ہے؟" فرمایا: "بالکل ممکن ہے ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا" پھر پوچھا گیا کہ: "یہ کس چیز سے ہے؟" فرمایا: "مٹی سے ملا ہوا پارہ، چاندی کا دھواں، پھٹکڑی، زنگ خوردہ لوہا، کھولتا ہوا سبز رنگ کا تانبا ہوتا ہے لیکن ان کے رستوں پر مت ٹھہرو!"۔ اس پر کسی نے کہا: "امیر المؤمنین! یہ چیزیں ہماری سوچ سے بالاتر ہیں!" تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: "ان میں سے بعض کو زمین بناؤ اور بعض کو پانی اور زمین کو پانی کے ساتھ سینچو اور بات ختم ہوئی!" عرض کیا گیا: "امیر المؤمنینؑ! کچھ اور ارشاد فرمایئے!!" فرمایا: "اس پر مزید اضافہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ قدیم حکماء نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا تاکہ لوگ اسے کھیل تماشا نہ بنا لیں"۔

امیر المؤمنینؑ کا زہد و تقویٰ

امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ کا زہد و تقویٰ، دنیا سے بے رغبتی، اور اسے طلاق دینے کی روایات تو اظہر من الشمس اور متواترات قطعیہ کا درجہ رکھتی ہیں، اور اس بارے میں خود آپؑ علی الاعلان ارشاد فرماتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ آپؑ دنیا سے کس حد تک بے پرواہ اور زہد و تقویٰ کی کس بلند منزل پر فائز ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپؑ کا صرف ایک جملہ یہاں پر ذکر کیا جاتا ہے جو نہج البلاغہ کے حصہ حکمت اور کلمات قصار میں مذکور ہے، آپؑ خداوند تعالیٰ کی قسم کھا کر فرماتے ہیں: "وَاللّٰهِ لَدُنْيَاكُمْ هٰذِهٖ أَهْوَنُ فِيْ عَيْنِيْ مِنْ

عراقِ خَنزِيرٍ فِيْ يَدِ مَجذُوْمٍ "خدا کی قسم! تمہاری یہ دنیا میری آنکھوں میں خنزیر کی اس پچوڑی ہوئی ہڈی سے بھی زیادہ حقیر ہے جو کسی جذامی کے ہاتھ میں ہو۔ جبکہ خطبہ ۲۲۲ میں فرماتے ہیں: "وَ اِنَّ دُنْيَاكُمْ عِنْدِيْ لَاَهْوَنُ مِنْ وَرَقَةٍ فِيْ فَمِ جَرَادَةٍ تَقْضِمُهَا مَا لِعَلِيٍّ وَ لِنَعِيْمٍ يَفْنٰى وَ لَذَّةٍ لَا تَبْقٰى"۔ یہ دنیا تو میرے نزدیک تو اس پتی سے بھی زیادہ بے قدر اور حقیر ہے جو ٹڈی کے منہ میں ہو کہ جسے وہ چبار ہی ہو، علیؑ کو فنا ہونے والی نعمتوں اور مٹ جانے والی لذتوں سے کیا واسطہ!۔

کتاب "المناقب" میں ہے کہ "صحابہ کرامؓ میں سے یہ حضرات زہد و تقویٰ کے لحاظ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں علیؑ، ابوبکرؓ، عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ، مقدادؓ، عثمان بن مظعونؓ اور عبداللہ بن عمرؓ۔ اور سب کو معلوم ہے کہ جب حضرت ابوبکر اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے ذمہ مسلمانوں کے بیت المال سے تقریباً چالیس ہزار درہم تھے۔ جب حضرت عمر اس جہان سے سدھارے تو ان کے ذمہ تقریباً اسّی ہزار درہم تھے جو تمام مسلمانوں کا حق بنتا ہے، جب حضرت عثمان کی رحلت ہوئی تو وہ بیت المال کے اس قدر مقروض تھے کہ جس کی حد و انتہا نہیں۔ لیکن جب امیر المؤمنین علیؑ کی شہادت ہوئی تو اس وقت آپؑ نے اپنے ترکہ میں صرف سات سو درہم چھوڑے جو آپؑ کی عطاو بخشش سے بچ رہے تھے اور ایک خادم کیلئے رکھے ہوئے تھے"۔

امالی شیخ طوسی میں عمار یاسرؓ سے ایک حدیث منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "یا علیؑ! اللہ نے تمہیں ایک ایسی زینت سے مزین کیا ہے جس سے کسی اور کو مزین نہیں کیا اور وہ زینت جو اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے کہ اللہ نے آپؑ کو دنیا میں زہد سے مزین فرمایا ہے اور اس میں آپؑ کو ایسا بنایا ہے کہ نہ تو آپؑ نے اس دنیا سے وافر حد تک حصہ لیا ہے اور نہ ہی دنیا نے آپؑ پر کوئی عیب لگایا یا نقص نکالا ہے اور آپؑ کو مسکینوں کے ساتھ محبت کا جذبہ عطا فرمایا ہے۔ آپؑ اس بات پر راضی ہیں کہ وہ آپؑ کے پیروکار ہیں اور وہ اس بات سے راضی ہیں کہ آپؑ ان کے امام ہیں"۔

کتاب "اللؤلؤیات" میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ: "ہمیں اس امت میں پیغمبر اکرمؐ کے بعد کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو علی بن ابی طالبؑ سے بڑھ کر زاہد ہو"۔

روایت میں ہے کہ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؑ کے پاس تین درہم بھی نہیں ہوتے تھے جن سے آپؑ چادر۔ عبا۔ خرید سکیں یا کسی اور ضرورت میں کام لا سکیں، جو کچھ بیت المال میں ہوتا وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے اور وہیں پر نماز ادا کر کے فرماتے: "خدا کا شکر ہے کہ مجھے بیت المال میں سے اسی طرح باہر نکالا جس طرح اس کے اندر داخل ہوا تھا"۔

آپؑ کے پاس بیت المال کیلئے مال لایا گیا تو سونے اور چاندی کے ڈھیر علیحدہ کر کے ان سے یوں مخاطب ہوئے: "اے سنہری روپہلی دنیا! تو پوری آب و تاب سے چمکتی رہ لیکن یاد رکھ تو مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی، کسی اور کو جا کر فریب دے"۔ اشعث عبد کہتے ہیں کہ: "میں نے حضرت علیؑ کو دیکھا کہ آپؑ نے جمعہ کا غسل دریائے فرات میں کیا اور اس کے بعد تین درہم کا کھدر قمیص کیلئے خریدا اور اسی نامکمل سلی قمیص کے ساتھ لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائی"۔ کتاب "فضائل احمد" میں ہے کہ: "حضرت علیؑ کے جسم اطہر پر موٹے کپڑے کی عبا دیکھی گئی جو پانچ درہم میں خریدی گئی تھی، اسی طرح آپؑ کے جسم پر پیوند لگی چادر بھی دیکھی گئی، جب اس بارے میں آپؑ کے ساتھ گفتگو کی گئی تو فرمایا: "اس سے مؤمنین اقتداء کرتے ہیں، دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے، نفس میں انکساری آتی ہے اور

پیروکاروں کو اتباع کا اچھا موقع ملتا ہے"۔ کتاب مسند احمد میں ہے کہ آپؑ کے پیراہن کی آستینیں انگلیوں تک نہیں پہنچتی تھیں اور آپؑ فرمایا کرتے تھے کہ آستینوں کو ہاتھوں پر فضیلت نہیں ہے۔ آپؑ نے ایک مرتبہ ایک فقیر کو دیکھا کہ اس کی قمیص کی آستینیں پھٹ چکی تھیں تو اپنی پیراہن کی آستینیں اکھاڑ کر اسے دیدیں۔ کتاب "مسند موصلی شعبی" میں حارثی سے روایت ہے وہ حضرت علیؑ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: "ہمارے پاس رات کے سونے کیلئے مینڈھے کی کھال کے علاوہ اور کوئی بستر نہیں تھا، وہ کھال بھی فاطمہ زہراؑ کو ہدیہ میں ملی تھی اسے بیچ کر نیا کپڑا خریدا جو بہت پسند آیا لیکن وہ بھی راہ خدا میں صدقہ دے دیا"۔

آپؑ کی عبادت واعمال صالحہ

سابق میں اجمالی طور پر بتایا جاچکا ہے کہ آپؑ وہ اعمال بجالاتے تھے جن میں ثواب زیادہ ہوتا تھا اور اس بارے میں آپؑ نہایت درجے کوشاں رہتے تھے، اسی بات کی شہادت کیلئے یہی کافی ہے کہ جب آپؑ کو تیر لگ جاتا تھا تو اس وقت وہ تیر نکالا جاتا جب آپؑ نماز کی حالت میں ہوتے تھے اور اس وقت آپؑ کو پتہ بھی نہیں ہوتا تھا، اس لئے کہ آپؑ نماز میں فنافی اللہ ہو کر جمال حق کے مشاہدے میں مستغرق اور ماسوی اللہ سے بالکل بے خبر ہوتے تھے۔

حضرت امام علی زین العابدینؑ شبانہ روز میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے اور پھر امیر المؤمنینؑ کا صحیفہ عبادت منگوا کر اس کا مطالعہ فرماتے اور اس کو رکھ کر بڑی پریشانی کی حالت میں اپنی عبادت کی کوتاہی پر افسوس کا اظہار کرتے اور فرماتے: "علیؑ بن ابی طالبؑ کی سی عبادت کون کر سکتا ہے؟" امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ ہی کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ: "...... تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ... "(فتح / ۲۹) تو ان کو دیکھے گا کہ (اللہ کے سامنے) جھکے سر بسجود ہیں، خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشانات پڑے ہوئے ہیں.."

کتاب مناقب شہر آشوب میں کتاب "روضۃ الواعظین" سے نیشاپوری کی روایت کے مطابق کہ عروۃ بن زبیر کہتے ہیں کہ: "بعض تابعین نے انس بن مالک کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مندرجہ ذیل آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے: "اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ......" (زمر / ۹) کیا جو شخص رات کے اوقات میں سجدہ کر کے اور کھڑے ہو کر خدا کی عبادت کرتا ہو اور آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہو...... (ناشکرے کافر کے برابر ہو سکتا ہے؟)۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں حضرت علیؑ کی خدمت میں مغرب کے وقت حاضر ہوا تو آپؑ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اسی طرح آپؑ نماز اور تلاوت قرآن میں طلوع فجر تک مشغول رہے۔ پھر از سر نو وضو کیا اور مسجد میں تشریف لے آئے اور نماز صبح کی امامت فرمائی پھر نماز فجر کی تعقیبات میں طلوع آفتاب تک مشغول رہے۔ اس کے بعد آپؑ کے پاس لوگ اپنے مقدمات کا فیصلہ جات لے کر آتے۔ اور یہ سلسلہ نماز ظہر کے وقت تک جاری رہا۔ اس کے بعد آپؑ نے پھر وضو کی تجدید فرمائی اور نماز ظہر کی امامت فرمائی۔ پھر تعقیبات ظہر میں عصر تک مشغول رہے پھر نماز عصر کی امامت فرمائی۔ پھر آپؑ مسند قضا پر بیٹھ گئے اور مغرب تک لوگوں کے مقدمات کا تصفیہ فرماتے رہے۔ یہ گویا آپؑ کا ہر روز کا معمول تھا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں بھی..... اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال کئے۔ آیا ہے وہیں پر اس سے مراد حضرت علی

اور ان کے شیعہ ہیں (اور انہی کیلئے بے پایاں اجر ہے)۔ اسی کتاب میں محمد بن عبداللہ بن حسن اپنے آباؤ اجداد علیہم السلام سے اور سدی، ابی مالک سے وہ ابن عباس اور امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی اس آیت: "وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (فاطر / ۳۲) اور ان میں سے کچھ لوگ خدا کے اختیار سے نیکیوں میں اوروں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ کا مصداق علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ چنانچہ اسی بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

مُفَرِّقُ الاَحْزَابِ ضَرَّابُ الطُّلَیٰ مُكَسِّرُ الاَصْنَامِ كَشَّافُ الْغُمَمِ
اَلزَّاهِدُ الْعَابِدُ فِيْ مِحْرَابِهٖ السَّاجِدُ الرَّاكِعُ فِيْ خُنْجِ الظُّلَمِ
صَامَ هَجِيْرًا وَ عَلٰى سَائِلِهٖ جَاذِبًا فَطَارَ الصِّيَامِ ثُمَّ نَمَّ

میدان جہاد میں دشمنوں کے گروہوں کو منتشر کرنے والا اور گردنوں کے مارنے والا، بت شکن اور مشکل کشا_ علیؑ _ ہے۔ وہ محراب عبادت میں زاہد و عابد، رکوع و سجود کو رات کی تاریکیوں میں بجالاتا ہے۔ دوپہر کی سخت گرمیوں میں روزے سے ہوتا تھا۔ اور اگر روزے کی افطاری کے وقت دروازے پر سائل آجاتا تھا تو کھانا اسے دے کر خود سو جاتا تھا۔

اسی کتاب میں عروۃ بن زبیر سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے درمیان "نیک اعمال" کی گفتگو چل نکلی تو ابو درداؔ کہنے لگے: "سب سے بڑے عبادت گزار علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں!" پھر وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ: "میں نے انہیں ایک خلوت کے مکان میں دردناک آواز اور دردِ دل سوز انداز میں ان الفاظ کے ساتھ مناجات کرتے ہوئے سنا: "میرے معبود! کتنے عذاب ایسے ہیں جو تو نے مجھ سے برطرف کئے ہیں، بلکہ ان کے بدلے تو نے مجھے نعمتوں سے نوازا ہے، اور کس قدر مصائب ایسے ہیں جو تو نے اپنے کرم کی وجہ سے مجھ سے دور کئے ہیں۔ بار الہا! اگر میری عمر تیری نافرمانی میں گزری ہے اور میرے نامہ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہوا ہے پھر بھی میں تیری مغفرت کا امیدوار ہوں، اور تیری رضامندی کے سوا کسی اور چیز سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے نہیں ہوں"۔ اس کے بعد آپؑ نے نماز کی کئی رکعتیں ادا کیں۔ پھر دعا اور گریہ و بکا میں لگ گئے اور اپنے رب سے مناجات کرنے لگے: "بار الہا! جب میں تیری بخشش کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے میرے گناہ حقیر نظر آتے ہیں اور پھر جب میں تیری سخت گرفت کو خاطر میں لاتا ہوں تو میری مصیبت مجھے عظیم نظر آتی ہے...... آہ! آہ! میں نے اپنے نامہ اعمال میں برائیوں کو پڑھا بھی تو انہیں بھلا دیا لیکن تو نے انہیں قلمبند کر دیا اور انہیں نہیں بھلایا، جس کے نتیجے میں تو کہے گا "اسے پکڑو!" ہائے اس وقت مجھ گرفتار بلا کا کیا حال ہوگا جسے نہ تو اپنا قبیلہ چھڑا پائے گا اور نہ ہی قوم کے افراد کسی کام آسکیں گے۔ آہ! وہ آگ جو دل اور گردے جلا ڈالے گی! آہ! وہ آگ جس کے جلا دینے والے شعلے بھڑکتے ہوں گے، آہ! وہ آگ کی سختیاں جس کے اونچے اور بھڑکنے والے شعلے اپنی لپیٹ میں لے لیں گے!"۔ اس کے بعد آپؑ نے اس قدر زور زور سے رونا شروع کر دیا کہ آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، پھر یکدم خاموش ہو گئے۔ میں نے سمجھا کہ آپؑ پر نیند غالب آگئی ہے لہذا نماز صبح کیلئے آپؑ کو بیدار کروں، جب نزدیک سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گویا ایک خشک لکڑی زمین پر پڑی ہوئی ہے جب میں نے ہلایا تو آپؑ کو بے حس و حرکت پایا میں نے کہا: "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" خدا کی قسم! علیؑ اس دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں"۔ پھر میں جلدی سے آپؑ کے گھر کے دروازے پر آیا اور گھر میں پیغام دیا کہ علیؑ اس دنیا سے کوچ فرما گئے ہیں، جناب فاطمہ زہرا

نے پوچھا"تم نے انہیں کس حالت میں دیکھا ہے؟"میں نے تمام ماجرا بیان کیا تو حضرت زہراؑ نے فرمایا: "خدا کی قسم! یہ علیؑ کی خوف کی حالت ہے جو ہر روز اُن پر طاری ہوتی ہے اور غش کئے ہوئے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے" پھر پانی لایا گیا جس سے علیؑ کے رخ انور پر چھینٹے مارے گئے جس سے آپؑ کو غشی سے افاقہ ہوا۔ انہوں نے مجھے روتا ہوا دیکھ کر مجھ سے رونے کی وجہ پوچھی، تو میں نے وجہ بتائی۔ جس پر آپؑ نے فرمایا: "ابو درداء! اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب دیکھو گے کہ مجھے حساب وکتاب کیلئے بلایا جارہا ہے اور تمام مجرمین کو عذاب ملنے کا یقین ہو چکا ہوگا۔ اور مجھے جہنم کے درشت خو اور تند فرشتے اپنے گھیرے میں لئے ہوں اور میں جبار بادشاہ کے حضور کھڑا ہوں، اور میرے قریبی دوست مجھے چھوڑ چکے ہوں اور اہل دنیا میری حالت دیکھ کر میرے حال پر رحم کھا رہے ہوں اور میں اس ذات کے سامنے کھڑا ہوں کہ جس سے کوئی بھی بات مخفی نہیں ہوتی"۔

آپؑ کی شجاعت

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؑ اشجع الناس_ بہت بڑے بہادر_ تھے۔ آپؑ کی شجاعت نے سابقہ بہادروں کی بہادری کو طاق نسیان میں رکھ دیا اور مستقبل کے بہادروں کی شجاعت کو محو حیرت کر کے رکھ دیا، آپؑ کے حملوں نے ملائکہ آسمانی کو تعجب میں ڈال دیا۔ چنانچہ جب آپؑ عمرو بن عبدود کے مقابلے میں جانے لگے تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "بَرَزَالاِیمَانُ کُلُّهُ اِلَی الشِّرْكِ کُلِّهِ" _کل ایمان، کل شرک کے مقابلے میں جارہا ہے۔ جب عمرو بن عبدود کو قتل کر چکے تو پیغمبرؐ نے فرمایا: "اِبْشِرْ یَا عَلِيُّ فَلَوْوُزِنَ عَمَلُكَ الْیَوْمَ بِعَمَلِ اُمَّتِي لَرَجَحَ عَمَلُكَ بِعَمَلِهِمْ" یا علیؑ! تمہیں خوشخبری ہو کہ اگر تمہارا آج کا عمل میری تمام امت کے اعمال کے ساتھ تولا جائے تو تمہارے اس عمل کا پلڑا بھاری ہوگا۔ اس روایت کو کتاب "المناقب" میں احمد بن حنبل اور نسائی نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح یہ آیت بھی خداوند عالم نے آپؑ ہی کے بارے میں نازل فرمائی ہے: "وَکَفَی اللّٰهُ الْمُؤْمِنِینَ الْقِتَالَ" بِعَلِيٍّ" مصحف ابن مسعود کے مطابق "(احزاب / ۲۵) یعنی خدا نے مومنین کو _علی کی وجہ سے_ لڑنے کی نوبت نہ آنے دی۔

ربیعہ اسدی کہتے ہیں کہ: "میں حذیفہ یمانی کے پاس گیا اور ان سے کہا: "اے ابا عبد اللہ! ہم علی اور ان کے فضائل ومناقب کے بارے میں بحث ومباحثہ اور گفتگو کرتے ہیں تو اہل بصرہ کہتے ہیں: تم علیؑ کے بارے میں مبالغہ اور افراط سے کام لیتے ہو" تو کیا آپ ہمیں اس بارے میں کوئی حدیث بیان کریں گے؟ تو انہوں نے کہا: "مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر پیغمبر اسلام کی تمام امت کہ جس دن سے اللہ نے آنحضرت کو مبعوث فرمایا ہے قیامت کے دن تک کے اعمال کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور علی کے صرف_ خندق کے دن کے_ ایک عمل کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو ان کا صرف ایک ہی عمل امت کے تمام اعمال سے بھاری ہو جائے"۔ یہ سن کر ربیعہ نے کہا: "ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟" تو حذیفہ نے کہا: "اے بونئے! یہ کیوں نہیں ہو سکتا؟ خندق کے دن ابو بکر، عمر، حذیفہ اور دیگر تمام اصحاب پیغمبرؐ موجود تھے تو اس وقت عمرو بن عبدود نے مسلمانوں کو مقابلے کیلئے للکارا تو اس کا جواب دینے کیلئے سوائے علی بن ابی طالبؑ کے اور کون تھا؟ سب کے منہ پر تالے پڑ چکے تھے، علی ہی اس کیلئے میدان میں اترے اور اسے واصل جہنم کیا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں حذیفہ کی جان ہے امیر المؤمنین کا اس دن کا عمل تمام اصحاب محمدؐ کے اعمال سے قیامت تک کیلئے فضیلت کا حامل ہے"۔

شارح معتزلی کا نظریہ

نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید معتزلی کہتے ہیں : "عربوں کا دستور تھا کہ جب بھی ان میں سے کوئی شخص میدان جنگ میں آپؑ کے مقابلے میں آتا تو وہ اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ علیؑ کے مقابلے میں میدان میں اترا ہے اور علیؑ کے ہاتھوں مارے جانے والوں کے اہل قبیلہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے قاتل علی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں عمرو بن عبدود کی بہن کا وہ مرثیہ اس بات کی دلیل ہے جب وہ اپنے بھائی کے لاشے پر آئی تو اس پر یہ مرثیہ کہا؛

لَوْ كَانَ قَاتِلُ عَمْرٍو غَيْرَ قَاتِلِهِ بَكَيْتُهُ ابَدًا مَّا دُمْتُ فِي الْبَلَدِ

لٰكِنَّ قَاتِلَهُ مَنْ لاَ نَظِيْرَ لَهُ وَ كَانَ يُدْعىٰ اَبُوْهُ بَيْضَةَ الْبَلَدِ

اگر عمرو کا قاتل علیؑ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو جب تک میں اس شہر (علاقہ) میں زندہ رہتی اس پر ہمیشہ روتی رہتی۔ لیکن اس کا قاتل تو ایک ایسا بے نظیر انسان ہے کہ جس کے باپ کو "سردارِ شہر" کہا جاتا ہے۔

جنگ احد میں تمام مسلمانوں نے راہ فرار اختیار کی اور رسول خداؐ کو خوف ہوا کہ کہیں لوگ منحرف نہ ہو جائیں آنحضرتؐ پر ہر طرف سے مشرکین نے تیروں، تلواروں اور نیزوں سے حملے شروع کر دیئے، سرکار رسالت کا دفاع صرف علیؑ بن ابی طالبؑ ہی کر رہے تھے، آنجنابؐ پر غشی طاری ہوگئی، جب غش سے افاقہ ہوا تو علیؑ سے پوچھا : "مسلمانوں نے کیا کیا؟" تو انہوں نے عرض کیا : "وہ پیمان شکنی کر کے بھاگ چکے ہیں" حضورؐ نے فرمایا : "پھر تم ہی مجھے ان لوگوں سے بچاؤ!" جس پر انہوں نے سرکار رسالت مآبؐ کا مکمل طور پر دفاع کیا اور آپؐ سے مشکلات کو دور کیا۔ اسی دوران میں کسی نے مدینہ میں زور، زور سے چلانا شروع کر دیا کہ : "محمدؐ قتل ہو گئے" یہ سن کر لوگوں کے دل دہل گئے لیکن جبرائیل امین یہ کہتے ہوئے نازل ہوئے "لَاسَيْفَ اِلَّاذُوالْفِقَارِوَلَافَتٰى اِلَّاعَلِيٌّ" _ ذوالفقار کے علاوہ کوئی تلوار نہیں اور علیؑ کے علاوہ کوئی جوانمرد نہیں_ پھر وہ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے : "یارسول اللہ! آپؐ پر علیؑ کی جانثاری کی وجہ سے ملائکہ تعجب کر رہے ہیں"۔ اس پر حضرت رسول اکرمؐ نے فرمایا : "ایسا کیوں نہ ہو! وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں"۔

اس کے علاوہ اور بھی لامحدود واقعات ہیں نہ تو قلم میں جس کے بیان کرنے کی طاقت ہے اور نہ ہی کوئی انہیں بیان کر سکتا ہے۔ آپؑ کی جنگی فتوحات اور مجاہدات کے بارے میں اسی کتاب کے مختلف مقامات پر موقع کی مناسبت سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

اسی طرح آپؑ کے دوسرے مکارم اخلاق اور خوبصورت خصائل وقتاً فوقتاً اسی شرح میں مناسب مواقع پر ذکر کئے جائیں گے۔ اگر ہم آپ کے فضائل و خصائل اور مناقب و محامد کے عشر عشیر کو بھی بیان کرنا شروع کر دیں تو اسی کتاب کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ حجم میں کتاب تحریر کرنا پڑے گی، لہذا سر دست اسی پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

علیؑ بن ابی طالبؑ کے بارے میں جاحظ کا نظریہ

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ کتاب "البیان والتبیین" کے لکھنے والے جاحظ کی امیر المؤمنینؑ کے ساتھ زبردست دشمنی تھی اور ان کی یہ دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ لیکن بعض اوقات کلمہ حق اپنی خدائی طاقت کی وجہ سے دشمن کے منہ سے بھی نکل جاتا ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنینؑ کے بارے میں ان کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے: "حضرت علیؑ اپنے اس قول میں بالکل برحق اور سچے ہیں جو انہوں نے فرمایا ہے کہ "ہم اہل بیت ہیں ہمارے ساتھ کسی کو بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا"۔ تو ایسی قوم کے ساتھ کسے قیاس کیا جاسکتا ہے جس میں حضرت رسول خداؐ ہوں، علیؑ و فاطمہؑ جیسی دو طیب و طاہر شخصیتیں ہوں، حسنؑ اور حسینؑ جیسے دو سبط (نواسہ رسولؐ) ہوں۔ اسد اللہ (شیر خدا) حمزہ اور ذوالجناحین (جعفر طیار) جیسے شہید ہوں، عبد المطلب جیسے سید الوریٰ (سردار کائنات) ہوں عباس جیسے ساقی حجاج ہوں، پیغمبرؐ کے حامی و مددگار، شیخ قریش، حضرت ابو طالبؑ جیسے محب رسولؐ، کفیل پیغمبرؐ، مربی رسالتؐ، مقر نبوت، معترف رسالت اور شان رسالت میں قصیدے پڑھنے والے موجود ہوں۔ ایسے خاندان کے ساتھ کسے قیاس کیا جاسکتا ہے جن میں سخاوت، عزت اور عظمت اور ہر قسم کی خیر و خوبی موجود ہو۔ "انصار" وہ ہیں جو ان کی نصرت کریں، "مہاجر" وہ ہیں جو ان کے ساتھ اور ان کی طرف ہجرت کریں۔ "صدیق" وہ ہے جو ان کی تصدیق کرے، "فاروق" وہ ہے جو ان کے بارے میں حق اور باطل کو تمیز دے۔ "حواری" وہ ہے جو ان کے اطراف میں رہے اور "ذوالشہادتین" وہی ہے جس نے ان کیلئے شہادت دی اور شہادت پائی۔ اور خیر صرف اور صرف انہی میں ہے، انہی کیلئے ہے، انہی سے ہے اور انہی کے ساتھ ہے۔

حضرت رسول خداؐ نے اپنے اہل بیت کی شان کو ان الفاظ کے ساتھ واضح طور پر فرمایا ہے کہ: "اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الْخَلِیْفَتَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ نَبَّاَنِیْ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اَنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ" "میں تم میں اپنے دو جانشین چھوڑے جارہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب ہے جو آسمان اور زمین کے ساتھ متصل ہے اور ایک میری عترت میرے اہل بیت ہیں، مجھے لطیف و خبیر خدا نے خبر دی ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، جب تک کہ میرے پاس حوض کوثر تک نہ پہنچ جائیں۔ اگر اہل بیت کی عظمت دوسرے لوگوں کی مانند ہوتی تو رشتہ طلب کرتے وقت ایک بزرگوار کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر سببی اور نسبی رشتہ ختم ہو جائے گا سوائے میرے سببی اور نسبی رشتہ کے۔ اگر صرف علیؑ بن ابی طالبؑ ہی کو لے لیا جائے تو ان کے فضائل شریفہ، مقامات کریمہ، درجات رفیعہ، اور بلند ترین مناقب کو شمار کرنے کیلئے بقول شاعر ~ سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے۔ جس کی ذات بلند، جس کا نسب اظہر من الشمس، جس کا مقام ولادت باعظمت گھر (خانہ کعبہ) جس کا مقام نشوونما بابرکت اور معظم، جس کی شان عظیم، جس کا عمل بھاری، جس کا علم کثیر، جو خود بے نظیر، جس کا بیان عجیب، جس کی زبان خطیب، جس کا سینہ کشادہ، جس کے اخلاق اس کے باطن کے آئینہ دار اور جس کی ہر ایک بات اس کے مقدم اور افضل ہونے کی شاہد ہے"۔

ابن ابی الحدید کا نظریہ اور مصنف کی تنقید

ہم نے اس تیسرے خطبے کے مقدمہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گیا

ہوگا کہ ناصبیوں کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ "امیر المؤمنینؑ، سید المتقینؑ، یعسوب الدینؑ اور قائد الغر المحجلین علی بن ابی طالب علیہ و علی اولادہ آلاف التحیۃ والسلام کی امامت پر کوئی نص موجود نہیں ہے"۔ اسی طرح ان لوگوں کا نظریہ بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے جو دوسروں کو آپؑ پر فضیلت دیتے ہیں، جیسا کہ کچھ لوگوں نے چند افراد کو آپؑ پر فضیلت دینے کی ٹھان رکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ فضیلت تو علیؑ کو حاصل ہے لیکن خلافت کے حقدار ثلاثہ ہیں اور انہیں آپؑ پر سبقت حاصل ہے، جیسا کہ ابن ابی الحدید کا اور دوسرے ان کے ہم نوا معتزلہ بغدادو غیرہ کا مذہب ہے۔ اور شرح نہج البلاغہ کے آغاز ہی میں اسی چیز کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وہم فاسد اور غلط رائے کے سلسلے میں جو بات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ شارح معتزلی ابن ابی الحدید نے اسی خطبہ کے دوران میں غلط اور ناروا عقیدے کو ذکر کیا ہے جس کی تردید اور تصحیح ضروری ہے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہے پہلے ہم ان کے کلام کو اگرچہ طوالانی ہے ذکر کریں پھر اس کے ساتھ اور فوراً بعد اس کی رد بھی بیان کریں۔

چنانچہ شارح معتزلی اسی خطبے کے اس جملے "اَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا......" سے لے کر "اَریٰ تُرَاثِي نَهْبًا" کے سلسلے میں بعینہ یوں رقمطراز ہیں: "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آیا اس کلام میں وہ باتیں نہیں پائیں جاتیں جو صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ان لوگوں اور ان کے پیروکاروں نے امیر المؤمنین علیؑ پر ظلم کیا اور ان کے حقوق کو غصب کیا ہے؟ اس بارے میں آپ کیا نظریہ ہے؟ اگر آپ ان لوگوں کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں تو پھر آپ ان پر تنقید اور طعن و تشنیع کے مرتکب قرار پائیں گے، اور اگر فیصلہ نہیں دیتے تو پھر آپ امیر المؤمنین علیؑ پر طعن کے مرتکب ہوں گے!" تو اس کا جواب شارح معتزلی نے یوں دیا ہے کہ: "شیعہ امامیہ حضرت علیؑ کے الفاظ کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے حضرت علیؑ کی خلافت کیلئے نص قائم کر دی ہے لہذا اس بارے میں ان کا حق غصب کیا گیا ہے۔ جبکہ ہمارے علماء_ اللہ ان پر رحم کرے_ کا موقف یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ تمام لوگوں سے افضل اور مستحق خلافت ہیں اور خلافت کو آپؑ سے پلٹا کر ان لوگوں کو دی گئی ہے جو نہ تو فضیلت میں آپؑ کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں، نہ علم اور جہاد میں آپؑ کا کوئی عدیل اور مثیل ہے، نہ ہی سرداری اور شرف میں آپؑ کا کوئی نظیر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جن لوگوں کو مسند خلافت پر بٹھا دیا گیا وہ بھی عادل اور متقی تھے۔ اور ان کی بیعت بھی صحیح تھی اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی شہر میں دو فقیہ ہوں جن میں سے ایک فقیہ دوسرے سے کئی درجے زیادہ عالم ہو لیکن بادشاہ اس کو قاضی مقرر کر دے جو علمی لحاظ سے کم درجے کا ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ عالم کو اس بات کا دکھ ہوگا، دل میں اس کا افسوس کرے گا اور کبھی کبھار زبان سے بھی اس کا شکوہ شکایت کرے گا، جس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ وہ قاضی پر طعن و تشنیع کر رہا ہے یا اسے فاسق قرار دے رہا ہے یا اس بات کا اظہار کر رہا ہوتا ہے کہ وہ قاضی بننے کے لائق نہیں تھا بلکہ بات صرف یہی ہوگی کہ زیادہ مستحق اور زیادہ لائق کو چھوڑ کر دوسرے کو اس عہدے پر فائز کر دیا گیا ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت واس کی جبلت میں شامل ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے لیکن چونکہ علماء مکتب خلفاء کا صحابہ کرام کے بارے میں حسن ظن ہوتا ہے اور ان سے ہر سرزد ہونے والے فعل کو اچھائی اور بہتری پر محمول کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے اسلام کی مصلحت کو ہمیشہ مد نظر رکھا ہے اور انہیں ایک ایسے فتنہ کا خوف تھا جو صرف خلافت ہی تک محدود نہ رہتا بلکہ اس کے اثرات نبوت اور ملت اسلامیہ کے خاتمے تک جا پہنچتے اسی لئے انہوں نے لائق ترین اور فاضل ترین شخصیت کو چھوڑ کر اس سے کم درجے کے

لوگوں کو منصب خلافت پر فائز کر دیا اور خلافت کے متعلق جلالت قدر اور رفعت منزلت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اور اسے نبوت کا قائم مقام بتایا گیا ہے تو اس کی انہوں نے تاویل کی ہے اور اسے "اولیٰ" سے "عدول" کے ساتھ تعبیر کی ہے بالکل ویسے ہی جیسے مکتب اہل بیت کے علماء "ترک اولیٰ" سے تعبیر کرتے ہیں اور حضرت آدمؑ کے بارے میں خداوند عالم کے اس قول: "عَصىٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوىٰ" کی تعبیر میں کہتے ہیں کہ "عصیان" سے مراد ترک اولیٰ ہے، اس بارے میں امامیہ کی تاویل یہ ہے کہ آدمؑ نے اولیٰ سے عدول کیا تھا کیونکہ درخت کے کھانے کے ترک کا امر "امر ندبی" تھا تو جب آدمؑ نے اس امر پر عمل نہیں کیا تو گویا انہوں نے ایک افضل اور اولیٰ کو ترک کر دیا اور "عاصی" صرف اس اعتبار سے ہیں کہ انہوں نے اولیٰ کی مخالفت کی ہے۔ اسی طرح "غویٰ" کو "خاب" ـ ناکامی ـ پر محمول کرتے ہیں نا کہ گمراہی کے معنی پر اور معلوم ہے کہ اسی طرح امیر المؤمنین علیؑ کے کلام کی بھی تاویل کی جائے گی اور اسے اس بات پر حمل کیا جائے گا کہ انہوں نے صحابہ کرامؓ کے ترک اولیٰ کی شکایت کی تھی، جس طرح "عصیٰ آدمُ" میں تاویل کی جاتی ہے"۔

شارح معتزلی آگے چل کر کہتے ہیں کہ: "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صحابہ کرامؓ نے افضل سے عدول وانحراف کسی مانع اور خاص وجہ سے کیا ہے یا کسی خاص وجہ کے بغیر، اگر کسی خاص وجہ کے بغیر کیا ہے تو ان کا مفضول کو افضل پر ترجیح دینا ان کی ذاتی خواہش کی وجہ ہی سے ہوگا اور یہ باطل ہے۔ اور اگر کسی مانع اور خاص وجہ سے کیا ہے اور وجہ یہی بتلائی جاتی ہے کہ اگر اس وقت خلافت علیؑ کو دی جاتی تو فتنہ کھڑا ہو جاتا کیونکہ لوگ علیؑ سے دشمنی رکھتے تھے اور ان سے حسد کرتے تھے تو پھر ایسی حالت میں ضروری تھا کہ یہی وجہ علیؑ کو بتا کر ان سے معذرت خواہی کر لی جاتی اور انہیں بتایا جاتا کہ دوسروں کی بیعت اس لئے کی جا رہی ہے کہ اسی میں اسلام کی مصلحت ہے اور علیؑ کا بھی فرض بنتا تھا کہ ان کی معذرت کو قبول کر لیتے اور اسلام کی مصلحت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے لہٰذا ان کا شکوہ بھی نہ ہوتا۔

اسی طرح حضرت امیرؑ کے اس قول: "فَطَفِقْتُ اَرْتَأِيْ بَيْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِيَدٍ جَذَّاءَ اَوْ اَصْبِرَ عَلٰى طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ" ـ پس میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں یا اس سے بھیانک تیرگی پر صبر کر لوں؟ ـ کا کیا مطلب ہے؟ اس لئے کہ آپ تو حضرتؑ کے کلام کی تاویل کر چکے ہیں کہ یہ ثلاثہ کے ترک اولیٰ کی نشاندہی کرتی ہے جبکہ ترک اولیٰ کے مرتکب پر ہاتھوں سے جنگی حملے تو نہیں کئے جاتے!!"

تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہو سکتا ہے کہ امیر المؤمنینؑ کے ظن پر وہ بات غالب نہ آسکی ہو جو دوسرے صحابہ کے ظن پر غالب آگئی تھی کہ علی بن ابی طالبؑ کے خلیفہ بننے سے گڑبڑ اور فتنہ وفساد پیدا ہو جائے گا اور لوگ علیؑ کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے جس سے اسلام کو سخت نقصان پہنچتا۔ اس لئے کہ علامات کے مختلف ہونے سے گمان اور ظن بھی مختلف ہوتے ہیں کیونکہ بعض اوقات ایک انسان کے گمان میں وہ کچھ ہوتا ہے جو دوسرے کے گمان میں نہیں ہوتا لہٰذا اس معاملے میں کسی کو بھی قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

رہا حضرت کا یہ فرمانا "میں نے سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کروں..." تو اس کا مقصد یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس سے آپؑ کی مراد جنگی حملے کی نہ ہو بلکہ اس سے مراد جدل ومناظرہ اور احتجاجی حملے ہوں، مثلاً جب حضرتؑ نے ان سے احتجاج کیا تھا اور ان کے سامنے اپنا مافی الضمیر بیان کیا تھا تو انہوں نے جواب میں کہا ہو "ہمارے گمان غالب میں یہ ہے کہ آپؑ کی خلافت سے فساد بڑھ جاتا اور حالات بد سے بدتر ہو جاتے لہٰذا آپؑ کو خلافت کی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی" تو آپؑ نے ان کے جواب

میں فرمایا ہو "میں نے سوچنا شروع کیا کہ انہیں اپنے فضائل سے آگاہ کروں اور انہی فضائل کی بنا پر ان سے احتجاج کروں تو مجھے اس قسم کا جواب ملا کہ جس سے میری دلیل کٹے ہوئے ہاتھوں کی مانند ہو گئی اور اس کو میں مزید پختہ نہ کر سکا اور اس کی مدد نہ کر سکا اور میں نے صبر سے کام لیا اور اپنی آرزو کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا"۔ شارح معتزلی اپنے کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ :"اگر کوئی شخص یہ کہے کہ خلافت سے مانع اور اس سے محرومی کے اسباب کے بارے میں حضرت امیرؑ کے گمان غالب میں وہ بات ہی نہیں تھی جو دوسرے صحابہ کے سان و گمان میں تھی اسی لئے تو آپؑ نے صحابہ کی طرف رجوع کیا اور ان سے کسی وجہ کے بغیر افضل سے عدول و انحراف کی شکایت کی، اس سے تو آپ یہ بات تسلیم کر رہے ہیں کہ امیر المؤمنینؑ نے صحابہ کو ظالم اور اپنے حقوق کا غاصب ٹھہرا لیا، اسی لئے اس بات میں اور نص کی مخالفت کرنے میں کیا فرق ہوا جس طرح اس سے وہ ظالم اور غاصب قرار پا رہے ہیں اسی طرح وہ نص کی مخالفت سے بھی تو ظالم اور غاصب ہی قرار پائیں گے۔ آپ جس چیز سے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں اسی قدر اس کی طرف لوٹ کر جا رہے ہیں اور اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ کسی وجہ کے بغیر اولیٰ کو ترک کرنے کا نام ظلم ہے اور معلوم ہے کہ کسی وجہ کے بغیر اولیٰ کی مخالفت ایسے ہے جیسے نص کی مخالفت کی جائے، اس لئے کہ دونوں صورتوں کی کیفیت ایک جیسی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ دونوں صورتوں میں بہت زیادہ فرق ہے اور بڑا واضح فرق ہے۔ کیونکہ اگر حضرت امیر علیہ السلام ان لوگوں کو نص کی مخالفت کا مرتکب قرار دیتے تو یقیناً کسی نص کا وجود بھی ہوتا کہ جس کی انہوں نے مخالفت کی ہوتی، اگر نص موجود ہوتی تو اس کی مخالفت کی وجہ سے وہ فاسق قرار پاتے، لیکن چونکہ آنجنابؑ نے انہیں ترک اولیٰ کا مرتکب قرار دیا ہے جس کی کسی وجہ کے بغیر مخالفت کی گئی ہے، جبکہ اس بارے میں حضرت علیؑ اور صحابہ کرام کے دعوے مختلف تھے جس کا نتیجہ دو صورتوں میں سے ایک نکلے گا۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام کا باطن یا تو صحیح تھا یا غلط۔ اگر صحیح تھا تو بات ہی ختم ہو جاتی ہے اور اگر غلط تھا تو پھر ان کی حیثیت مجتہد کی سی ہو جائے گی کہ ان کے ظن میں غلطی واقع ہوئی ہے، یعنی ان سے اجتہادی غلطی ہوئی ہے۔ تو پھر ایسی صورت میں ان کا عذر قابل قبول ہو گا، جبکہ نص کی مخالفت قابل مواخذہ ہوتی ہے۔ بنا بر ایں مذکورہ دونوں صورتوں میں بہت بڑا فرق ہے"۔

مصنف کا جواب یہ تو تھا شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید معتزلی کا نظریہ جس میں موصوف نے یا تو اپنی جہالت کا مظاہرہ کیا ہے یا پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ کیونکہ :

۱۔ انہوں نے ابتدائے کلام میں کہا ہے کہ "جو لوگ حضرت علیؑ کی جگہ پر تخت خلافت پر براجمان ہوئے وہ عادل اور متقی لوگ تھے"۔ اس بارے میں تو دوران گفتگو بتایا جائے گا کہ وہ کس حد تک "متقی اور عادل" تھے؟ اور جب ان کے "کارناموں" پر روشنی ڈالی جائے گی تو پتہ چلے گا کہ عدل و تقویٰ کی "لاج" انہوں نے کیونکر رکھی ہے؟۔ انشاء اللہ۔

۲۔ شارح موصوف نے فرمایا ہے :"خلیفہ اول کی بیعت صحیح تھی"۔ تو ہم اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ان کی خلافت دراصل مرہون منت ہے حضرت عمر کی اتباع و تبعیت کی جبکہ ان کے ساتھ دوسرے چار حضرات یہ بھی جن کی رضامندی شامل تھی، ۱۔ ابی عبیدہ ۲۔ سالم مولا حذیفہ ۳۔ بشر بن سعد اور ۴۔ اسید بن حضیر۔ ان حضرات کے علاوہ کوئی اور شخص نظر نہیں آتا جنہوں نے خلیفہ اول کی خلافت کو تسلیم کیا ہو اور دوسرے بزرگ صحابہ نے دستکشی اختیار کر لی تھی۔ البتہ اس کی تفصیل

آگے چل کر بیان ہو گی۔

اسی طرح خود شارح معتزلی نے بھی بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ : "حضرت ابو بکر کی خلافت کو حضرت عمر کی ذات نے استحکام بخشا"۔ کیونکہ حضرت عمر وہ شخصیت ہیں جنہوں نے حضرت ابو بکر کی بیعت کو پختہ کیا، اور مخالفین کا منہ بند کر دیا، چنانچہ جب حضرت زبیرؓ نے تلوار نکالی تو ان کی تلوار کو توڑ ڈالا، حضرت مقدادؓ کو سینے کے دھکے دیئے اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو سقیفہ میں لتاڑ ڈالا اور فرمایا "خدا سعد کو غارت کرے اسے قتل کر دو" اور حبابؓ بن منذر کی ناک توڑ دی۔ جب انہوں نے سقیفہ میں کہا کہ : "میں بہت ہی تجربہ کار، واقف کار اور ہوشیار آدمی ہوں" اور جس بنی ہاشم نے حضرت فاطمہؑ کے گھر میں پناہ لی انہیں ڈرایا دھمکایا اور باہر نکالا، اگر آپ نہ ہوتے تو حضرت ابو بکر کی کوئی بات ہی پکی نہ ہوتی اور نہ ہی خلافت اپنے مقام پر قائم ہوتی"۔

دیکھا آپ نے خود شارح معتزلی بڑی صراحت کے ساتھ اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ حضرت ابو بکر کی خلافت "اجماع کل" کے تحت مستحکم نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی نے برضا و رغبت اسے تسلیم کیا، بلکہ یہ سب کچھ کارنامہ ہے حضرت عمر کا جنہوں نے ان کی خلافت کی بنیاد بھی رکھی اور اسے استحکام بھی بخشا۔ اگر بالفرض یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ بیعت کرنے والوں کی تعداد ایک بڑی جماعت پر مشتمل تھی تو بھی ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ : "شرعی طور پر یہ لوگ اپنی ذات میں تصرف تو کر سکتے ہیں لیکن دوسروں کے کسی بھی شخص کے کم سے کم معاملے میں بھی تصرف کا حق نہیں رکھتے، اس لحاظ سے انہیں کیا حق حاصل ہے کسی کو اپنے اور دوسرے افراد کی گردن پر مسلط کر دیں؟ تو جو لوگ ادنیٰ سے ادنیٰ معاملے میں بھی کسی شخص کے امور میں تصرف کا حق نہیں رکھتے وہ کیونکر کسی کو یہ حق دے سکتے ہیں کہ تمام اہل شرق و غرب کے نفوس، خون، اموال اور ناموس میں تصرف کریں؟"۔ یہ جو کچھ بھی ہم نے ذکر کیا ہے صرف فرض کی صورت میں ہے اور اس مفروضے کے جواب کے طور پر ہے ورنہ صاحب "مواقف" اور شارح "مواقف" سید شریف تو کہتے ہیں کہ بیعت تو ایک فرد یا دو افراد کے ساتھ بھی منعقد ہو جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں : "جب اختیار اور بیعت کے ساتھ امامت کا حصول ثابت ہو جائے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حصول امامت کیلئے تمام اہل حل و عقد کے اجماع کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ اس ضرورت پر کوئی عقلی یا سنی ہوئی دلیل قائم نہ ہو بلکہ امامت کے ثبوت کیلئے صرف ایک یا دو اہل حل و عقد کی بیعت کافی ہوتی ہے اور تمام اہل اسلام پر اس کی اتباع واجب ہو جاتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اپنے دین میں سخت ہونے اور شرعی امور کی کماحقہ سختی سے پابندی کرنے کے باوجود امامت کے حصول کیلئے صرف ایک یا دو صاحبان حل و عقد کی بیعت پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت عثمان کی بیعت کی اور اس بارے میں تو انہوں نے تمام اہل مدینہ کے سب اہل حل و عقد کی بیعت شرط قرار نہیں دیا چہ جائیکہ تمام اہل عالم کے صاحبان حل و عقد کی بیعت کو شرط قرار دیتے اور یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے اور صرف ایک یا دو صاحبان حل و عقد کی بیعت سے امامت و خلافت کا انعقاد ہو جاتا ہے اور یہی بات کافی ہے"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ مذکورہ حضرات_ صاحب و شارح مواقف_ کا نظریہ جو صرف حضرت عمر کی بیعت سے حضرت ابو بکر کی خلافت کو صحیح اور شرعی قرار دے رہے ہیں!! تو کیا ایسی صورت میں کوئی صاحب عقل اس بیعت کو صحیح اور شرعی قرار دے

گا؟ توجو شخص اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کیلئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی بیعت کرے جس کیلئے نہ تو خدا نے نص مقرر فرمائی اور نہ ہی رسول پاکؐ نے اور نہ ہی جس کی پوری امت مسلمہ نے بیعت کی ہے صرف ایک شخص کی بیعت کی وجہ سے اس کی بیعت کرلے؟ کیا کوئی عقلمند اس موقف کو پسند بھی کرے گا؟ اور اس مذہب کی اطاعت کا طوق اپنے گلے میں ڈالے گا؟ اور اپنے اوپر ایک ایسے شخص کی اطاعت کی ذلت واجب قرار دے گا نہ تو جس کی عدالت سے اور نہ ہی جس کے ایمان سے باخبر ہے؟ اور نہ ہی اسے یہ معلوم ہے کہ آیا وہ حق پر بھی تھا؟ صرف ایسے ایک شخص کی بیعت کی وجہ سے اس کی بیعت کرلے جس کی اپنی عدالت اور معرفت بھی ثابت نہیں ہے البتہ یہ تو کھلی جہالت، حماقت، اور گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے!

۳۔ شارح معتزلی نے ایک شہر میں دو صاحبان علم کی موجودگی میں سے ایک کو بادشاہ کے ذریعے قاضی مقرر کرنے کی مثال بھی دی ہے جس سے انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ: "خداوند عالم نے ہی حضرت ابوبکر کو حضرت علیؑ پر مقدم کیا ہے!" یہی موقف انہوں نے اپنی کتاب شرح نہج البلاغہ کے خطبے میں اختیار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ: "مفضول_ حضرت ابوبکر_ کو افضل_ حضرت علیؑ_ پر اس لئے مقدم کیا ہے_ اور پہلی خلافت سے نوازا ہے_ کہ اس کی مصلحت اسی بات کا تقاضا کرتی تھی"۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دو نکات سامنے آتے ہیں:

الف: موصوف کا مذکورہ بالا نظریہ ان کے اس موقف کے خلاف ہے جس کی انہوں نے بعد میں صراحت کی ہے کہ "چونکہ صحابہ کرامؓ اسلام کی مصلحت اور اس کے اعلیٰ تقاضوں کو مد نظر رکھ کر ایک افضل اور اشرف ذات_ علی بن ابی طالبؑ_ سے رو گردانی کی"۔ یہاں سے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر کو حضرت علیؑ پر صحابہ کرام کے کارناموں سے مقدم کیا گیا نہ کہ فعل خداوندی اس میں کار فرما تھا!

ب: اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ خداوند دانا و بینا نے مفضول اور ہدایت کے محتاج کو کہ جسے تکمیل کی بہت بڑی ضرورت ہے اسے فاضل پر مقدم کیا ہے جو تکمیل کے تمام مراحل سے گزر چکا ہے! یہ نظریہ جہاں پر عقلی اور نقلی طور پر خدا کیلئے قبیح ہے وہاں پر خداوند سبحان کی ذات پر کذب و افترا بھی باندھا جارہا ہے، کیونکہ خداوند عالم تو خود فرماتا ہے: "اَفَمَنْ یَّهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّهْدٰى فَمَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ" (یونس/ ۳۵) وہ شخص جو دوسرے کی ہدایت تو در کنار خود جب تک (کوئی) دوسرا اس کو راہ نہ دکھائے دیکھ نہیں پاتا، تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ اسی طرح ایک اور جگہ پر فرماتا ہے: "هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ" (زمر/ ۹) کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟ اس کی سوچ سمجھ تو بس صاحبان عقل ہی رکھتے ہیں۔

ج: اگر تقدیم ابوبکر خدا کی طرف سے ہوتی تو حضرت علیؑ کبھی بھی اس بات کی شکایت نہ کرتے اس لئے کہ اس سے تو خدا کی بات، مرضی اور منشاء کو ٹھکرانا لازم آتا جو بذات خود شرک کی حدود تک جا پہنچتا ہے۔

۴۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ "صحابہ کرام نے اسلام کی مصلحت کے پیش نظر حضرت علیؑ پر حضرت ابوبکر کو ترجیح دی اور انہیں مقدم کیا"۔ حالانکہ ان کا یہ نظریہ کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں، انہوں نے یہ اقدام حب جاہ اور ریاست طلبی کی غرض

سے کیا اور امام امت علیؑ کی دشمنی میں ایک مفضول کو ان پر مقدم کیا، اگر یقین نہ آئے تو حضرت طلحہ کے اس قول کو ملاحظہ فرمالیں جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر نے "ولایت اور خلافت" کی وصیت حضرت عمر کے بارے میں تحریر فرمائی تو طلحہ نے حضرت عمر سے کہا: "وَلَّيْتَهُ اَمْسِ وَلاَّكَ الْيَوْمَ" _ کل آپ نے انہیں والی بنایا تھا آج وہ آپ کو والی بنا کر جا رہے ہیں_ مزید برآں مکتب خلفاء کے امام غزالی نے اپنی کتاب موسوم بہ "سر العالمین" کے مقالہ رابعہ میں کافی بحث و تمحیص اور اختلافات کی وجوہ بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: "حجت تو اس وقت تمام ہو چکی ہے اور جمہور محدثین نے حدیث غدیر کی صحت متن پر اجماع کیا ہے، اور سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ نے غدیر خم کے مقام پر اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلاَهُ فَعَلِيٌّ مَوْلاَهُ" _ جس کا میں مولا ہوں پس اس کا علیؑ مولا ہے_ اس پر حضرت عمر نے مبارکباد دی اور کہا "بَخٍ بَخٍ يَا اَبَا الْحَسَنِ لَقَدْ اَصْبَحْتَ مَوْلاَيَ وَ مَوْلاَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ" _ اے ابوالحسنؑ! آپؑ کو مبارک ہو مبارک ہو کہ آپؑ میرے اور ہر مؤمن ومؤمنہ کے مولا بن گئے" _پس حضرت عمر کا یہ اقرار حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی حکومت اور خلافت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے بعد حصول ریاست اور حکومت کی خواہش نے غلبہ کیا، ایک ریاست عظمیٰ کا ہاتھ آنا، خلافت کے جھنڈے کا اٹھانا، علم کے پھریروں کا ہوا میں لہرانا اور سواروں کا جلوس میں اژدہام، ملکوں اور شہروں کا فتح کرنا، ان سب خیالات نے ان لوگوں کی خواہش نفسانی کا جام پُر کر دیا۔ اور اسی مدہوشی نے خلیفہ بنادیا۔ وہ جس طرح قبل از اسلام تھے پھر ویسے ہو گئے اور اپنے عہد _ مبارکبادی_ کو پس پشت ڈال دیا اور عہد شکنی کے ساتھ ادنیٰ سی دنیا کی چند روزہ حکومت کو خرید لیا پس انہوں نے کیا بری چیز خریدی!!"۔

۵۔ ابن ابی الحدید نے غصب خلافت علیؑ کو ثلاثہ کے ترک اولیٰ کا نام دیا ہے اور آیت کے ذریعے ایک مثال دے کر اپنے مدعا کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس لئے کہ اس آیت "وَ عَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى" میں "عصیان" کو "ترک اولیٰ" پر اور "غی" کو "ناکامی" پر اس لئے حمل کیا گیا ہے کہ عقلی اور نقلی دونوں صورتوں میں عصمت انبیاء پر دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ قائم ہیں جیسا کہ ہم پہلے خطبے کی بارہویں فصل میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

باقی رہی بات خلافت کے بارے میں صحابہ کرام کے اقدام کی اور فاضل وکامل کو چھوڑ کر مفضول وناکمل کو خلیفہ مقرر کرنے کی تو یہاں پر صحابہ کرام کے بارے میں محض حسن ظن سے کام لینا ہوگا اور تاویل کا ارتکاب نہیں کیا جاسکتا اور امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے شکوے شکایات اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے اظہار میں حسن ظن سے کام لے کر ان سب باتوں سے چشم پوشی اختیار نہیں کی جاسکتی بلکہ صراحت کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علیؑ مولا کا موقف صحیح اور درست تھا۔

۶۔ شارح معتزلی کا یہ کہنا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ جو گمان صحابہ کرام کو ہوا ہے وہ حضرت علیؑ کو نہ ہوا ہو!"۔ تو یہ ایک تکلف محض ہے، بھلا یہ بھی کوئی ماننے والی بات ہے کہ جو باب مدینۃ العلم ہو، جو دار الحکمت کا دروازہ ہو وہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکے جسے عام سطح کے آدمی سمجھ لیتے ہیں؟ جو علمی لحاظ سے نہایت ہی پست درجے کے لوگ ہوں وہ تو سب کچھ ہی سمجھ جائیں لیکن جن کے ساتھ علم کو وہی نسبت ہے جو ثریٰ سے ثریا کو ہوتی ہے وہ ایسی باتوں سے بے خبر رہے؟ اور خاص کر یہ خطبہ_ شقشقیہ_ جو آپؑ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں دیا، جیسا کہ خود مضمون سے ظاہر ہے۔ بالفرض اگر علیؑ بن ابی طالبؑ اوائل میں وہ کچھ نہ سمجھ سکے ہوں جو حضرات

صحابہ کرام نے سمجھا تھا تو کیا آپؑ اس معاملے کی تہہ تک اپنی عمر کے آخری حصے تک بھی نہیں پہنچ سکے تھے جس تک عام قسم کا آدمی پہلے پہل پہنچ گیا؟ البتہ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ : "حضرت کا یہ خطبہ آپؑ کے ماضی کے حالات کی عکاسی کر رہا ہے اور حال حاضر میں ان معاملات کے منافی نہیں ہے جو اطلاعات اور معلومات صحابہ کرام کی تھیں"۔

تو جواباً عرض ہے کہ فرق بہت واضح ہے جب آپؑ کو صحیح معلومات حاصل ہو گئی تھیں تو آپؑ کا فرض بنتا تھا کہ صحابہ کرام کے عذر کو صحیح تسلیم کر لیتے، بلکہ خود ان سے معذرت خواہی کرتے اور ایسا خطبہ ارشاد نہ فرماتے جس میں ان لوگوں کے تمام کچے چٹھے کھول کر رکھ دیئے اور ان کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا۔ اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ خطبہ ۲۱۴ کی شرح میں بیان ہو گی۔

۷۔ ابن ابی الحدید کا یہ کہنا کہ "مولا علی نے جو یہ فرمایا ہے کہ "میں سوچنے لگا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھ سے حملہ کروں......" تو ہو سکتا ہے کہ اس سے جنگی حملہ نہیں بلکہ جدل و مناظرے اور احتجاج کا حملہ مراد ہو"۔ تو ان کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ :

الف : ظاہر کلام سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ آنجنابؑ کی اس سے مراد جنگی حملے کی تھی اور اس کی تائید آپؑ کے ۲۶ویں خطبے کے ان کلمات سے ہوتی ہے ملاحظہ فرمایئے :"میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، تو مجھے اپنے اہل بیت کے علاوہ کوئی اپنا معین و مددگار نظر نہ آیا، میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا، آنکھوں میں خس و خاشاک تھے مگر میں نے چشم پوشی اختیار کی، حلق میں پھندے تھے مگر میں نے غم و غصے کے گھونٹ پی لئے اور گلوگر فتگی کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ حالات پر صبر کیا"۔ حضرتؑ کے یہ وہ الفاظ ہیں جو آپؑ مسلسل بیان فرماتے رہتے تھے، اور وفات پیغمبرؐ کے بعد فرمایا تھا :"کاش! کہ مجھے چالیس صاحبان عزم مل جاتے!!"۔ اس جملے کو نصر بن مزاحم نے اپنی کتاب "صفین" میں اور دیگر ارباب سیرت نے بھی لکھا ہے۔

ب : حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنے فضائل و مناقب اور اپنے بارے میں ذکر ہونے والی نصوص کو بار بار ذکر کیا ہے اور سقیفہ کے دن بھی آپؑ نے زبردست احتجاج کیا، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ آپؑ نے اپنا احتجاج جاری رکھا، کبھی اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے اور اس قدر احتجاج کیا کہ آپؑ کو کہنا پڑا "حلق میں پھندے تھے اور آنکھوں میں خس و خاشاک!"۔

بہر صورت بات خواہ کچھ بھی ہو ہم نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ شارح معتزلی نے بڑی حد تک فاسد تکلفات اور تاویلات کا سہارا لیا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر آپ کو آئندہ معلوم ہو گا کہ ان کے خیالات کس حد تک فاسد، غلط، بے مقصد اور بودے ہیں! اگر خدا نے ہمیں توفیق عطا فرمائی تو انشاء اللہ اس کی پوری تفصیل بیان کریں گے۔

_ جلد دوم تمام شد_ تاریخ اختتام ۱۵ ر رجب ۱۳۷۸ھ اس کے ساتھ ہی تیسری جلد کا آغاز کیا جا رہا ہے جس کی ابتدا "تیسرے خطبے" سے ہوتی ہے_ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَمَا هُوَ اَهْلُهٗ_

منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ کی دوسری جلد کا ترجمہ آج بتاریخ ۸ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ مطابق ۳۱ ر اگست ۱۹۹۸ء بروز پیر بوقت پونے چار بجے صبح بمقام جامعہ امام جعفر صادق علیہ السلام راجن پور اختتام پذیر ہوا۔ لِلّٰهِ الْحَمْدُ وَ الشُّكْرُ۔

وانا الاحقر **محمد علی فاضل** مدیر جامعہ امام جعفر صادقؑ راجن پور

استبصار

کتب اربعہ میں سے

احادیث کی ایک کتاب

الاستبصار

مؤلف **شیخ طوسیؒ**

کی جلد اوّل کا اُردو ترجمہ

عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔

ناشر

حق برادرز

8۔ مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

فہرست کتب

نمبر شمار	نام کتب	قیمت	نمبر شمار	نام کتب	قیمت
1-	قرآن مجید (قاری محمد علی)	200/-	30-	ریاض النضرہ (حافظ حدیث ابو جعفر طبری شافعی)	75/-
2-	نہج البلاغہ (ذیشان حیدر جوادی)	275/-	31-	برکات عزاداری	50/-
3-	منہاج البرعہ شرح نہج البلاغہ (ترجمہ محمد علی فاضل)	450/-	32-	شہدائے کربلا (اظہر حسن زیدی)	40/-
4-	جعفری تحفۃ العوام مترجم (بوعلی شاہ زیدی)	225/-	33-	جلاء العینین سیرت امام زین العابدین (سلمان پوری)	80/-
5-	اُسوۃ الرسول اول (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	350/-	34-	مجالس اجتہادی (نصیر الاجتہادی)	60/-
6-	اُسوۃ الرسول دوم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	300/-	35-	بحر المصائب	150/-
7-	اُسوۃ الرسول سوم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	275/-	36-	مجالس ترابی (علامہ رشید ترابی)	60/-
8-	اُسوۃ الرسول چہارم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	100/-	37-	ابوتراب (علامہ جزائری)	35/-
9-	سراج المبین فی تاریخ امیر المومنین (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	225/-	38-	آیۃ اللہ (سلطان المشائخ)	50/-
10-	ذبح عظیم (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	225/-	39-	یزید نامہ (خواجہ حسن نظامی)	50/-
11-	الزاہراء (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	80/-	40-	طمانچہ بر رخسار یزید (خواجہ حسن نظامی)	35/-
12-	دُرِ مقصود (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	90/-	41-	فلسفہ تفکر (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
13-	چودہ ستارے (نجم الحسن کراروی)	200/-	42-	انتظار مذہب انتظار (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
14-	تاریخ اسلام (نجم الحسن کراروی)	180/-	43-	جہاں بینی (ڈاکٹر علی شریعتی)	20/-
15-	ذکر العباس (نجم الحسن کراروی)	150/-	44-	مجالس حیدریہ	60/-
16-	صحیح الجعفری (نجم الحسن کراروی)		45-	مجالس الغروی (علامہ عقیل الغروی)	125/-
17-	نجم المجالس (نجم الحسن کراروی)	60/-	46-	آثار جعفریہ (اولاد حیدر فوق بلگرامی)	75/-
18-	ارجح المطالب (عبید اللہ امرتسری)	400/-	47-	ایلیا (حکیم سید محمود گیلانی)	15/-
19-	تاریخ اعثم کوفی (اعثم کوفی)	225/-	48-	خطابت مجالس سیکھنے اور نامور خطیب بننے کے طریقے (سید اعجاز احمد)	
20-	تاریخ یعقوبی (ابن یعقوبی)		49-	شہادت رسول الثقلین مع سر شہادتین	60/-
21-	تذکرۃ الخواص (علامہ سبط جوزی)	150/-	50-	تلاش حق (بشیر انصاری)	
22-	تاریخ ابو الفداء (علامہ اسماعیل بن علی والی حمات)	90/-	51-	ذکر محمد و آل محمد (ابو الحکیم ابوترابی)	55/-
23-	تاریخ احمد ﷺ (نواب احمد حسین پریاواں)	225/-	52-	عظمت شیعہ (سید علی رضا نقوی)	50/-
24-	جوہر قرآن (علی حیدر نقوی)	180/-	53-	قرآن نہج البلاغہ کے آئینے میں	120/-
25-	تصویر عزا (علی حیدر نقوی)	135/-	54-	اقبال در مدح محمدؐ و آل محمدؐ (احسن عمرانی)	100/-
26-	حضرت عمرؓ (علی حیدر نقوی)	75/-	55-	نماز جعفریہ	24/-
27-	خلافت اور امامت (ہرنام سنگھ)	200/-	56-	پندرہ معجزے	20/-
28-	سیرت فاطمۃ الزاہراء (آغا سلطان مرزا)	150/-	57-	بحور الغم	300/-
29-	البلاغ المبین (آغا سلطان مرزا)		58-	السیرۃ العلویہ بذکر المآثر مرتضویہ (حصہ اول و دوم)	

عالم بشریت کے عروج وزوال کی کہانی جس روایت کے بغیر مکمل نہیں ہوتی

عالم اسلام کے نامور مورخ احمد بن ابی یعقوب ابن واضح یعقوبی کی

تاریخ یعقوبی

تاریخ اسلامی کی راہ کشا دستاویز

اسلامی تاریخ کا قدیم ترین اور مربوط ماخذ

ایک مورخ، ایک جغرافیہ دان، ایک ماہر ہیئت کے قلم سے

تاریخ طبری سے مقدم دور عباسی کی چشم دید گواہی

جس کا ترجمہ ملک کے نامور اور ممتاز محقق، دانشور اور مترجم

ثاقب اکبر

نے رواں اور رسا زبان میں کیا ہے

علمی و تکنیکی معاونت: البصیرہ ۲۹۹، سٹریٹ ۷۶، جی نائن تھری، اسلام آباد، ۰۵۱-۲۸۵۱۴۰۹

اسٹاکسٹ

حق برادرز

8 مسلم سنٹر چیٹر جی روڈ اُردو بازار لاہور

ارجح المطالب

از عبیداللہ امرتسری

"سیرت حضرت علیؑ پر ایک جامع کتاب"

سیرت جناب علیؑ پر یوں تو بہت سی کتب لکھی گئیں اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہے گی مگر جناب علیؑ کی سیرت پر لکھی جانے والے کتابوں میں "ارجح المطالب" کو بعض حوالوں سے ممتازیت حاصل ہے اس طرح یہ کتاب جداگانہ اور منفرد حیثیت اختیار کر جاتی ہے' آپ اندازہ کریں کہ ارجح المطالب ایک اہلسنّت عالم کی برسوں کی کوشش' مخلصانہ کاوش اور تعصب سے پاک نگارش کا مرقع ہے اس سے علاوہ جتنی بھی کتابیں آپ کی سیرت سے متعلق لکھی گئیں ان کے لکھنے والے مسلک کے اعتبار سے شیعہ اثنا عشری تھے پھر بھی ہر سیرت کی کتاب ہمہ جہتی صفات کی حامل نہیں ہے۔ جبکہ ارجح المطالب کے مصنف عبیداللہ امرتسری نے جناب امیر علیہ السلام کی زندگی و سیرت کے ہر ہر پہلو پر خامہ فرسائی کی اور بعض وہ صفات جلیلہ حضرت علیؑ کی کہ جو دفینے کی طرح پوشیدہ تھیں انہیں تاریخ کے سینے سے نکال کر منظر عام پر لاکر امت مسلمہ پر بالعموم اور ملت شیعہ پر بالخصوص احسان عظیم کیا ہے اس کتاب کو پاک و ہند میں قبول عام کا درجہ حاصل ہے اور سب سے بڑی خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سنی وشیعہ کے سبھی علماء اس کتاب کے ہزاروں حوالہ جات کو اپنی تحریر اور تقاریر میں بطور سند پیش کرتے ہیں ارجح المطالب ایسی کتاب ہے کہ جس کی ایک ہی جلد سیرت جناب امیرؑ کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور جس کے مطالعہ کے بعد دوسری کسی کتاب کی عموماً ضرورت باقی نہ رہ جائے ایسی کتاب کا ہر مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے جبکہ ملت شیعہ پر تو کہیں لازم ہے کہ اس کتاب کی ایک ایک کاپی سے اپنے گھر کو زینت بخشیں اس سے خود بھی استفادہ کریں اور بچوں کو بھی مستفید کریں بہرحال یہ طے ہے کہ ایسی نادور نابغہ روزگار تصنیف سے اغماض برتنا کفران نعمت ہوگا کیونکہ اس کتاب میں فضائل کے ایسے ایسے باب رقم ہیں کہ لکھنے والے پہ نصیری ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے جبکہ حقیقت میں لکھنے والا سنی مسلک سے متعلق ہے نیز یہ کہ فضائل کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے اور مصنف نے جو جو قطرہ بھی قلم بند کیا ساتھ میں مستند حوالہ بھی پیش کیا ہے ایسے میں اس کتاب کی قدرو قیمت کہیں بڑھ جاتی ہے کیونکہ بعض غیر شیعہ جو آپ کے فضائل سے آنکھیں چراتے ہیں ان کے اپنے مسلکوں کے بہت بڑے عالم کی لکھی اس کتاب کا ہر حوالے ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے

کتاب کا سائز 20x30/8 صفحات 656' عمدہ کاغذ دیدہ زیب اور مضبوط جلد نہایت مناسب ہدیہ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں وگرنہ اسٹاک ختم ہونے کی صورت میں آپ کو ایک لمبا عرصہ انتظار کی زحمت بھی کرنا پڑ سکتی ہے